آئینۂ حیات

(افسانچے، افسانے اور مضامین)

احمد مشکور

احمد مشکور اردو زبان و ادب کے گیسو سنوارنے والے بچوں اور بڑوں کے ایک منجھے ہوئے اہل قلم ہیں۔ ان کے بارے میں بلاخوف و تردید میرا تاثر یہ ہے کہ کامیابی ان کے قدم ہمیشہ چومتی رہے گی۔

حسین امین (صحافی اور مصنف)

صحافتی شاہراہوں سے گزر کر افسانوی حدود میں مدغم ہونے والی تحریریں دراصل فن رپورتاژ کی خصوصیات سے مستنیر کرتی ہیں۔ حالانکہ سید احتشام حسین مخصوص صحافتی اور افسانوی آمیزہ کی حد تعین کرنے میں لیت و لعل کے شکار رہے۔ تاہم علی سردار جعفری نے ان دونوں اصناف کے مرقع کو رپورتاژ ہی تسلیم کیا یعنی خبریہ اسلوب، افسانوی لبادہ اوڑھ لے تو منفرد رنگ و آہنگ کی ایک نئی تصویر سامنے آتی ہے۔ احمد مشکور کے بیشتر افسانے اور افسانچوں کی فضا میں خبریہ اسلوب کی شمولیت نظر آتی ہے اور ان کا یہی اسلوب افسانوی دائرہ میں نہ صرف اپنے لیے رپورتاژ کی علامت متعین کرتا ہے۔ بلکہ رپورتاژ اور فن افسانہ کی تکنیکی و تشکیلی رویوں سے ایک نیا لب و لہجہ بھی جنم دیتا ہے اور اس طرح وہ رپورتاژ کے پیرایے میں افسانہ سنانے والا تن تنہا فنکار بن کر ابھرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے بیانیہ میں داخلی کیفیات، خارجی سطح پر نمودار ہوتی ہیں اور خارجی ارتعاش میں داخلی سروں کا گمان ہوتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ان کے افسانوں کے تمام جملے تخلیقی حلاوت اور افسانوی ابال سے مرتعش ہیں۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ ان کی اختتامی سطریں، ابتدائی جملوں کو بھی دلکش تخلیقی و افسانوی پیراہن عطا کر دیتے ہیں۔ جس طرح ان کے یہاں جانے پہچانے لفظوں سے تراشے تراشیے نئے پیکر کا احساس ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کے جملوں میں رپورتاژ کی شگفتگی اور ذہنی شدت و حدت کی موجودگی بھی نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی فلسفیانہ موشگافیوں کی دھیمی دھیمی آنچ بھی ہمیں ملتفت کرتی ہے۔

سلمان عبدالصمد

ریسرچ اسکالر، جے این یو، دہلی

آئینۂ حیات

افسانچے، افسانے اور مضامین

احمد مشکور

ناشر

امین سلونوی میموریل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی (رجسٹرڈ) لکھنؤ

نام کتاب : آئینۂ حیات
نام مصنّف : مشکور احمد صدیقی
قلمی نام : احمد مشکور
پیدائش : قصبہ ہری ہانس، ضلع سیوان (بہار) ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۷ء
تعداد : پانچ سو
صفحات : 240
قیمت : دو سو روپے (-/Rs. 200)
اشاعت : جنوری ۲۰۱۷ء
طباعت : ایلائٹ پریس۔ بالدہ روڈ۔ لکھنؤ
کمپوزنگ : ہارون انصاری (ندا آرٹ) 9616202153

ملنے کے پتے

☆ احمد مشکور۔ ۲۰۲-ایم-اے-اپارٹمنٹ۔ کملا نہرو نگر، خرم نگر، لکھنؤ۔ 226022
۲۰۱/۳۔ کیرتی اپارٹمنٹ، میورو ہار، فیز ا، دہلی۔ 110091
موبائل نمبر: 9598229203, 9810428919
☆ دانش محل۔ امین الدولہ پارک، لکھنؤ۔ 226018
☆ محمد وصی صدیقی۔ سکریٹری: محمد علی جوہر فاؤنڈیشن۔ امین آباد پارک، لکھنؤ۔ 226018
☆ رشید قریشی۔ ایڈیٹر ماہنامہ لاریب، 30 محمد علی لین، امین آباد، لکھنؤ۔ 226018
☆ لائبریرین۔ ناصر لائبریری۔ ابو بازار (اُونچوا) گورکھپور (یوپی)۔ 273005
☆ بک اِمپوریم۔ اُردو بازار، سبزی باغ۔ پٹنہ (بہار)۔ 800004

رسمِ تعظیم نہ رُسوا ہو جائے

اِتنا مت جھکئے کہ سجدہ ہو جائے

(ملک زادہ منظور احمد)

انتساب

عظیم شاعر، مفکّر، ادیب، بین الاقوامی شہرت یافتہ
ناظم مشاعرہ، سابق صدر شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی

پروفیسر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد مرحوم

کے نام

جن کے خلوص ومحبت کا میں تاحیات

ممنون ومشکور رہوں گا۔

......☆......

احمد مشکور

ترتیب

افسانچے

افسانے

اُردو ادب میں بیش بہا اضافہ

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا۔ دہلی

اُردو کے نامور اور مشہور و معروف اہل قلم اور مصنف جناب مشکور احمد صدیقی جو قلمی نام احمد مشکور سے معروف ہیں، کے اعلیٰ پائے کے ادبی مضامین کا مجموعہ بعنوان ''آئینۂ حیات'' کے متعلقہ اس کم بے بضاعت کو مطالعہ کا شرف حاصل ہوا اور اس کے مطالعہ سے اس کے محدود علم میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ اس مجموعہ میں جہاں ایک طرف اُردو کے اعلیٰ پائے کے ادبی مضامین ہیں تو دوسری طرف اس میں اُردو کے صفِ اوّل کے نامور مصنّفین اور اہل قلم حضرات کے نہ صرف ادبی مضامین شامل ہیں بلکہ اس میں نامور اُردو مصنّفین اور محققین کے ادبی کارناموں کا ذکر آ گیا ہے اور اس سے ان حضرات کی اُردو ادب میں اعلیٰ پوزیشن اور مقام کا اندازہ ہوتا ہے، دوسری طرف اس مجموعہ میں اُردو کے نامور مصنّفین و محققین کی سوانح حیات بھی ہے اور اس سے بڑھ کر ان کے عظیم علمی اور ادبی کارناموں پر محققین پر خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ جن مشاہیرِ اُردو کے اعلیٰ پائے کے مصنّفین اور محققین کے عظیم ادبی کارناموں کا ذکر ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کی سوانح حیات کا بھی بیان ہے۔ اس مجموعہ کے مضامین کے مطالعہ سے کم استعداد لکھنے والوں کے علم میں اضافہ ہوگا۔

یہ مجموعہ افسانوں، افسانچے اور اعلیٰ پائے کے ادبی مضامین پر مشتمل ہے۔ اُردو کے جن مصنّفین اور محققین کا اس مجموعہ میں ذکر ہے ان میں حسین امین، احمد جمال پاشا، محمد مسلم صاحب سعد الدین عندلیب، امین سلونوی صاحب اور راقم السطور کا خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس بیش بہا اور قیمتی مجموعہ کی اشاعت پر مصنف قابل صد مبارکباد اور ستائش ہیں۔

بلاشبہ یہ مجموعہ اُردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہے۔

سی-۵۰۱/روز وڈ اپارٹمنٹ۔ میور وہار فیز ا۔ دہلی۔۱۱۰۰۹۱

۳۰/اکتوبر ۲۰۱۶ء

ایک سچا تاثر

ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی

احمد مشکور صاحب نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور میں نے مشکور صاحب کو قریب سے دیکھا ہے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ انہوں نے زندگی کو مختلف رنگ و آہنگ میں دیکھا ہے اور مجھے اُن کا صرف ایک رنگ پسند ہے کہ وہ زندگی کے نشیب و فراز میں اُس کا حق ادا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اسی لئے زندگی نے بھی انہیں اسی طرح عزیز رکھا ہے کہ اس نے اپنی حقیقتوں کو اُن کے اُوپر ظاہر کردیا۔ اس کی رعنائیاں، اس کی جلوہ فروشیاں، اس کی تلخیاں، اس کی الم ناکیاں اور ان تمام کیفیات کے سرد و گرم سے وہ اچھی طرح واقف بھی ہوئے اور انہیں اپنی فکر کا موضوع بھی بنایا۔ اُن کی تحریروں میں یہ بات بہت نمایاں ہے۔

اُن کا تخلیقی سفر بہت خاموشی سے جاری رہا ہے۔ زندگی کے اسرار و رموز کو اس مدت میں انہوں نے سمجھا بھی، پرکھا بھی اور برتا بھی۔ پچاس برس گزر جانے کے بعد آج بھی اُن کا ذہن سفر میں رہتا ہے اور وہ انسان اور اس کے حالات پر غور کرتے رہتے ہیں۔ مسائل انہیں پریشان کرنے کے بجائے اُن کے قلم کے سائے میں عافیت محسوس کرتے ہیں۔ تخلیق نگار کو یہ سلیقہ مشکل سے آتا ہے۔ زندگی کیساتھ جذبۂ خیر سگالی اور انسانوں کے ساتھ جذبۂ غمگساری ایک قیمتی متاعِ حیات ہے۔ مشکور صاحب نے اس کی بھرپور حفاظت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ اُن کی خصوصیت بھی ہے انفرادیت بھی ہے۔

وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں، ایسے افسانہ نگار جو زندگی میں پیش آنے والے افسانوں کو حقیقت کا رُوپ دیتے ہیں اور اس حقیقت کی تہہ میں چھپی ہوئی سچائیوں کو تلاش کرلیتے ہیں۔ تلاش و جستجو کا یہ مرحلہ وہ بہت کامیابی سے طے کرتے ہیں۔ افسانہ اُن کا شوق نہیں اُن کی فکری ضرورت ہے۔ اسی فکر سے وہ تخلیق کی عمارت تعمیر کرتے ہیں اور بعض وقت تعمیر شدہ عمارت کے رنگ و روغن کو

کُھرچ کراس کی اصل حقیقت کواس طرح نمایاں کرتے ہیں کہ دیکھنے والے حیرت میں ڈوب جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا فن ہے جواسی صورت میں حاصل ہوتا ہے جب زندگی کا سفراس طرح کیا جائے کہ آنکھوں کے ساتھ ذہن کے دریچے بھی کھلے ہوں، اپنے دل کی دھڑکنوں میں دوسروں کے دل بھی دھڑکتے ہوئے محسوس ہوں۔ کیفیات کا صحیح اندازہ بھی ہو، اپنی خوشی میں دوسروں کے غم نمایاں ہوں۔ خالقِ کائنات کی بنائی ہوئی دُنیا اور اس میں بسنے والے انسانوں کا ہجوم اور اُن کے مسائل کا سیلاب بلاخیز، سرمستی کے عالم میں بے نیازانہ گزر جانے کے بجائے پیروں کو آگے بڑھنے سے روک دے اور وہ آگے بڑھ کران مسائل کو ایک خوبصورت بچے کی حیثیت سے گود میں اُٹھالے اور اُسے اپنی تخلیق کا موضوع بنادے۔ کامیاب افسانہ اور افسانہ نگار کا کامیاب قلم احمد مشکور صاحب کی تحریروں کی شناخت ہے اور یہی شناخت ان کی ادبی پہچان ہے۔ جس نے انہیں اعتبار کا درجہ عطا کیا ہے۔

اُن کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے موضوعات کو بھی اپنا دوست بنایا ہے اور شخصیتوں کو بھی عزیز رکھا ہے اور دونوں کا حق ادا کیا ہے۔ جن موضوعات کو پچاس برس پہلے انہوں نے پسند کیا تھا وہ آج بھی اُن کی تخلیقات میں زندہ ہیں اور اُن کے ایسے دوست احباب بھی اُن کی زندگی کا حصّہ ہیں جن سے مدّت ہوئی کبھی رابطہ ہوا تھا۔ زندگی کی راہوں میں سب ایک دوسرے سے جدا ہو کر بکھر گئے لیکن یہ جدائی اور بکھراؤ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کرسکی۔ یہ شرافتِ نفس کی ایک اچھی مثال ہے جو مشکور صاحب کی زندگی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ دوستوں نے ادبی سفر کا آغاز ایک غیر یقینی صورتِ حال میں کیا تھا لیکن اخلاص کی آبیاری نے اب تک اس گلشن کو آباد رکھا ہے۔ سب کے دلوں میں ایک دوسرے کی یاد اور محبت تازہ رہتی ہے جو رخصت ہو کر دُور چلے گئے وہ اور قریب ہوگئے۔ مشکور صاحب کی زندگی کا یہ بڑا سرمایہ ہے جسے انہوں نے بہت سلیقے سے بچا کر رکھا ہے۔ یہ بات کبھی اُن کے افسانوں میں اور دوسری تحریروں میں جھلکتی ہے تو جو لوگ اس راز سے واقف ہیں اُن کی آنکھیں چھلک جاتی ہیں۔ خود مشکور صاحب کے آنسو آئینۂ حیات بن جاتے ہیں۔ خدا کرے اُن کا تخلیقی سفر اسی طرح جاری رہے۔ اور ہم اُن کی نگارشات سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔

رسمِ اجراء

احمد مشکور

میری دو کتابوں ''امریکن مسلم'' اور افسانوں کا مجموعہ ''بکھرے موتیوں کا ہار'' کی رسمِ اجراء ۲۴/مارچ ۲۰۱۳ء کو پروفیسر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحب مرحوم کی صدارت میں مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن، امین آباد، لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ جس کے مہمانِ خصوصی صوبہ جھارکھنڈ کے سابق گورنر سیّد سبط رضی صاحب تھے۔ اس یادگار تقریب میں شرکت کرنے والوں میں اتر پردیش کے انسپکٹر جنرل پولیس جناب رضوان احمد۔ آئی پی ایس جناب انیس انصاری۔ آئی اے ایس وائس چانسلر عربی فارسی یونیورسٹی لکھنؤ ڈاکٹر شارب ردولوی۔ سابق پروفیسر اور صدر شعبۂ اُردو جواہر لعل نہرو یونیورسٹی (جے این یو) نئی دہلی ڈاکٹر اقتدار حسین فاروقی۔ سابق ڈائریکٹر نیشنل بوٹانیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (این بی آر آئی) لکھنؤ ڈاکٹر سلیم قدوائی۔ سابق پروفیسر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی (جے این یو) نئی دہلی ڈاکٹر مہہ جبیں عائشہ۔ سابق پروفیسر شعبۂ عربی اور عرب کلچر لکھنؤ یونیورسٹی۔ ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی اسسٹنٹ گورنر لکھنؤ روٹری کلب، لکھنؤ، جناب عابد سہیل مرحوم نامور صحافی، دانشور، سابق رہنما ترقی پسند مصنّفین، انشاء پرداز، نامور ادیب اور مدیر ماہنامہ ''کتاب''، لکھنؤ۔ ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی مشہور و معروف ادیب اور سابق پرنسپل ممتاز کالج لکھنؤ۔ ڈاکٹر مسعودالحسن عثمانی جنرل سکریٹری اتر پردیش دینی تعلیمی کونسل، مشہور و معروف ادیب، سابق لیکچرر ممتاز ڈگری کالج لکھنؤ۔ محترمہ عائشہ صدیقی افسانہ نگار اور سابق پرنسپل بالیکا ودّیا نکیتن لکھنؤ۔ جناب محمد وصی صدیقی بانی سکریٹری محمد علی جوہر فاؤنڈیشن امین آباد لکھنؤ۔ جناب حسین امین معروف افسانہ اور مضمون نگار سابق ایڈیٹر ہفت روزہ ''دُنیا''، لکھنؤ کے سینئر صحافی اور لیکچرر شعبۂ صحافت ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ سابق ماہنامہ ''ثانی''، لکھنؤ کے بانی جناب معظم جعفری، جناب احمد جاوید، مشہور ادیب، کالم نگار، انچارج روزنامہ ''انقلاب'' لکھنؤ ایڈیشن۔ ڈاکٹر ظہیر الدین۔ چودھری شرف الدین۔ شاہ نواز قریشی ادیب اور سابق ایڈمنسٹریٹر انٹگرل یونیورسٹی لکھنؤ۔ جناب آثر ٹانڈوی لکھنؤ کے معروف شاعر۔ عبدالمجیب، محبّ اللہ عباسی، ناصر حسین، زرینہ ناصر، مقصود اشرف (ارشد)، سیّد عمران علی، سروری بیگم، فرزانہ احتشام، شاذیہ جامی وغیرہ شامل تھیں۔

کتاب ''امریکن مسلم'' پر سیر حاصل تبصرہ ہوا۔ میرے اس سفرنامہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا اور تقریباً سبھی شرکاء حضرات نے اپنی تقریر میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی کے مطابق کتاب دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ لہٰذا شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر چھوڑنا ناممکن ہے۔ ڈاکٹر شارب ردولوی صاحب نے فرمایا امریکہ تو لوگ صبح شام جاتے رہتے ہیں وہاں کی چمک دمک دیکھ کر اور گھوم کر واپس آجاتے ہیں۔ مشکور صاحب نے امریکہ کو جس نظریہ سے دیکھا ہے وہ قابل تعریف ہے اور قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ میں بھی امریکہ اور کنیڈا گھوم کر آیا مگر احمد مشکور نے جو تصویر دکھائی ہے اس پر حیرت ہوتی ہے۔ آپ کا بیان کرنے کا انداز اچھا اور پُر اثر ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ مجھے یہ پڑھ کر تعجب ہوا کہ امریکہ میں مقیم مسلمانوں نے اتنے بڑے پیمانے پر درس و تدریس اور اپنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت اور توسیع کے لئے اتنے بڑے کام کر رہے ہیں۔ عابداللہ غازی صاحب سے میری ملاقات طالب علمی کے زمانے سے ہے جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ سابق گورنر جھارکھنڈ سیّد سبط رضی صاحب نے کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا کہ جو مسلمان ہندوستان سے جا کر امریکہ میں بس گئے ہیں ان کے سامنے اپنی مذہبی تشخص، ملّی شناخت اور اپنی زبان اور تہذیب کی حفاظت ایک چیلنج کے طور پر سامنے آتی ہے۔ مسلمانوں نے ان چیلنج کو قبول کیا جس کا خوبصورت نقشہ احمد مشکور نے پیش کیا ہے۔ اپنے صدارتی خطبہ میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے اعتماد کے ساتھ کہا کہ اب تک جتنی کتابوں کے اجراء میں، میں شامل ہوا ہوں اُن میں کسی کتاب پر اتنی تفصیل سے گفتگو نہیں ہو سکی جتنی احمد مشکور کی کتابوں پر ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ جس امریکہ کی فکر و نظر کی کتاب میں منطقی ستائش کی گئی ہے وہ ہماری فکر و نظر سے متضاد ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں دو رویہ ہیں۔ ایک عوام کی سطح پر اور دوسرا حکومت کی سطح پر۔ کتاب میں عوام کی سطح پر جو رویہ ہے اس کو پیش کیا گیا ہے۔ ملک زادہ منظور صاحب نے فرمایا کہ پتہ ہی نہیں چلا کہ تین گھنٹے کیسے گزر گئے۔

جلسہ کے اختتام پر مہمانِ خصوصی سابق گورنر سیّد سبط رضی صاحب نے اپنا خطبہ پیش کیا اور محمد علی جوہر فاؤنڈیشن کے بانی سیکریٹری محمد وصی صدیقی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

داستانِ حیات

احمد مشکور

میری کتاب ''آئینۂ حیات'' تین حصوں میں منقسم ہے۔ اس کا پہلا حصہ ''افسانچہ'' دوسرا ''افسانے'' اور تیسرا ''ادبی مضامین'' پر مشتمل ہے۔ افسانے تو بہت لکھے گئے، مگر افسانچہ لکھنے کا یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے اپنے افسانچوں کو فیس بک پر ڈالنا شروع کیا۔ دُنیا کے ہر خطّہ میں میرے عزیز اور دوست رہتے ہیں، ان افسانچوں کو بیحد پسند کیا گیا۔ افسانچوں کی خوبی یہ ہے کہ کئی صفحات کی داستان محض ایک صفحہ میں بیان کر دی جاتی ہے۔ بعض افسانچے دل کو چھو لینے والے ہیں، جن کو پڑھ کر قاری آبدیدہ ہو جاتا ہے۔ سماج میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کو ان افسانچوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جو بات کہی گئی ہے وہ قطعی نئی نہیں ہے، مگر انداز نیا ہے اور اندازِ بیان متاثر کن ہے۔ لہٰذا قاری کی توجہ مبذول کرتا ہے۔ میں قدرتی طور پر جذباتی واقع ہوا ہوں۔ ماحول کی اچھائی اور بُرائیوں سے بہت جلد متاثر ہونا میری فطرت کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا میرے سبھی افسانے سماج میں ظہور پذیر ہونے والے چھوٹے، بڑے، اچھے اور بُرے واقعات کی عکاسی کرتے ہیں، مگر حقیقت سے دُور نہیں ہیں۔ عام طور پر زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے میں ایسے غیر معمولی واقعات پیش ہوتے رہتے ہیں جو افسانہ نگار کو متاثر کرتے ہیں اور جسے وہ تحریر کا جامہ پہنا کر عوام کے سامنے پیش کرتا ہے۔ افسانہ دراصل ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں قاری کو اپنی شکل دکھائی دیتی ہے اور آئینہ کی خصوصیت یہ ہے کہ آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

اس کتاب کا تیسرا اور آخری حصہ ''ادبی'' مضامین پر مشتمل ہے۔ اُردو زبان و ادب کی مشہور و معروف شخصیات کے حالاتِ زندگی اور ان کا ادب سے لگاؤ کا ذکر ہے۔ اُردو ادب کے

فروغ میں ان کے کارناموں کا تذکرہ ہے۔ نثر اور نظم کی نامور ہستیوں کی قربانیوں کا ذکر کئے بغیر اُردو زبان کی تاریخ نامکمل تصور کی جائے گی۔ سارے مقالے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ سارے مقالے یقیناً پسند کئے جائیں گے۔ ان میں صحافیوں کی زندگی کے خطرات سے پُر داستان ہے تو آزادی کی جنگ میں ملک کو بیرونی طاقتوں سے آزاد کرانے کی تاریخ رقم ہے جسے نئی نسل کو ذہن نشین کرانا آج کے پُر آشوب دور میں انتہائی ضروری ہے۔ اُردو زبان کا صاحبِ دیوان یوروپین شاعر کی اُردو دوستی کی زندہ مثال ہے جسے ہر قاری دلچسپی سے مطالعہ کرے گا۔

میں اپنی دیگر کتابوں میں اس بات کا اعتراف کر چکا ہوں کہ میں نے لکھنے کی ابتداء لکھنؤ کے صحافی دوست حسین امین کے ہفت روزہ 'دُنیا' سے ۱۹۵۸ء میں کی۔ جب ہماری عمریں بیس بائیس سال کی تھیں۔ ہر ہفتہ طنز و مزاح کے کالم ''حاجی صاحب کی ڈائری'' کے عنوان سے مضامین تحریر کرتا تھا۔ ۱۹۶۵ء میں بسلسلۂ ملازمت میری تقرری لکھنؤ میں ہوئی۔ لکھنؤ کے ادبی ماحول نے تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے لئے سلسلہ وار مزاحیہ ڈرامہ ''میر صاحب'' تحریر کئے جسے نشر کیا گیا۔ میرے ان ڈراموں کی خصوصیت یہ تھی کہ لکھنوی تہذیب و تمدن کے علمبردار ''میر صاحب'' کا روایتی کردار ہندی کے مقبول مزاح نگار پدم شری کے پی سکسینہ مرحوم نے نہایت خوبصورت انداز میں ادا کیا تھا۔ میرے بارہ ریڈیائی ڈراموں کو آل انڈیا ریڈیو سے نشر کیا گیا۔ لکھنؤ کے قیام کے دوران مختلف رسائل اور اخباروں میں افسانے اور مضامین تحریر کئے۔ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی صاحب کی مسلم مجلس مشاورت کے روزنامہ ''قائد'' کے لئے روزانہ طنزیہ کالم ''شیخ و برہمن'' لکھتا رہا۔

پچاس کی دہائی میں شہر گورکھپور کا ماحول بھی بہت ادبی تھا۔ شعر و شاعری کا دور تھا۔ میں گورکھپور کی ادبی تنظیم ''انجمن شمع ادب'' کا سکریٹری تھا۔ ہر اتوار کو ادبی نشست کا اہتمام ہوتا تھا جس میں شرکت کرنے والوں میں ڈاکٹر اشفاق حسین صدیقی، پروفیسر شبلی ڈگری کالج کا نام قابل ذکر ہے۔ ڈاکٹر احمر لاری ہر ہفتہ ادبی نشست میں حصہ لیتے تھے۔ وہ اس زمانہ میں شمال مشرقی ریلوے

گورکھپور میں ملازم تھے۔ گورکھپور کے ادبی ماحول میں معروف شاعر ہندی گورکھپوری، احمر گورکھپوری، شبنم گورکھپوری، مسلم گورکھپوری، نسیم سامانی، ایم۔ کوٹھیاوی راہی، عمر قریشی وغیرہ کا اہم مقام تھا اور ان کی ذات سے شہر میں ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ تقریباً ایک درجن مختلف ادبی انجمنیں فعل تھیں جس میں شمع ادب کے علاوہ ''دائرہ ادب'' گورکھپور کے استاد شعراء کی تنظیم تھی۔ حضرت احمر گورکھپوری اس زمانہ میں گورکھپور کی ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، جنہیں استاد کا درجہ حاصل تھا۔ استاد احمر گورکھپوری اور نور گورکھپوری کا بزرگ شعراء میں شمار ہوتا تھا۔ ان کی شرکت محفل کی کامیابی کی ضمانت ہوا کرتی تھی۔ ہندی گورکھپوری قومی شاعر تھے، حب الوطنی پر ان کی بے مثال نظم ''یہ ہمارا وطن ہے ہمارا وطن'' وطن پرستی کی زندہ مثال تھی، مگر انہیں اُردو ادب وشاعری میں وہ مقام حاصل نہیں ہوا جس کے وہ مستحق تھے۔ حضرت بیکل اُتساہی سے قبل وہ نظم کی دُنیا میں مقامی طور پر مقبول ہو چکے تھے۔ بیرونی مشاعروں میں ان کی شرکت نہیں کے برابر تھی۔ جس کی وجہ سے اُردو ادب کے معروف شاعر ہندی گورکھپوری ایک گمنام شاعر کی حیثیت سے اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

گورکھپور کی ادبی سرزمین ہمیشہ سے زرخیز رہی ہے۔ مجنوں گورکھپوری، مہدی افادی اور ریاض خیر آبادی کے یادگار اور معیاری دور کے بعد بھی شہر میں ادبی سرگرمیوں میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ریاض خیر آبادی پوری عمر گورکھپور میں رہے۔ انہوں نے اپنے ماضی کی یاد میں شعر کہا تھا کہ:

جوانی جن میں کھوئی ہے وہ گلیاں یاد آتی ہیں
بڑی حسرت سے لب پر ذکرِ گورکھپور آتا ہے

ہندوپاک کے معروف شاعر اور ادیب ایم۔ کوٹھیاوی راہی کا ہفت روزہ ''اشتراک'' پابندیٔ وقت سے شائع ہو رہا تھا۔ عاصم واحدی کا روزنامہ ''مشرق'' بھی مستقل شائع ہو رہا تھا۔ ان تمام مقامی اخبارات کے علاوہ جماعت اسلامی (ہند) کا روزنامہ ''دعوت'' اور ماہنامہ ''تجلی'' کے ساتھ جمعیۃ علماء (ہند) کا روزنامہ ''الجمعیۃ'' بھی شہر میں ذوق وشوق سے پڑھا جاتا تھا۔ شہر گورکھپور

میں دو مشہور اُردو پریس تھے جو لیتھو پر اُردو اشاعت کا کام کر رہے تھے۔ مقبول و مشہور ''ساجدی پریس'' اور عاصم واحدی کا ''مشرق پریس''۔

ستّر کی دہائی میں پورے ملک میں بچوں کے ادب پر بہت کام ہو رہا تھا۔ ہر بڑے شہر سے بچوں کے رسالے شائع ہوتے تھے۔ جسے بچے بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ شمع پبلی کیشن کی جانب سے دہلی سے ماہنامہ ''کھلونا'' اور دہلی ہی سے ماہنامہ ''پیامِ تعلیم'' شائع ہوتا تھا۔ اُتر پردیش کے رامپور سے ماہنامہ ''نور'' اور لکھنؤ سے نسیم انہونوی مدیر ماہنامہ ''حریم'' کے صاحبزادے شمیم انہونوی کی ادارت میں ماہنامہ ''کلیاں'' اور خاکسار کی ادارت میں ماہنامہ ''ٹافی'' شائع ہوتا تھا۔ مجھ سے قبل ماہنامہ ''ٹافی'' کی ادارت ماہر معشیات اوصاف احمد (مرحوم) اور روزنامہ ''آگ'' لکھنؤ کے مدیر اعلیٰ احمد ابراہیم علوی کر چکے تھے۔ دراصل یہ ماہنامہ لکھنؤ کی ایک اہم شخصیت اُردو نواز معظم جعفری کی ملکیت تھی جو اس کے منیجر کلرک اور چپراسی بھی تھے۔ میں نے ماہنامہ ''ٹافی'' لکھنؤ کی ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۲ء تک ادارت کی۔ ان پانچ سالوں میں ماہنامہ ''ٹافی'' نے بیحد ترقی کی۔ پچاس سال قبل ماہنامہ ''ٹافی'' لکھنؤ میں شائع ہونے والوں میں آج کے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ناوک حمزہ پوری اور رئیس صدیقی کے نام قابل ذکر ہیں۔ رئیس صدیقی دہلی کے دُور درشن اور آکاش وانی سے منسلک ہیں اور بچوں کے ادب پر کئی کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ اچھے ادیب کے ساتھ معیاری شاعر بھی ہیں۔ انہوں نے دُور درشن اور آکاش وانی پر اُردو ادب کے معروف اُدباء اور شعراء کے انٹرویو لئے ہیں جو ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پٹنہ کے مشتاق احمد نوریؔ کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ نوری صاحب بہار اُردو اکیڈمی کے سکریٹری ہیں اور اکیڈمی کے ماہنامہ ''زبان و ادب'' کے مدیر اعلیٰ بھی ہیں۔ ان کی کچھ کہانیاں اور نظمیں میں نے ماہنامہ ''ٹافی'' لکھنؤ کے ۱۹۶۸ء کے شماروں میں شائع کی ہیں جو میرے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔

ٹافی پبلی کیشن سے میں نے بچوں کی جاسوسی ناول بعنوان ''ننھے جاسوس'' لکھی جو بچوں میں بیحد مقبول ہوئی۔ خاص طور سے بچوں کے نفسیات کے مدنظر لکھی گئی اس ناول کے مرکزی خیال

پر آج تک اُردو زبان میں بڑوں کے لئے بھی کوئی ناول میری نظروں سے نہیں گزرا۔

لکھنؤ کی بچوں کی ادبی اور ثقافتی تنظیم ''انجمن ادبِ اطفال'' اور اس کی کارکردگی کی تفصیلی رپورٹ میں نے مضمون ''سعد الدین...... لکھنوی تہذیب کی نمائندہ شخصیت'' کے تحت تحریر کیا ہے جو دلچسپ بھی ہے، معلوماتی بھی۔

مجھے ۲۰۰۹ء میں حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ اہلیہ بھی ہمراہ تھیں۔ حج سے واپسی پر سفرنامہ حج وعمرہ کتاب ''سوئے حرم'' تحریر کی جس کی اب تک ڈیڑھ ہزار کاپیاں فی سبیل اللہ بغیر ہدیہ کے عازمین حج کے درمیان تقسیم ہوچکی ہیں۔ ''سوئے حرم'' کو حج پر جانے سے پہلے پڑھنے والوں کی تعداد بنگال کے آسنسول بردواں اور مہاراشٹر کے متعدد شہر کے عازمین شامل ہیں۔ عوام کی خواہش پر ''سوئے حرم'' کا ہندی ایڈیشن بھی شائع ہوا۔ یہ ان کے لئے بہت کارآمد ہے جو اُردو زبان سے ناواقف ہیں۔ کتاب ''سوئے حرم'' آسان زبان میں حج کے تمام ارکان کی تفصیل کے ساتھ تحریر کی گئی ہے جسے ہر طبقہ کا قاری پسند کرتا ہے۔ اس کتاب میں ان تمام غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن پر دم لاگو ہوتا ہے اور عازمِ حج پر قربانی لازم ہوجاتی ہے۔

حج ایک عبادت ہے۔ حرمِ پاک کی زیارت، حجر اسود کا بوسہ، مسجد حرام میں نمازیں ادا کرنا اللہ ربّ العزت کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ دُنیاوی مشاغل سے قطعی دُور رہیں۔ منیٰ، مزدلفہ اور میدانِ عرفان میں دُعائیں مانگیں۔ حرم شریف کا ایک ایک لمحہ بیحد قیمتی ہے۔ شب و روز صرف عبادت میں مشغول رہیں۔ خانۂ کعبہ کو دیکھنا بھی ثواب میں شامل ہے۔ اپنے حج کو برباد نہ کریں۔

۲۰۱۰ء میں اہلیہ کے ساتھ امریکہ میں مقیم بیٹی تہمینہ اور داماد ڈاکٹر اشرف سعید کے شہر انڈیاناپلس کا سفر ہوا۔ یہ شہر امریکہ کے صوبہ انڈیانا کی راجدھانی ہے۔ امریکہ بہت ترقی یافتہ ملک ہے۔ آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کی ایک تہائی مگر رقبہ پانچ گنا بڑا ہے۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے لاکھوں کی تعداد میں لوگ آباد ہیں اور خوشحال زندگی بسر کررہے ہیں۔ کسی طرح کا ذہنی تناؤ کا وجود نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ کھلی سوسائٹی سے نوجوان طبقہ متاثر ہوتا ہے۔ اٹھارہ سال

کے لڑکے یا لڑکی سے یہ دریافت کرنا کہ رات کہاں گزاری خلافِ قانون ہے۔ ان تمام بُرائیوں سے بچنے کے لئے ہندوستانی پاکستانی اور بنگلہ دیشی مسلمانوں نے جو حکمت عملی اختیار کی ہے اسے میں نے اپنی کتاب ''امریکن مسلم'' میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

امریکہ کا ہر شہر بہت خوبصورت ہے، اسی لئے پورا ملک صاف ستھرا ہے اور گندگی کا نام و نشان نہیں ہے۔ امریکہ میں مقیم غیر مسلموں کا مجھے زیادہ علم نہیں ہے۔ مگر مسلمانوں میں کئی مسائل درپیش ہیں۔ امریکہ میں تولد ہونے والے بچوں کی ذہنی نشو و نما ایشیائی ملکوں کے نوجوانوں سے مختلف ہے۔ اسی لئے ازدواجی زندگی کے لئے مناسب رشتوں کا فقدان ہے۔ مسلم ملکوں کی بھی اپنی علاحدہ تہذیب، زبان اور رہن سہن میں فرق ہے۔ ماضی کے مقابلے اب امریکن مسلم میں بھی طلاق کا تناسب بڑھ گیا ہے جو تشویش کی بات ہے۔

میں نے اپنی زندگی کے پچاس سال لکھنؤ اور گورکھپور میں گزارے ہیں۔ لکھنؤ سے ۱۹۵۸ء سے آج تک تعلق قائم ہے۔ پُرانی تہذیب اور نشست و برخاست کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور حضرت مولانا منظور نعمانیؒ جیسے بزرگوں کے نیاز کا شرف حاصل ہوا۔ روزنامہ ''قومی آواز'' کے مدیر جناب حیات اللہ انصاری، عشرت علی صدیقی، عابد سہیل سے ملاقاتیں ہوئیں۔ تعلیمی دُنیا کے ڈاکٹر مصطفیٰ علوی لکھنؤ یونیورسٹی کے عربی شعبہ کے صدر تھے۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے ڈاکٹر رضوان علوی ہوئے۔ مولوی گنج کی مسجد میں مَیں نے ڈاکٹر مصطفیٰ علوی کی امامت میں نمازیں بھی ادا کی ہیں۔ اس زمانہ میں یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والوں میں ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل، نورالحسن ہاشمی وغیرہ کی نمایاں شخصیت تھیں۔ ماہنامہ ''صدقِ جدید'' کے مدیر عالم اسلام کے بزرگ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ تھے۔ ماہنامہ ''ندائے ملت'' اور ''عزائم'' کے مدیر اعلیٰ جمیل مہدی تھے۔ ملک کے بڑے معالج ڈاکٹر عبدالجلیل فریدیؒ نے روزنامہ ''قائد'' کی اشاعت کی۔ امین آباد لکھنؤ کے ادارہ فروغِ اُردو کے مولوی شمس علوی ''قومی تنظیم'' نامی رسالہ بھی شائع کرتے تھے۔ ماہنامہ ''فروغِ اُردو'' میں کتابوں کے اشتہارات کے علاوہ معیاری

افسانے اور نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں جس کی سالانہ قیمت ایک روپیہ تھی اور میں سالانہ خریداروں میں سے تھا۔ گذشتہ لکھنؤ میں بزرگانِ دین کا عظیم مسکن فرنگی محل ہے۔ لکھنؤ کے دینی ماحول میں اس خاندان کا بہت اہم کردار ہوا کرتا ہے۔ شہر کی مشہور عیدگاہ عیش باغ کا سارا نظام ہمیشہ اسی خاندان کے مبارک ہاتھوں میں رہا۔ ۲۵/ستمبر ۲۰۱۱ء کو پیش امام حضرت مولانا احمد میاں فرنگی محلی کی رحلت کا عظیم واقعہ پیش آیا۔ موجودہ پیش امام عیدگاہ عیش باغ حضرت مولانا احمد میاں فرنگی محلیؒ کے جانشین اور لائق بیٹے حضرت مولانا خالد رشید فرنگی محلی ہیں۔ مولانا کھلے ذہن کے دین کے تمام اُمور پر گہری نظر رکھنے والے عالم دین ہیں۔ جن کا ہر طبقہ میں بیحد عزت واحترام ہے۔ مولانا خالد رشید فرنگی محلی کا قائم شدہ ''اسلامک سینٹر'' مسلمانوں کے مسائل پر گہری نظر رکھتا ہے۔ مسئلے مسائل کو اسلام کی روشنی میں حل کرنے کی بھرپور کوشش ہوتی ہے۔ خصوصاً رمضان شریف کے ایام میں ذہن میں پہنچنے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جاتا ہے۔

میں نے اپنے ایامِ جوانی میں لکھنؤ میں وہ دور بھی دیکھا ہے جب فحش نگاری پر مبنی ''واہی واہانوی'' کی جنسی آوارگی اور تہذیب واخلاق سے گری ہوئی ناولوں کی دھوم تھی۔ یہ فحش ناولیں نوجوان طبقہ کے درمیان بیحد مقبول تھیں جسے وہ چھپ چھپ کر پڑھتے تھے۔ ''واہی واہانوی'' کسی ایک شخص کا نام نہیں تھا بلکہ لکھنؤ کے اس زمانہ کے نوجوان ادیبوں کا ایک گروہ تھا جو ان فرضی نام سے ان ناولوں کی تخلیق کر رہا تھا۔ اس میں لکھنؤ کا انتہائی ذہین طبقہ شامل تھا جو بعد میں اُردو ادب کے عظیم ناول نگار، مزاح نگار اور صحافیوں میں شمار کئے گئے۔ ابن صفی اس فحش نگاری سے سخت نالاں تھے، لہٰذا اس بڑھتی ہوئی جنسی بے راہ روی اور مخرب اخلاق لٹریچر کی آندھی کو روکنے کے لئے الٰہ آباد کی ایک اُردو نواز شخصیت عباس حسینی کے تعاون سے نکہت پبلی کیشن کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس ادارہ سے ماہنامہ ''نکہت'' کا اجراء ہوا اور ہر ماہ ابن صفی کے جاسوسی ناول کی اشاعت کی ابتداء ہوئی۔ ابن صفی کے دلچسپ ناولوں میں کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کے جاندار کردار بیحد مقبول ہوئے۔ ابن صفی نے اپنے ناول کے کردار کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کی ایسی جاندار عکاسی کی کہ اکثر لوگ اسے حقیقی تصور کرنے

لگے۔ اسی زمانہ میں ایک لطیفہ گردش کررہا تھا کہ چند حضرات الٰہ آباد میں کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کے گھر کا پتہ دریافت کررہے تھے۔

میں بھی ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کا دیوانہ تھا۔ ان کی تقریباً ہر ناول پڑھنے کے بعد میں نے خود ایک جاسوسی ناول بعنوان ''سونے کی لاش'' لکھی جسے نومبر ۱۹۶۰ء میں الٰہ آباد کے اُردو کے پبلشر دینا ناتھ بھارگوا نے ظفر پبلی کیشن کے تحت شائع کیا۔ جس کی قیمت بارہ آنہ تھی۔ اس وقت میری عمر محض بائیس سال تھی۔ افسوس کہ میرے پاس اس ناول کی ایک بھی کاپی محفوظ نہیں ہے۔ اگر کسی ادب نواز اور صاحب ذوق کی لائبریری میں ہو تو برائے مہربانی مجھے تحفتاً / قیمتاً عنایت فرما کر ممنون فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

جیسا کہ میں نے ابتداء میں تحریر کیا ہے کہ بیس سال کی عمر سے لکھنا شروع کیا۔ بائیس سال کی عمر میں ایک جاسوسی ناول لکھی۔ سیکڑوں افسانے، کہانیاں، انشائیے تحریر کئے۔ مگر افسوس کہ اپنی لاپرواہی کی وجہ سے اپنی تخلیقات کو محفوظ نہیں رکھ سکا۔ آکاش وانی لکھنؤ سے بارہ ریڈیائی ڈرامے ''میر صاحب'' کے عنوان سے نشر ہوئے۔ ان ڈراموں کی خصوصیت یہ تھی کہ میرا ہر ڈرامہ بمبئ آکاش وانی کے ''وِوِدھ بھارتی'' پروگرام کے تحت دوبارہ دن کے ایک بج کر دس منٹ پر اتوار کے دن پروگرام ''آج اتوار ہے'' میں نشر کیا جاتا تھا۔

گورکھپور کے قیام کے دوران آکاش وانی گورکھپور سے مختلف موضوعات پر بارہ ڈرامے نشر ہوئے، مگر کسی بھی اسکرپٹ کی کاپی محفوظ نہیں ہے۔ فوٹو کاپی کی مشین ابھی عام نہیں تھی، لہٰذا اوریجنل کاپی جمع کی اور اس کی کاپی نہیں رکھی۔ اسی طرح کچھ بہت معیاری افسانے مثلاً ماہنامہ ''شب خون'' الٰہ آباد میں شائع انشائیہ ''افسانوں کی دُکان'' اودھ کے سابق نوابین کے درمیان تقسیم کی جانے والی رقم وثیقہ پر تحریر کردہ میرا افسانہ ''وثیقہ'' اور پرانے زمانہ میں لکھنؤ میں رائج ایک بہت مشہور محاورہ اُلٹے بانس بریلی پر میرا مشہور افسانہ ''اُلٹے بانس بریلی'' کی نقل موجود نہیں ہے۔ برباد ہونے سے جو بچ گیا اس کو یکجا کرکے ۱۵۳ صفحات پر مشتمل افسانوں کا مجموعہ ''بکھرے موتیوں کا ہار''

۲۰۱۳ء میں شائع کیا۔ جس کی رسم اجراء ۲۳/مارچ ۲۰۱۳ء کو محمد علی جوہر فاؤنڈیشن امین آباد لکھنؤ اتر پردیش میں پروفیسر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحب مرحوم کی صدارت میں ہوئی تھی۔ رسم اجراء کی مفصل رپورٹ ''رسم اجراء'' کے عنوان سے شامل اشاعت ہے۔ میرے ریڈیائی ڈراموں کی بارہ ڈراموں کی سیریز محفوظ نہیں رکھی جاسکی مگر اس سلسلہ کا ایک مزاحیہ اور طنزیہ ڈرامہ ''میر صاحب نے تیاری کی'' اس کتاب میں شامل ہے۔ ڈرامہ کے مرکزی کردار کو تبدیل کردیا گیا ہے۔ میرے عزیز دوست سعد الدین عندلیب کی خواہش پر میں نے یہ ڈرامے لکھے تھے۔ افسوس کہ وہ نہیں رہے۔ مرحوم کی کسی محفل میں شرکت کے سلسلہ میں ان کی تیاری کے مدنظر میں نے پہلا ڈرامہ تحریر کیا تھا جو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا تھا۔ یہ مزاحیہ مرحوم دوست سعد الدین احمد کے لئے نذرانۂ عقیدت بھی ہے۔

……☆……

افسانچے

دیوبندی

بمبئی میں منعقد ہونے والا کل ہند مشاعرہ اختتام پذیر ہو گیا اور اب شعراء حضرات کو سوائے بمبئی کی تفریح کرنے کے کوئی کام نہیں تھا۔ مجھے اور تقریباً سبھی شعراء کو شہر گھومنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور واپسی ایک دِن اور ایک رَات کے بعد تھی۔ بمبئی کی کسی اکاڈمی کے چند حضرات مجھ سے ملاقات کرنے آئے اور گزارش کی کہ آپ سبھی شعراء حضرات آج کی رات ہمارے مہمان کی حیثیت سے ہمارے ساتھ گزاریں۔ قیام اور طعام کی ذمہ داری ہماری ہوگی اور جو ہو سکے گا ہم خدمت بھی کریں گے۔ اسی بہانے ہمارے یہاں ایک ادبی نشست ہو جائے گی...... میں نے اس پیشکش پر غور کیا، تجویز مجھے مناسب لگی۔ آخر رات کہیں گزارنی ہے، کیوں کہ ہم سب کی واپسی دوسرے دن تھی، لہٰذا میں نے اپنی منظوری دے دی۔ اکاڈمی کے ذمہ داران میں سے ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا۔

"ملک زادہ منظور صاحب...... آپ کے ساتھ کون کون شاعر آئیں گے"؟ میں نے کہا:

"میرے ساتھ ڈاکٹر وسیم بریلوی، ڈاکٹر راحت اندوری، منظر بھوپالی، ندا فاضلی، انور جلالپوری، پاپولر میرٹھی اور ماجد دیوبندی ہوں گے"۔

وفد کے ان صاحب نے فوراً کہا...... "دیکھئے ملک زادہ صاحب! کسی دیوبندی کو نہ لائیے گا۔ اگر انہیں آنا ہو تو وہ ماجد سہارنپوری کی حیثیت سے آئیں"۔ میں نے فوراً جواب دیا۔

"یہ تو ناممکن ہے"۔

......☆......

(مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن، امین آباد، لکھنؤ میں منعقد ۲۴ر مارچ ۲۰۱۳ء کو احمد مشکور کی دو کتابوں "امریکن مسلم" اور "بکھرے موتیوں کا ہار" کی رسمِ اجراء کے موقع پر پروفیسر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کے صدارتی خطبہ کا اقتباس)

جوتا

پچاس کی دہائی میں اتر پردیش کے شہر گورکھپور میں کل ہند مشاعرہ ہوا تھا جس میں اس وقت کے مشہور و معروف شعراء نے شرکت کی تھی۔ ان شعراء حضرات میں، جہاں تک میری یادداشت ساتھ دے رہی ہے۔ حضرت جگر مرادآبادی، حضرت فراق گورکھپوری، جناب حبیب احمد صدیقی، جناب نشور واحدی، اور اسرار الحق مجاز لکھنوی نے اپنا کلام پیش کیا تھا۔

گورکھپور شہر پوربی اُتر پردیش کا بڑا شہر ہے جس کا اُردو بازار بہت مقبول ہے۔ اس بازار میں جوتوں کی ایک بہت بڑی دُکان تھی جس کا نام تھا حاجی بوٹ ہاؤس۔ گورکھپور میں ''حاجی بوٹ ہاؤس'' کو وہی شہرت اور مقبولیت حاصل تھی جو کسی زمانہ میں لکھنؤ کے امین آباد بازار کے ہولڈال اور اٹیچیوں کی دُکان ''ایچ۔ اے۔ وہاب'' کی رہی ہے۔ اس زمانہ میں اشتہار کا ایک طریقہ یہ تھا کہ جس چیز کی دُکان ہوتی تھی اس کا ایک نقلی ماڈل دُکان کے باہر لٹکا دیا جاتا تھا، جسے دُور سے دیکھ کر گاہک بغیر پتہ دریافت کیے دُکان پر آجاتے تھے۔ حاجی بوٹ ہاؤس کی دُکان کے باہر پلیٹ فارم پر تقریباً چارفٹ کا بہت بڑا نقلی جوتا رکھا ہوا تھا۔

اُردو بازار کی سیر کرنے نکلے شعراء کی نظر اس جوتے پر پڑی۔ اس عظیم الشان جوتے کو دیکھ کر حضرت جگر مرادآبادی نے اپنے ہم مشرب دوست اسرار الحق مجاز لکھنوی سے کہا:

''مجاز۔ دیکھو کتنا بڑا جوتا ہے''۔

مجاز لکھنوی کی رگِ ظرافت پھڑکی اور وہ برجستہ بولے۔

''ہاں......! حشر کے میدان میں اللہ میاں اسی جوتے کو بھگا بھگا کر ہماری خاطر کریں گے''۔

......☆......

ابھی میں پیدا نہیں ہوا ہوں

الیکشن میں اُمیدواروں کا ایک دوسرے کی کردار کشی کرنا اب کوئی نئی بات نہیں رہ گئی ہے۔ اپنی خوبیاں نہ بیان کر کے دوسروں کی خامیوں کا ڈھنڈورہ پیٹا جاتا ہے۔ یہ بالکل غیر معیاری طریقہ ہے۔ عوام الیکشن میں اپنے اُمیدوار کو اس کی خوبیوں کو دیکھ کر اس کا انتخاب کرتا ہے۔ اس کے برعکس مخالف اُمیدوار پر کیچڑ اُچھالنا اب انتخابی مہم کا حصّہ بن گیا ہے۔ صحت مند طریقہ تو یہ تھا کہ اُمیدوار کامیاب ہونے کے بعد عوام کے لئے آسانی بہم پہنچانے والے کاموں کو اپنی انتخابی مہم کا مرکز بناتے اور اپنے ووٹروں کے دل جیتنے کی کوشش کرتے۔ اُمیدوار اپنے حلقہ کے رائے دہندگان کا اعتماد اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب وہ ان کی بنیادی سہولتوں مثلاً بجلی پانی اور مہنگائی پر کنٹرول کا یقین دلائیں۔ بدقسمتی سے بنیادی باتوں کو نظر انداز کر کے مخالف اُمیدواروں کے کیریکٹر پر کیچڑ اُچھالے جاتے ہیں۔ جمہوریت کی یہ ایک نئی تشریح ہے۔

۲۰۰۹ء کے ایک الیکشن مہم کے دوران جناب لال کرشن ایڈوانی اور جناب مُرلی منوہر جوشی نے کانگریس پارٹی کے راہل گاندھی کو "بچہ" کہا۔ راہل گاندھی کی بہن پرینکا گاندھی نے جواباً کہا کہ ان بزرگوں کے مقابلے راہل گاندھی یقیناً بچہ ہیں، ظاہر ہے کہ عمر اور تجربہ کے لحاظ سے وہ بچہ ہی کہے جائیں گے۔

دونوں قائدین کا راہل گاندھی کو بچہ کہنے پر ایک واقعہ یاد آ گیا جس کے رو سے راہل گاندھی دراصل ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے ہیں۔ قصّہ یوں ہے کہ اُردو کے مشہور و معروف شاعر حضرت جوشؔ ملیح آبادی، حضرت رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری اور جناب اسرار الحق مجازؔ لکھنوی پر شراب کا نشہ سوار ہوا تو جوشؔ ملیح آبادی نے فراقؔ گورکھپوری سے کہا...... فراقؔ میں بیس سال کا جوان ہو گیا ہوں۔ فراقؔ گورکھپوری نے اسی رو میں جواب دیا...... اور میں صرف دس سال کا ہوں۔ مجازؔ لکھنوی سے نہ رہا گیا برجستہ بولے کہ اس حساب سے تو میں ابھی پیدا ہی نہیں ہوا ہوں۔

یہ کیا بدتمیزی ہے

شہر کا ماحول خراب تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے۔ شہر کے کچھ حصّے تو بہت ہی حسّاس تھے، جہاں دو موٹر سائیکلوں کے ٹکرانے سے فساد برپا ہو جاتا تھا۔ ایسی حالت میں ہر شخص ڈرا ڈرا اور سہما ہوا تھا کہ پتہ نہیں کب کیا ہو جائے۔ جو افراد اپنی ضروریات کے سلسلہ میں گھر سے باہر تھے اُن کے گھر کی عورتیں اُن کی خیریت سے واپسی کی دُعائیں مانگ رہی تھیں۔ اسکول کالج بند کر دیئے گئے تھے۔ لہٰذا بچّے گھروں میں قید تھے اور حالات کو سمجھنے سے قاصر تھے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ایک فرقہ دوسرے فرقے کا خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ انسانیت نام کی کوئی چیز ہی نہیں رہ گئی تھی۔ حیوانیت کا راج تھا اور کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ فساد کی آگ شہر سے ہوتے ہوئے ریلوے اسٹیشن تک پہنچ گئی تھی، جسے عموماً لوگ محفوظ جگہ سمجھتے تھے۔ فسادی نوجوانوں کا ایک قافلہ اسٹیشن پر کھڑی ٹرین کے ہر کمپارٹمنٹ میں داخل ہو کر فساد برپا کرنے لگا۔

شور مچاتے ہوئے کئی لڑکے فرسٹ کلاس کے ایک ڈبہ میں ہاتھوں میں چاقو لئے نعرہ لگاتے ہوئے جیسے ہی داخل ہوئے کالے کوٹ میں ملبوس ایک خشخشی داڑھی والے شخص نے برجستہ کہا ''یہ کیا بدتمیزی ہے......؟'' ایک نوجوان نے اس کے پیٹ میں پورا چاقو اُتار دیا اور وہ شخص ...... کمپارٹمنٹ کے فرش پر گر کر خون سے تربتر تڑپنے لگا اور تھوڑی دیر میں اس کی موت ہو گئی۔

اس شخص کے کالے کوٹ پر لگی نام کی چھوٹی سی پلیٹ پر نظر پڑتے ہی ایک فسادی نے دوسرے سے کہا...... ''ابے بھاگ۔ مرنے والا کوئی ایم۔ پی۔ سریواستو ہے......'' اتنا کہہ کر سب کمپارٹمنٹ سے خاموشی سے نکل گئے۔

......☆......

بدنصیب ابّو

''ابّو......''

''کہئے......''

''جنید کہاں گیا؟''

جنید کے انتقال کے دوسرے ہی دن ابّو کو ایسے غیر متوقع سوال کے قطعی اُمید نہیں تھی۔لہٰذا جاوید کے اس اچانک سوال پر ان کو ایسا محسوس ہوا گویا اُن کا دل سینے سے باہر نکل آئے گا۔آبدیدہ آنکھوں سے بمشکل جواب دے سکے۔

''اللہ میاں کے یہاں......!''

''کب آئے گا اللہ میاں کے یہاں سے؟''

اس دوسرے سوال نے ان کے دل پر ہتھوڑا چلادیا۔ایسا لگا جیسے وہ خود اس دُنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔دل پر پتھر رکھ کر جاوید کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''جب آپ پڑھ لکھ کر بڑے ہو جائیں گے اور اپنی امّی ابّو کی خوب خدمت کریں گے تو وہ آپ کے پاس آجائے گا''۔

''ابّو-میں اب خوب دل لگا کر پڑھوں گا اور بڑا ہو کر آپ لوگوں کی خوب خدمت کروں گا''۔

''شاباش-!اچھے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں''۔

''ابّو-مجھے جنید چاہئے......'' جاوید اپنے چھوٹے بھائی کے لئے ایسے مچلنے لگا جیسے بچّے کھلونوں کے لئے مچلتے ہیں۔

''آجائے گا بیٹے-آپ پریشان نہ ہوں......وہ اللہ میاں کے یہاں سے آپ کے پاس

آئے گا''۔

''مگر کب آئے گا مجھے ابھی اس کے پاس جانا ہے''۔ ابّو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ایسا مت کہو''۔

ابّو کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لہٰذا وہ خاموش ہو گئے۔

معیشت ایزدی کی مصلحتوں کے آگے انسان لاچار اور مجبور ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر تو ایک پتا بھی نہیں ہلتا۔ برسات کا موسم تھا۔ بھیانک اندھیری رات میں بادلوں کی خوفناک گرج، بجلی کی چمک اور دل کو دہلانے والی طوفانی بارش ہو رہی تھی۔ گھر کا ہر فرد سہما ہوا تھا۔ طوفانی بارش کے خاتمہ کی دُعائیں مانگی جا رہی تھیں۔ اچانک جاوید کے پیٹ میں درد اُٹھی۔ دو تین اُلٹیاں ہوئیں اور دیکھتے دیکھتے وہ ہمیشہ کے لئے اپنے ابّو کو چھوڑ کر اپنے چھوٹے بھائی کے پاس چلا گیا جس کے لئے وہ بیحد پریشان تھا۔ ابّو کے دل پر ایسی کاری ضرب لگی کہ آج پچاس سال بعد بھی اپنے دونوں بیٹوں کی یادیں دل سے جدا نہیں ہو سکیں۔ ابّو اب اپنی طبعی عمر کو پہنچ چکے ہیں۔ جب کسی بچّے کی علالت یا موت کی خبر آتی ہے ابّو کا دل تڑپ جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے گویا دل حلق میں اٹک گیا ہے۔

وہ بدنصیب ابّو ...... اپنے ناتواں کندھوں پر غموں کا پہاڑ لئے آج بھی باحیات ہیں۔

......☆......

فضول خرچ

کال بیل کی آواز پر کوٹھی کا دروازہ کھلا۔ مالک مکان سیّد تقی حسن برآمد ہوئے تو دیکھا کہ گھنٹی بجانے والے پھٹی پُرانی شیروانی اور ٹوپی میں ملبوس ایک ضعیف شخص کھڑے ہیں۔ سیّد صاحب نے دریافت کیا...... ''کہئے...... کیسے آنا ہوا''؟ اس شخص نے جواب میں بڑی عاجزی سے کہا۔

''جناب...... میں اس وقت کچھ پریشانی میں مبتلا ہوں...... آپ سے مدد کی درخواست ہے۔ سو پچاس روپے سے امداد فرمادیں''۔

سیّد صاحب اس سائل کے اندازِ گفتگو سے بیحد متاثر ہوئے اور اس کی پریشانی سن کر خود بھی پریشان ہوگئے۔ ''ابھی میں آتا ہوں'' کہہ کر وہ کوٹھی کے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد آئے اور اس پریشان حال شخص کے ہاتھ پر دو ہزار روپے کا رنگین نیا نوٹ رکھ دیا اور بولے......

''لیجئے اس سے کام چلایئے...... اللہ آپ کی پریشانیوں کو دُور فرمائے...... مگر آپ شکل وصورت اور لباس سے ایک اچھے خاندان کے فرد لگتے ہیں پھر آپ کی ایسی حالت کیوں ہوگئی کہ آپ کو آج کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت آگئی''۔

شیروانی اور ٹوپی میں ملبوس سائل نے جو جواب دیا اسے سن کر سیّد صاحب کے ہوش ٹھکانے لگ گئے۔

''حضور...... حقیقت یہ ہے کہ میں بھی آپ ہی کی طرح فضول خرچ تھا''۔

......☆......

فراغ دل

وہ شہر کی سب سے مشہور مخیر خاتون تھیں۔ ان کا دل بھی بہت بڑا تھا اور گھر بھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ ان کا باورچی خانہ بہت وسیع تھا۔ خود ان کو اس بات کا علم نہیں ہوتا تھا کہ آج کتنے افراد کا کھانا تیار ہو رہا ہے۔ اللہ نے فراغ دلی کے ساتھ غرباء اور مساکین کے درد کو محسوس کرنے والا دل بھی عطا کیا تھا۔ جس کسی کو کہیں ٹھکانہ نہیں ملتا وہ ان کے گھر آ کر قیام بھی کرتا اور طعام بھی۔ کوئی بھی ضرورت مند ان کے گھر سے کبھی خالی ہاتھ واپس نہیں گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے کمزور بندوں کی مدد کے لئے اس بزرگہ کو پیدا کیا ہے۔

اس بزرگ خاتون کی دس اولادیں ہوئیں۔ چھ بیٹیاں اور چار بیٹوں کی بڑی دھوم دھام سے شادیاں کیں۔ گھر بہوؤں اور دامادوں سے بھر گیا۔ سب کے گھر آباد ہو گئے۔

مگر ایسی فراغ دل بزرگہ کا جب آخری وقت آیا تو وہ بھوک اور پیاس سے تڑپ کر مر گئیں۔ کوئی ایک چمچہ پانی بھی ان کے منہ میں ڈالنے والا نہ تھا۔

......☆......

بھوک

گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ بھوک سے پریشان ایک بچّہ سڑک کے کنارے ڈھابہ نما ہوٹل کے سامنے کھڑا ہوٹل میں کھانے والوں کو بڑی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ تندوری روٹی اور قورمہ کھاتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر اس کی بھوک اب برداشت سے باہر ہوگئی۔ جھپٹ کر اس نے ایک روٹی اُٹھائی اور بھاگنے لگا۔ ہوٹل کے باہر موجود لوگوں نے اس کو پکڑ کر پیٹنا شروع کر دیا۔ ہر شخص اس غریب بچّے کو فخریہ مار رہا تھا۔ ایک بھیڑ اکٹھا ہوگئی مارو، مارو کا شور سن کر اخبار کا نامہ نگار رک گیا۔ اس نے بچّے کو اپنے قبضے میں لے لیا اور بولا۔ بھوک سے نڈھال غریب بچّے کو ایک روٹی کی چوری پر مارنے والے اگر آپ اس وزیر کو مارتے جس نے روٹی کپڑا اور مکان کا وعدہ کر کے خود ایئر کنڈیشن کمرہ میں بیٹھا ہوا ہے اور اس کی غریب عوام بھوک مری کا شکار ہو رہی ہے، تو زیادہ بہتر تھا۔

مجمع میں سناٹا چھا گیا۔ اس صحافی نے کہا کہ غور سے سنئے۔

''حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ جس ملک میں بچّہ روٹی چُراتے پکڑا جائے، اس ملک کے بادشاہ کے ہاتھ کاٹ ڈالو''۔

......☆......

گوشت خور

دہرہ دُون کے ایک ہی پبلک اسکول میں سنجے بہوگنا اور عبداللہ کی تعلیم ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے اچھے دوست تھے۔ سنجے کو ایک بات کی عبداللہ سے یہ شکایت رہتی تھی کہ مسلمان گوشت خور قوم ہے۔ عبداللہ نے اپنے عزیز دوست کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم یقیناً گوشت کھاتے ہیں مگر ہم سبزیاں بھی کھاتے ہیں اور بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہمیں گوشت سے پرہیز نہیں ہے جیسا کہ ہندوؤں کی کچھ اعلیٰ ذات میں گوشت خوری قطعی ممنوع ہے۔ ان تمام اختلافات کے باوجود سنجے اور عبداللہ کے بہت گہرے تعلقات تھے۔ دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ تعلیم کے بعد باعزت عہدوں پر فائز ہو گئے۔ عبداللہ اپنے دوست سنجے کو اس حقیقت سے آگاہ کر رہا تھا کہ کمزور مالی حالت نے مسلمانوں کو گوشت خوری سے دُور کر دیا ہے، اب غیر مسلم مسلمانوں سے زیادہ گوشت خور ہو گئے ہیں، مگر یہ بات سنجے بہوگنا کے حلق سے نیچے نہیں اُترتی تھی۔

ایک دن دونوں دوست دہرہ دون کے ''کے ایف سی'' ریسٹورینٹ میں داخل ہوئے۔ ہوٹل کا وہ ہال جس کی ساری میزیں گاہکوں سے بھری رہتی تھیں بالکل خالی تھیں اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔

''ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ اب اپنا کاروبار ختم کرنے کے موڈ میں ہیں''۔ عبداللہ نے کہا۔

''نہیں نہیں...... ایسا کیسے ہوسکتا ہے''۔ سنجے نے تعجب سے کہا۔

''رُکو میں اس سیکورٹی گارڈ سے معلوم کرتا ہوں''۔ عبداللہ نے کہا۔

عبداللہ نے گارڈ سے پوچھا۔ ''ریسٹورینٹ آج بند کیوں ہے''؟

''صاحب! بند نہیں کھلا ہے۔ سناٹا اس لئے چھایا ہے کہ آج ''نوراتر'' ہے۔ گارڈ نے جواب دیا۔

عبداللہ نے سنجے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ اب بتاؤ گوشت خور کون ہے؟

......☆......

قانون

کوٹھی سے رونے کی آوازوں سے تو یہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یقیناً کسی کا انتقال ہوا ہے مگر کسی کی اندر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ دو عدد غیر ملکی کتّے کوٹھی کا پہرہ دے رہے تھے۔ عورتیں رو رہی تھیں۔ مرد افسوس کر رہے تھے اور بچّے سمجھنے سے قاصر تھے کہ آخر یہ سب رو کیوں رہے ہیں۔ کوٹھی میں سنّاٹا چھایا ہوا تھا جہاں کبھی ٹی وی اور ڈی جے کی تیز آوازیں آتی تھیں، رات رات بھر جشن منایا جاتا تھا، جس کی وجہ سے پڑوسیوں کی نیندیں حرام ہو جاتی تھیں، وہاں قبرستان جیسا سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ کوٹھی کے مالک حکومت میں کمشنر کے اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ دولت ان کے پیروں کی جوتی تھی جسے وہ دونوں ہاتھوں سے لُٹا رہے تھے، مگر قانون کے ہاتھ اُن کے دونوں ہاتھوں سے بھی لمبے تھے۔ کروڑوں روپے کی رشوت لینے کے جرم میں پولیس ان کو کوٹھی سے گرفتار کر کے لے گئی۔ کوٹھی میں ویرانی چھائی گئی۔

کچھ ہی دنوں بعد اسی کوٹھی میں پھر جشن منایا جا رہا تھا۔ مہمانوں کی آمد کا تانتا لگا ہوا تھا۔ شراب اور کباب کا دور چل رہا تھا۔ بیرے مہمانوں کی خاطر تواضع میں بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ پوری کوٹھی روشنی میں جگمگا رہی تھی۔ عام لوگ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ کمشنر صاحب رشوت لینے کے جرم میں گرفتار ہو کر جیل گئے تھے لوگ کہہ رہے ہیں سچ یا جھوٹ واللہ اعلم بالثواب۔ کمشنر صاحب رشوت دے کر جیل سے چھوٹ کر گھر آ گئے ہیں۔

......☆......

دِکھاوا

بھارتی جنتا پارٹی کے ممبر پارلیامنٹ سبرامنیم سوامی نے اپنی ہی پارٹی کے وزیر خزانہ ارون جیٹلی کے لباس پر طنز کیا کہ ہمارے وزیر کوٹ اور ٹائی میں ہوٹلوں کے بیروں کی طرح لگتے ہیں۔ دراصل ارون جیٹلی چین کی راجدھانی بیجنگ میں بینک آف چائنا کے چیئرمین سے ملاقات کے دوران سوٹ اور ٹائی میں ملبوس تھے۔ سبرامنیم سوامی اپنے علاوہ ہر شخص کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ ہوٹلوں کے بیروں کا مذاق اڑانے پر یہ طبقہ سوامی سے بیحد خفا ہوا۔ ان کے مطابق ممبر پارلیامنٹ کو کیا معلوم کہ ہندوستان کے معروف انسٹی ٹیوٹ آف ہوٹل مینجمنٹ سے گریجویشن کرنے کے بعد بھی اچھی نوکری نہ ملنے کی وجہ سے بیرون ملک کام کر رہے ہیں۔ امریکہ کے ایک ہوٹل کے ہندوستانی بیرے نے انکشاف کیا کہ میں سنہرے مستقبل کی تلاش میں امریکہ آیا مگر ڈگری ہونے کے باوجود اسے بیرے کے طور پر ملازمت ملی۔ اس پیشے میں گراہک کی خدمت کے عوض موٹی رقم بخشش کے طور پر مل جاتی ہے مگر جب اس کی لڑکیوں کی شادی کی بات چلتی ہے تو لڑکے والے یہ سن کر بدک جاتے ہیں کہ لڑکی کا باپ ہوٹل میں بیرا ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے وطن واپس آ کر کوئی باعزت کام کرنے کا فیصلہ کیا۔

شمال مشرقی ریلوے لکھنؤ کی چھوٹی لائن کے اسٹیشن کے سائیکل اسٹینڈ کا ٹھیکہ ہر سال جے شنکر تیواری لیتے تھے۔ بیس سال بعد انہوں نے ٹھیکہ لینا بند کر دیا۔ دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ اس سائیکل اسٹینڈ کے ٹھیکے کی وجہ سے میری لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہو رہی تھیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ برہمن خاندان کے لڑکوں کے رشتے آتے تھے اور جب انہیں میرے سائیکل اسٹینڈ کے پیشہ کے بارے میں علم ہوتا تو وہ انکار کر دیتے تھے۔ آئی اے ایس تک کے رشتے اس پیشے کی وجہ سے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچے۔ لہٰذا میں نے اب بزنس شروع کر دیا ہے۔ بھگوان کی کرپا سے میری تینوں

لڑکیوں کی شادیاں ہوگئیں...... مگر آمدنی کے لحاظ سے سائیکل اسٹیڈ بہتر تھا جہاں میرے ایک درجن ملازمین چوبیس گھنٹے ڈیوٹی کرتے تھے۔ ہمارے ملک میں دکھاوا بہت ہے، کام کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ غیر ممالک میں تعلیم یافتہ لوگ ٹیکسی چلانے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ ہر پیشے کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی لئے مغربی ممالک میں اکیلی سواری کو ٹیکسی ڈرائیور کے بغل میں بیٹھنا لازمی ہے۔

......☆......

اَندھی محبت

کہتے ہیں کہ ماں کی محبت اندھی ہوتی ہے۔

اس جملہ کو عموماً روایتی محاورہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جو درست نہیں ہے۔ ماں کی اندھی محبت کا جہاں تک تعلق ہے اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ ماں اپنے اس بچّے سے بے پناہ محبت کرتی ہے جس کو اس نے ابھی دیکھا تک نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ابھی اس کے شکم میں پل رہا ہے۔ اندھی محبت سے مُراد یہ ہے کہ ایسی محبت جو بغیر دیکھے کی جائے۔ ماں اپنے شکم میں پلنے والی اولاد کی صحت مند پیدائش کے لئے اپنی پسندیدہ اشیاء کھانا ترک کردیتی ہے۔ ہر اس چیز سے پرہیز کرتی ہے جس کے کھانے سے پیدا ہونے والے بچّے کے لئے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہو۔

اسی جذبہ کو کہتے ہیں ماں کی اندھی محبت جسے ابھی دیکھا نہیں مگر اس کی صحت کا خیال اس کی پیدائش سے قبل شروع ہوجاتی ہے۔

.......☆.......

پردہ

بین الاقوامی شہرت یافتہ صحافی، ادیب، دانشور اور مفکّر خشونت سنگھ مرحوم نے انگریزی کے روزنامہ ''ہندوستان ٹائمز'' میں اسلام میں رائج خواتین کے پردہ پر تبصرہ کیا تھا۔ موصوف حجاب کو جہالت اور قدامت پسندی کی نشانی تصور کرتے تھے۔ ان کی نظر میں برقع سنّیوں کے لئے وہابی سعودی عربیہ حکومت اور شیعوں کے لئے امام آیت اللہ خمینیؒ کی دین ہے۔ حکومت فرانس کی برقع پر متوقع پابندی کی حمایت میں آواز بلند کرنے والے عظیم صحافی اور ادیب نے اپنے مضمون میں کہا تھا کہ انہوں نے مرحوم آیت اللہ خمینی کے اسلامی انقلاب سے قبل شاہ رضا شاہ پہلوی کے دورِ حکومت میں صرف ایک بار تہران کا ایک ہفتہ کا دورہ کیا تھا، مگر ان کو ایک بھی عورت نقاب میں نظر نہیں آئی تھی۔ ماضی کو یاد کرتے ہوئے خشونت سنگھ نے لکھا تھا کہ ملک کے تقسیم سے قبل لاہور کے گورنمنٹ گرلز کالج کی پرنسپل کی دعوت کو اس بنا پر ٹھکرا دیا تھا کہ انہیں کالج کی طالبات کو پردہ کے پیچھے رہ کر خطاب کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اس کے برعکس انہوں نے لاہور کنیرڈ کالج کی طالبات کو اس لئے خطاب کیا کیوں کہ وہاں ایک بھی لڑکی برقع پوش نہیں تھی۔

قرآن اور حدیث کے علاوہ اسلامی تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے انتہائی ذہین اور قابل صحافی خشونت سنگھ نے غالباً سورۃ الاحزاب: 59 سے دانستہ چشم پوشی کی تھی، جس میں حجاب پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے:

''اے نبیؐ......! اپنی بیویوں سے اور اپنی بیٹیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنے اوپر جلباب لٹکا لیا کریں۔ یہ اس بات سے زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچان لی جائیں اور ستائی نہ جائیں''۔ عربی زبان میں جلباب اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو تمام جسم کو ڈھانک لے جو کپڑے تمام بدن کو نہ ڈھانک سکے اس پر جلباب کا لفظ صادق نہیں آتا۔

ہندوستانی تہذیب میں بھی ابتدا سے پردہ کا رواج عام تھا۔ ہندو خواتین پردہ کرتی تھیں اور گھونگھٹ میں رہ کر تمام گھریلو ذمہ داریاں انجام دیتی تھیں۔ ہندو مذہب میں خاندانی رشتوں کی پاسداری کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے شوہر کے بڑے بھائی اور خسر سے بھی پردہ کرتی تھیں اور بغیر گھونگھٹ کے ان کے روبرو نہیں ہوتی تھیں۔

اس سلسلہ میں آزادی سے قبل کا ایک سچّا واقعہ قابل ذکر ہے۔

ایک حادثہ میں ایک ہندو عورت کا انتقال ہوگیا۔ مگر اس کی شناخت نہیں ہوسکی تھی۔ کسی نے پولیس انسپکٹر سے کہا کہ آپ فلاں پنڈت جی کو بلا کر پوچھئے شاید وہ کچھ آپ کی مدد کرسکیں۔ حادثہ میں شکار ہونے والی عورت پر پنڈت جی کی بہو ہونے کا شبہ ہورہا ہے۔ مگر اس ضعیف برہمن نے پولیس کو جواب دے کر عجیب کشمکش میں مبتلا کردیا۔ انہوں نے کہا کہ جب میں نے اپنی بہو کا چہرہ ہی نہیں دیکھا تو شناخت کا کیا سوال ہے؟

......☆......

جنت کا دروازہ

جب اس کی عمر اسّی سال سے تجاوز کرگئی اور موت کے قریب آنے لگا تو اپنے ان دو معصوم بیٹوں کی یادیں اس کے دل میں ایک ہوک سی پیدا کرنے لگیں جو پچاس سال قبل دو مہینے کے وقفہ سے اس کو داغِ مفارقت دے گئے تھے، اس نے ایک نہیں بلکہ دو نایاب ہیروں کو کھودیا تھا جو آج باحیات ہوتے تو ان کی عمریں پچاس سال سے تجاوز کرچکی ہوتیں۔ بڑا بیٹا انتقال کے وقت پانچ سال کا تھا اور ایک مانٹیسری اسکول میں زیر تعلیم تھا۔ چھوٹا بیٹا محض ایک سال کا معصوم بڑی چیچک کا لقمہ بن گیا۔ دونوں بیحد خوبصورت تھے۔ آج جب کہ وہ خود ضعیف ہو چکا تھا اپنے دونوں نورِ نظر کو یاد کرکے آبدیدہ ہوجاتا۔ پھر بھی اس نے بہت صبر کا مظاہرہ کیا۔ کیونکہ اس کی فطرت میں دین اور دینی پیغامات کا بڑا دخل تھا جن کو یاد کرکے وہ صبر کرلیتا۔ اللہ اور رسولؐ کا حکم اور سنّت پر چلنے کی کوشش کرنا اس کے ضمیر میں داخل تھا۔ اس نے پڑھا تھا کہ حضرت قرۃؓ کہتے ہیں کہ مسجد نبوی میں رسول اللہؐ نشست فرماتے تو کچھ لوگ آپؐ کے پاس آکر بیٹھ جاتے، ان میں سے ایک صاحب کا بچہ جو اکثر رسولؐ کی گود میں آکر بیٹھ جاتا تھا، انتقال کرگیا...... آپؐ نے بچہ کے باپ کو تسلّی دی اور فرمایا:

''بتاؤ تمھیں کیا پسند ہے کہ وہ تمہاری زندگی بھر جیتا رہتا یا یہ بات پسند ہے کہ وہ پہلے جائے اور جب تم جنّت کے دروازے پر پہنچو تو وہ تمہارا استقبال کرے اور جنّت کا دروازہ کھولے۔ اس شخص نے کہا اے اللہ کے رسولؐ مجھے یہی بات پسند ہے کہ وہ پہلے جائے اور میرے لئے جنّت کا دروازہ کھولے۔ آپؐ نے فرمایا تمہارے ساتھ ایسا ہی ہوگا''۔

دو مرحوم بچّوں کا باپ مطمئن ہوگیا کہ میرے یہی دونوں معصوم بچّے میرے لئے جنّت کا دروازہ کھولیں گے اور جنت میں داخل کریں گے۔ انشاءاللہ

......☆......

گانٹھ

گنّے میں جہاں گانٹھ ہوتی ہے وہاں رس نہیں ہوتا اور جہاں رس ہوتا ہے وہاں گانٹھ نہیں ہوتی۔ زندگی میں کسی نہ کسی دور میں گانٹھ سے واسطہ پڑتا ہے اور حکمت عملی کا تقاضہ یہ ہے کہ گانٹھوں سے بچ کر زندگی گزاری جائے وہی کمال ہے ورنہ جینے کے لئے تو جانور بھی جی لیتے ہیں۔ یہاں ایک حقیقت قابل غور ہے کہ زندگی کی گانٹھوں کا پہچاننا بھی سب کے بس کی بات نہیں ہے۔ کچھ ناسمجھ زندگی بھر گانٹھوں کو چوستے رہ جاتے ہیں، انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں وہ قدرت کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں کہ ہماری قسمت ہی خراب ہے۔ ان کی ساری محنت ضائع ہو جاتی ہے کیونکہ ایسے لوگ دانشمندی سے کام نہیں لیتے جیسے بنگالی لوک کہانی کے مطابق:

ملاّح رات بھر اپنی ناؤ کے پتوار کھیتا رہا، کیونکہ اسے ندی کے اس پار جانا تھا۔ کان پر ہاتھ رکھ کر وہ رات بھر لوک گیت گاتا رہا مگر جب صبح صادق کی ہلکی روشنی ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہ جہاں سے چلا تھا وہیں کھڑا ہے...... کیونکہ وہ اپنی ناؤ کا لنگر کھولنا بھول گیا تھا۔

......☆......

فرضی اِنکاؤنٹر

اتراکھنڈ کی راجدھانی دہرہ دون کے باشندہ ۲۲ سالہ ایم۔ بی۔ اے۔ کے طالب علم رنویر سنگھ پولیس کے ساتھ مڈبھیڑ میں مارا گیا تھا جو سی بی آئی کی غیر جانبدارانہ تحقیق کے بعد فرضی ثابت ہوا۔ یہ کیس حسب دستور سی بی آئی کو سونپا گیا تھا مگر اخباروں کے توسط سے خبر ملی کہ رنویر سنگھ کے آبائی وطن غازی آباد سے منتخب بی جے پی کے قومی صدر راجناتھ سنگھ نے اپنے حلقۂ انتخاب کے عوام کے جذبات اور خواہشات کے مدّنظر اتراکھنڈ کی بی جے پی کی حکومت کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اس کیس کی تحقیقات سی بی آئی کے ذریعہ کرائے۔ سی بی آئی نے اپنی ابتدائی تفتیش میں ہی اسے فرضی قرار دے دیا۔ راج ناتھ سنگھ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ایک بے گناہ کو انصاف دلانے میں اپنے اثر ورسوخ کا استعمال کیا جب کہ اتراکھنڈ میں ان کی ہی (بی جے پی) حکومت تھی اور وہاں پولیس فورس اسی حکومت کے تحت کام کر رہی تھی۔

بٹلہ ہاؤس دہلی میں مارے گئے عاطف اور محمد ساجد کا کیس اتراکھنڈ کے رنویر سنگھ کے فرضی انکاؤنٹر سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ بٹلہ ہاؤس کا وہ مکان L-18، جہاں دونوں نوجوانوں کا انکاؤنٹر ہوا تھا دہلی کے اوکھلا علاقہ میں آتا ہے۔ اس حلقۂ انتخاب سے کانگریس کے سندیپ دکشت ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوئے تھے، ان کے انتخاب میں اوکھلا کا اقلیتی طبقہ کا بھی بڑا اہم رول تھا۔ حسن اتفاق کہ مرکز میں بھی ان ہی کی (یو پی اے) کی حکومت تھی۔ لہٰذا سندیپ دکشت کی اخلاقی ذمہ داری تھی کہ وہ دہلی حکومت کی وزیر اعلیٰ شیلا دکشت پر اپنے حلقۂ انتخاب کے عوام کی خواہشات اور جذبات کے مدنظر دہلی حکومت کی وزیر اعلیٰ پر دباؤ ڈال کر بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کی تحقیقات سی بی آئی کے ذریعہ کرانے کا اعلان کراتے تاکہ اس انکاؤنٹر کی حقیقت واضح ہو جاتی اور بے گناہوں کو انصاف مل جاتا۔ مگر افسوس کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا اور آج تک عاطف اور ساجد کو انصاف نہیں مل سکا۔

......☆......

غالب کی کہانی

یومِ غالب کے موقع پر انجمن ترقی اُردو (دہلی) کے زیرِ اہتمام اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے تعاون سے منعقدہ تقریب میں ''سیّد شاہد مہدی صاحب کا قول، ''غالب اور دہلی کا آپس کا بہت گہرا رشتہ ہے'' بہت بامعنی اور بروقت ہے۔ موصوف کو غالب کی بین الاقوامی شہرت اور مقبولیت کا پوری طرح احساس ہے۔ جس کا انہوں نے اپنی پُر مغز تقریر میں اظہار کیا کہ دُنیا کی 28 بڑی زبانوں میں ان کی شاعری کا ترجمہ ہو چکا ہے...... دہلی اور غالب کا آپس میں گہرا رشتہ ہونے کے باوجود راجدھانی کی اکثریت غالب کے نام سے واقف نہیں ہے۔ آپ نئی دہلی یا نظام الدین ریلوے اسٹیشن پر کسی آٹو یا رِکشہ والے سے غالب اکیڈمی چلنے کے لئے کہیں تو ایک بار وہ آپ سے سوال کر سکتا ہے کہ صاحب یہ کہاں واقع ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ لکھنؤ کے چار باغ ریلوے اسٹیشن پر کسی بھی رکشہ یا آٹو رکشہ والے سے ''نرالا نگر'' چلنے کے لئے کہیں تو اس کو مزید کچھ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ہندی کے مقبول شاعر پنڈت سوریہ کانت ''نرالا'' کے نام سے نہ صرف ''نرالا نگر چوراہا'' ہے بلکہ ایک بہت بڑی آبادی نرالا نگر سے موسوم ہے۔ آج لکھنؤ کا ہر باشندہ خواہ وہ تعلیم یافتہ ہو یا ان پڑھ، ہندی کے مشہور شاعر ''نرالا'' کے نام سے واقف ہے، جس طرح مشہور مجاہد آزادی مختار احمد انصاری مرحوم کے نام سے موسوم دہلی کے انصاری روڈ اور انصاری نگر سے دہلی کی عوام واقف ہیں۔ مگر اُردو کے اس عظیم شاعر اسد اللہ خاں ''غالبؔ'' کے نام سے موسوم ''غالب روڈ'' اور ''غالب نگر'' محبانِ اُردو کی دیرینہ خواہش ہے۔ غالبؔ کی شاعری کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ان پڑھ رکشہ والا بھی اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی غالبؔ کے اس مشہور شعر کا استعمال ضرور کرتا ہے۔

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

دوہرا معیار

مسلمانوں میں تعلیمی عدم بیداری ہی دراصل مسلمانوں کے پسماندگی کی ذمہ دار ہے۔ تعلیم سے عدم دلچسپی درحقیقت اُمت کے زوال کا سبب ہے۔ معاشی طور پر خوشحال ہونے کے باوجود قوم نے اپنے بچوں کی تعلیم کی جانب دھیان نہیں دیا، جبکہ دوسری قوموں نے نامساعد حالات میں اپنی نئی نسل کی تعلیمی ترقی کے لئے سخت مشقت کی زندگی بسر کی۔ اس کی زندہ مثال بہار کے ضلع بیگوسرائے کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے رہنے والے کنہیا کمار کی تعلیمی زندگی ہے جس کے والد فالج زدہ ہونے کی وجہ سے بستر پر پڑے ہیں۔ ماں آنگن باڑی میں محض تین ہزار روپیہ ماہوار کی نوکری کررہی ہے۔ اسی تین ہزار روپے سے گھر کا خرچ، شوہر کا علاج اور بیٹے کنہیا کمار کی تعلیم کے اخراجات کسی طرح پوری کررہی تھیں۔ کنہیا کمار بہت ہی ذہین اور محنتی نوجوان ہے۔ بہار کے دُور دراز علاقہ سے تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے دہلی آنا، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں داخلہ لینا تعلیمی بیداری کی زندہ مثال ہے۔ کنہیا کمار نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بڑی مشقت کا سامنا کیا اور دہلی کے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔ اس نے یونیورسٹی یونین کے الیکشن میں یونین کے صدر کے عہدہ کے لئے چناؤ لڑا اور کامیاب ہوگیا۔ اس کے حریف آر ایس ایس کی طلبہ یونین اکھل بھارتی ودیارتھی پریشد (اے بی وی پی) کو شکست فاش ہوئی جو ہندوتو کا ترجمان تھا۔ کنہیا کمار بائیں بازو کا حمایتی تھا۔

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں ۹ رفروری ۲۰۱۶ء کو پارلیامنٹ پر دہشت گردانہ حملہ کے مجرم کشمیر کے افضل گرو کی برسی پر چند کشمیری طلباء نے پروگرام کیا۔ طلبا کے ہجوم میں کسی نے افضل گرو زندہ باد اور پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا جس کے پاداش میں یونین کے صدر کنہیا کمار، عمر خالد اور انربان بٹھاچاری کو وطن دشمن کے جرم میں گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جموں کشمیر میں بھارتی جنتا پارٹی نے محبوبہ مفتی کی پی ڈی پی کی صدر محبوبہ مفتی کے ساتھ ملی جلی حکومت کی تشکیل کی۔ محبوبہ مفتی صوبہ جموں وکشمیر کی پہلی خاتون وزیراعلیٰ بنیں جن کی وزارت میں بی جے پی کے ارکان کو بھی جگہ دی گئی۔ حلف برداری بڑی شان وشوکت سے ہوئی۔ جس میں شہید افضل گرو زندہ باد اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگے...... دہلی میں افضل گرو کی برسی منانے سے طالب علموں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیا گیا ان پر وطن دشمنی یعنی غدّاری کا مقدمہ درج ہوا اور کشمیر میں وہی افضل گرو شہید افضل گرو کی حیثیت سے یاد کئے گئے...... ہندوستانی عوام اس دوہرے معیار کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

......☆......

کھوٹا سکّہ

خاں صاحب بہت نرم دل انسان تھے، مگر مزاج میں خانصابیت تھی۔ مزاج کب تبدیل ہو جائے ان کو خود احساس نہیں ہوتا تھا۔ نرم دل ایسے کہ کسی کی پریشانی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہر طرح کی مدد کرنا اپنا فرض تصور کرتے تھے اور اگر کسی بات پر ناراض ہوئے تو کھڑے کھڑے عزت اُتار لیتے تھے۔ پچاس سالہ اکلوتے بیٹے کو جو ڈائریکٹر کے اعلیٰ عہدہ پر فائز تھا، غصہ میں جو منھ میں آیا کہہ جاتے تھے اور وہ سعادت مندی سے ہاتھ باندھے ان کی سخت باتوں کو برداشت کر جاتا تھا۔ اپنے والد کی فطرت سے واقف تھا۔ جب وہ ڈانٹ کھاتا تو اس کے سب بچّے سہمے ہوئے اپنے باپ کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے رہتے۔

خاں صاحب کی بیٹی داماد کو ان کی کوئی بات بُری لگی کہ انہوں نے قطع تعلق کرلیا، جبکہ خاں صاحب کی کوئی غلطی نہیں تھی مگر داماد صابر نے اپنی بیوی سکینہ سے کہہ دیا کہ اگر تم اپنے والد کے پاس گئی تو میں تین طلاق دے کر گھر واپس بھیج دوں گا۔ خاں صاحب کے بیٹے شمشیر نے ان کو سمجھایا کہ آپ پریشان نہ ہوں وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

''میں لکھنؤ جانا چاہتا ہوں'' خاں صاحب نے اپنی بیٹی داماد کے یہاں جانے کی خواہش ظاہر کی۔

''چلے جایئے گا ابھی صابر بھائی کا مزاج ٹھیک نہیں ہے، جب ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا تب آپ کا جانا مناسب ہوگا''۔ شمشیر نے اپنی سخت گیر والد کو سمجھانے کی کوشش کی مگر خاں صاحب جانے کے لئے بضد ہو گئے۔

''یہ لیجئے''...... شمشیر نے ایک کاغذ اپنے والد کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا ہے؟'' خاں صاحب نے ڈانٹ کر سخت لہجہ میں پوچھا۔

"یہ ہوائی جہاز کے ٹکٹ کی پرنٹ آؤٹ ہے۔ آپ پلین سے جائیں گے اس عمر میں آپ کا چھ گھنٹے ٹرین سے سفر کرنا مناسب نہیں ہے"۔ شمشیر نے کہا۔

خاں صاحب نے ہوائی جہاز کا ٹکٹ ہاتھ میں لے کر سوچا کہ بُرے وقت میں کھوٹا سکہ اور اپنا بیٹا ہی کام آتا ہے۔ داماد کبھی بیٹا نہیں بن سکتا۔

.......☆.......

احمد مشکور

کی دیگر تصانیف

۱۔ تاریخ الہری ہانس : قیمت : دوسو روپے

۲۔ امریکن مسلم (سفرنامہ) : قیمت : سو روپے

۳۔ بکھرے موتیوں کا ہار (افسانوی مجموعہ) : قیمت : سو روپے

۴۔ سوئے حرم (مکمل ارکانِ حج) : بلاہدیہ۔ فی سبیل اللہ

۵۔ सूऐ हरम (مکمل ارکانِ حج)
ہندی زبان میں : بلاہدیہ۔ فی سبیل اللہ

۶۔ ننھے جاسوس (بچوں کی ناول) : پچّیس روپے

۷۔ سونے کی لاش (ناول) : قیمت : بارہ آنے
(۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ دستیاب نہیں ہے)

۸۔ نئی شمع نئے پروانے :
(۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔ دستیاب نہیں ہے)

چائے کی دُکان

لکھنؤ کے لاٹوش روڈ پر (جسے اب گوتم بدھ مارگ کہتے ہیں) مشترکہ دینی ادارہ بنام ''مکتبہ دین وادب'' دو حصّوں میں منقسم ہوگیا۔ والی آسی نے امین آباد میں ''گلمرگ ہوٹل'' اور مسجد کے درمیان ایک دُکان لے لی اور دینی اور ادبی کتابوں کا ادارہ مکتبہ دین وادب قائم کرلیا۔ اُردو ادب میں والی آسی اپنی ایک انفرادی پہچان قائم کر چکے تھے۔ لہٰذا اُن کی دُکان مکتبہ دین وادب کا افتتاح بڑے تزک اور اہتمام سے ہوا، جس میں اُردو کی مانی جانی ہستیوں نے شرکت کی۔ اس مکتبہ کے قریب ایک شیعہ مسجد اور مسجد کے گیٹ کے پاس ایک چائے کی دُکان تھی۔

مکتبہ دین وادب کی افتتاحی تقریب میں شرکت کرنے والوں میں شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، ساجد صدیقی، عرفان صدیقی، عرفان لکھنوی، انجم ملیح آبادی، حفیظ نعمانی، عمر انصاری، عابد سہیل، دانش محل کے محمد نسیم، رئیس انصاری، تسنیم فاروقی، بشیر فاروقی، حیات وارثی کے علاوہ ڈاکٹر راج کمار بھی شامل تھے جنہوں نے والی آسی کی کتاب ''شہد'' پر اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کیا تھا۔ ہر شخص والی آسی کو مکتبہ دین وادب کی دُکان کی افتتاح پر مبارکباد پیش کر رہا تھا، نیک دُعاؤں سے نواز رہا تھا۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ جیسے جیسے مہمانوں میں اضافہ ہوتا چائے کے آرڈر میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے سیکڑوں کپ چائے آ گئی۔ شمس الرحمٰن فاروقی حالات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ چائے کی ایک چسکی لے کر انھوں نے والی آسی کو مخاطب کر کے فرمایا:

''والی...... تمہاری دُکان چلے یا نہ چلے مگر تمہاری وجہ سے اس چائے والے کی دُکان خوب چلے گی''۔

بلاشبہ جب تک والی آسی زندہ رہے، شاعر اور ادیبوں کا جمگھٹ لگا رہتا تھا اور چائے کا دور چلتا رہتا تھا۔ آج والی آسی مرحوم ہوگئے مگر چائے کی دُکان آج بھی چل رہی ہے۔

......☆......

بارہ لاکھ کا بل

کئی مہینے علاج کے بعد ڈاکٹروں نے جب ساجد کو کسی بڑے شہر کے اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا تو اس کے والد مسعود صاحب کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اُنہیں بڑی اُمید تھی کہ اُن کا بیٹا بہت جلد صحت یاب ہو جائے گا، مگر ان کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ وہ شکستہ دل سے ڈاکٹر سے مخاطب ہوئے۔

''ڈاکٹر صاحب۔ آپ ساجد کو کسی بڑے اسپتال میں لے جانے کے لئے کہہ رہے ہیں، جبکہ ہم اپنے گاؤں سے راجدھانی کے اس بڑے اسپتال میں علاج کرانے لائے تھے۔ خدا کے لئے کچھ کیجئے۔ یہ میرے بچے کی زندگی کا سوال ہے''۔

اسپتال کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ملہوترا نے بڑی نرمی سے مسعود صاحب کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''دیکھئے جناب۔ ہم نے اپنی پوری کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ اس لئے کہیں دوسرے بڑے شہر کے اسپتال میں علاج کرانے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ ہمارے یہاں بہت سی ایسی سہولیات نہیں ہیں جو دوسرے بڑے شہروں کے اسپتالوں میں دستیاب ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ ساجد ٹھیک ہو جائے گا''۔

''جیسا آپ کہیں ڈاکٹر صاحب''۔ مسعود صاحب نے جواب دیا۔ ''مجھے مجبوراً کرنا پڑے گا''۔

''اور ہاں......'' ڈاکٹر ملہوترا نے جاتے جاتے کہا۔

''مسٹر مسعود...... مریض کو لے جانے سے پہلے اسپتال کے بارہ لاکھ روپے اکاؤنٹ سیکشن میں جمع کر دیں''۔

''بارہ لاکھ روپے''......! مسعود صاحب نے حیرت سے کہا۔''ڈاکٹر صاحب۔ یہ بارہ لاکھ کس بات کے؟ میرا بیٹا تو آج بھی ویسا ہی ہے جیسا میں گاؤں سے لایا تھا''۔

''دیکھئے مسٹر۔ علاج پر جو خرچ ہوا ہے وہ تو آپ کو ادا کرنا ہی پڑے گا''۔

ساجد کو اسپتال سے ڈِسچارج کرالیا گیا۔ آج ملک کے تقریباً ہر بڑے اسپتال کا یہی منظر ہے۔ نامکمل علاج کر کے مریض کو بے سہارا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مریض ایک اسپتال سے دوسرے اسپتال کا چکر لگاتا رہتا ہے اور ہر اسپتال میں وہی کہانی دُہرائی جاتی ہے جو پہلے ظہور پذیر ہو چکی ہوتی ہے۔ علاج معالجہ جو ماضی میں خدمتِ خلق تصور کیا جاتا تھا تجارت کا پیشہ اختیار کر چکا ہے۔ گو کہ اس نیک پیشے میں داخل ہونے والے ہر طالب علم سے بلا لوث خدمتِ خلق کی قسم دلائی جاتی ہے۔ مگر عملی زندگی میں اس کے برعکس ہو رہا ہے۔ سرکاری اسپتالوں میں سہولیات کے فقدان کی وجہ سے تیماردار اپنے مریضوں کو لے کر پرائیویٹ اسپتالوں کی طرف رُجوع کرتا ہے جہاں غریب کا علاج تقریباً ناممکن ہے۔ ساجد کو ملک کے سب سے بڑے اسپتال میں داخل کر دیا گیا جہاں اس کے مرض کے ماہر ڈاکٹروں کی ایک ٹیم موجود تھی اور ناکارہ گردوں کی تبدیلی کا اعلیٰ پایہ کا انتظام تھا۔ علاج ہوتا رہا اور پیسہ پانی کی طرح بہتا رہا۔ مگر حالات میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ندیم جو ساجد کا دوست تھا، کئی مہینوں سے اس کی تیمارداری میں لگا ہوا تھا۔ ایک دن اس نے مسعود صاحب سے کہا۔

''چچا جان...... آپ اگر اجازت دیں تو میں چند دنوں کے لئے گھر ہو آؤں۔ والدہ تنہا ہیں اور والد صاحب ضعیف ہیں''۔

''ہاں ہاں۔ ضرور چلے جاؤ''۔ مسعود صاحب نے کہا۔''ویسے تمہارے والد کے کیا حال ہیں''۔

''اسّی سال کی عمر ہو گئی ہے۔ طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہیں۔ بلڈ پریشر اور شوگر کے بھی مریض ہیں''۔ ندیم نے مسعود صاحب کو اپنے والد کے بارے میں بتایا۔

''اللہ صحت دے''۔ مسعود صاحب نے کہا۔''ہم سب دُعا ہی کر سکتے ہیں''۔

''چچا جان۔ ساجد کے علاج پر جو اخراجات ہو رہے ہیں اسے دیکھ کر میری رُوح کانپ رہی ہے کہ خدانخواستہ مجھے اپنے والد کا علاج ان مہنگے اسپتالوں میں کرانا پڑا تو میں کیا کروں گا۔ کہاں سے اتنی بڑی رقم لاؤں گا''۔ ندیم نے بڑے مایوس بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ لوگ صاحبِ جائیداد ہیں، انتظام کر سکتے ہیں، مگر میں تو مفلس ہوں، میرے آگے پیچھے سوائے اللہ کی ذات کے کوئی نہیں ہے۔ وہی ہمارا حامی اور مالک ہے''۔

ندیم ریلوے اسٹیشن سے اپنے گاؤں کے لئے روانہ ہوا۔ اس کے گھر کے سامنے ایک مجمع سا لگا ہوا تھا جیسے کوئی بڑا حادثہ ہو گیا ہو۔ وہ گھبرایا ہوا مکان میں داخل ہوا اور اپنی ماں کو دیکھا جو اسے دیکھتے ہی اس سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگیں۔ ندیم کی نظر جب والد کے پلنگ پر پڑی تو اس کو سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا۔ مکان کے دالان میں ندیم کے والد کا جنازہ سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا، لوبان کی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

''امّی...... یہ کیا ہو گیا؟'' ندیم نے روتے ہوئے اپنی ماں سے دریافت کیا۔

''عشاء کی نماز کے بعد سوئے تو سوتے ہی رہ گئے۔ ہارٹ فیل ہو گیا''۔ امّی نے جواب دیا۔

ندیم نے سوچا بیشک جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا حامی اور مددگار صرف اللہ کی ذات ہوتی ہے۔

......☆......

افسانے

۱۔ خون کا رشتہ
۲۔ ایک خواب
۳۔ بھیگی بلّی
۴۔ عمر کا فرق
۵۔ آخری نصیحت
۶۔ احساس
۷۔ بیٹی
۸۔ کرشمہ
۹۔ آبائی مکان
۱۰۔ میر صاحب نے تیاری کی
۱۱۔ مادرِ مہربان
۱۲۔ میرے حصے میں ماں آئی
۱۳۔ دُشمن کی جائیداد
۱۴۔ ایمان کا سودہ
۱۵۔ لکھنؤ کی عید
۱۶۔ تار آیا ہے
۱۷۔ مہر فاطمی
۱۸۔ گھر بنانے میں
۱۹۔ جانور اور انسان
۲۰۔ ڈھابہ
۲۱۔ یتیم
۲۲۔ کلر بلائنڈ
۲۳۔ جنوبی ہند کا سفر
۲۴۔ میرا گاؤں

خون کا رشتہ

لندن میں مقیم نوشین کو جب اپنے اکلوتے چھوٹے بھائی نصرت کی بیماری کی تفصیل کا علم ہوا تو وہ بیحد پریشان ہوگئی۔ وہ جلد سے جلد ممبئی پہنچ کر اپنے بھائی کو اپنی نظروں سے دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ عجیب کشمکش کی کیفیت محسوس کر رہی تھی، نوکری سے طویل چھٹی کا انتظام کرنا۔ فیاض کے علاوہ اپنی امّی اور تینوں بچّوں کے بارے میں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس کے شوہر فیاض لندن کے ایک بین الاقوامی بینک میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ فیاض انتہائی شریف، نیک اور اعلیٰ کردار کی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی غیر معمولی شخصیت قابل تقلید تھی۔ بینک کا ہر ملازم ان کو عقیدت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ کسی نے کبھی بھی اُن کو غصّے میں یا ترش زبان استعمال کرتے نہیں دیکھا تھا۔ نرم گفتاری ان کی شخصیت کا ایک حصّہ تھی۔ ترش روی کو گناہ تصور کرتے تھے۔ بیوی بچّوں اور اپنی خوش دامن سے بہت نرمی سے گفتگو کرنے کے عادی تھے۔ نوشین نے فیصلہ کیا کہ آج فیاض سے نصرت کی بیماری کے سلسلہ میں گفتگو کرے گی۔

"آج بامبے سے فون آیا تھا۔ نصرت کی طبیعت بہت خراب ہے"۔ نوشین نے فیاض سے کہا۔

"یہ تو بہت بُری خبر ہے، اللہ خیر کرے۔ پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟" فیاض نے پوچھا۔

"میں جلد سے جلد اس کے پاس پہنچنا چاہتی ہوں۔ مگر" اتنا کہہ کر وہ رُک گئی۔

"مگر کیا؟" فیاض نے کہا "ایسے غیر معمولی حالات میں اگر مگر کی گنجائش نہیں ہے۔ بامبے جانے کی تیاری کرو"۔

"میرا مطلب تھا کہ تینوں بچّوں کے اسکول کھلے ہوئے ہیں، آپ کا بینک میں وقت پر پہنچنا اور امّی جان کو اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتی"۔ نوشین نے ایک ہی جملہ میں اپنی تشویش کا اظہار کر دیا۔

''کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی وجہ سے آپ پریشان ہو رہی ہیں۔ میں اپنے بینک وقت پر پہنچ جاؤں گا۔ جہاں تک اسکول کا تعلق ہے ماشاء اللہ ہمارا صابر اٹھارہ سال کا ہو چکا ہے۔ اور اس کو ڈرائیونگ لائیسنس بھی مل گیا ہے وہ اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں عامر اور طاہر کو ان کے اسکول ڈراپ کرے گا''۔ فیاض نے مسئلہ کا حل بتا دیا۔

''اور امی جان''؟ نوشین نے فیاض سے پوچھا۔

''امی جان کو تو آپ کے ساتھ جانا فطری بات ہے۔ ان کا اکلوتا بیٹا بیمار ہے اور وہ اس کو دیکھنے نہ جائیں یہ ناممکن ہے۔ آپ پیکنگ شروع کریں اور پہلی فلائٹ سے ممبئی کے لئے روانہ ہو جائیں''۔ فیاض نے کہا اور نوشین نے اسی وقت کویت میں اپنی بڑی بہن امبرین کو نصرت کی بیماری اور اپنی روانگی کی اطلاع دے دی۔ امبرین نے بیماری کی خبر سنتے ہی ممبئی جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اپنے شوہر اسلم کو پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ اس کے دونوں لڑکے بڑے تھے اور کویت میں جاب کر رہے تھے، لہٰذا اس نے نوشین کو اپنی روانگی کی اطلاع دے دی کہ میں ممبئی پہنچ رہی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں بہنوں کو اپنے بھائی سے جذباتی لگاؤ تھا جس کی بیماری کی اطلاع پر وہ پریشان ہو گئی تھیں۔

ممبئی کے شیواجی انٹرنیشنل ٹرمنل پر اتفاق سے لندن اور کویت کے جہاز نے بیک وقت لینڈ کیا۔ اپنا سامان لے کر نوشین اپنی ضعیف امی کو سہارا دیتی ہوئی جیسے ہی آگے بڑھی امبرین دوڑ کر آئی اور امی کی گلے سے لپٹ کر رونے لگی۔ نوشین نے اسے ڈھارس بندھائی کہ پریشان نہ ہو انشاء اللہ نصرت جلد صحت یاب ہو جائے گا۔ ماں کے ساتھ دونوں بہنیں نصرت کے فلیٹ پر جب پہنچیں تو نصرت، اس کی بیوی حلیمہ اور پانچ سالہ بیٹی وانیہ خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔ بیمار نصرت کو دیکھ کر ماں اور بہنوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، مگر نصرت نے ان سب کو دلاسا دیا۔

''امی...... آپ پریشان نہ ہوں۔ انشاء اللہ میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے''۔

"بھیّا ہم سب دن رات تمھاری صحت کے لئے دعائیں مانگ رہے ہیں"۔ دونوں بہنوں نے کہا۔

"باجی۔ یہ آپ لوگوں کی محبت ہے کہ آپ لوگ اتنی دُور سے آ گئیں۔ مجھے اطمینان ہوگیا"۔ نصرت بولے۔

"اب ہم آ گئے ہیں۔ ممبئ کے اچھے سے اچھے اسپتال کے ماہر ڈاکٹروں کا علاج کرائیں گے"۔ نوشین نے کہا۔

بہنوں کا بھائی سے قربت کا ہی نتیجہ تھا کہ اس کی علالت کی خبر ملتے ہی لندن اور کویت سے دونوں بہنیں ممبئ پہنچ گئیں۔

نوشین نے نصرت کو جس اسپتال میں علاج کے لئے داخل کیا وہ پانچ ستارہ ہوٹل کی مانند تھا۔ گراونڈ فلور پر ایک بہت بڑا مال تھا جہاں خریداروں اور تفریح کرنے والوں کی بھیڑ رہتی تھی۔ مال کے ایک بڑے کمرے کو عبادت گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ جس میں نماز پڑھنے کی جگہ مخصوص تھی۔ پہلی منزل سے چھ منزل تک ممبئ کا بہت ہی مشہور اسپتال تھا جس میں ملک کے ماہر ڈاکٹر مریضوں کا علاج کرتے تھے۔ نصرت ڈاکٹر ریڈی کے زیر علاج تھا جو اس کے مرض کے لئے پورے ملک میں شہرت رکھتے تھے۔ اسپتال کی دوسری منزل کے ایک پرائیویٹ کمرہ میں نصرت داخل تھے۔ رات میں دونوں بہنوں میں کوئی ایک رُک جاتی تھیں۔ امی نصرت کے فلیٹ میں حلیمہ کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ ہفتہ دس دن پر امی حلیمہ اور وانیہ کو لے کر نصرت کو دیکھنے آ جاتی تھیں۔ دونوں بہنیں جی جان سے اپنے چھوٹے بھائی نصرت کے علاج میں لگی ہوئی تھیں۔ پیسہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا کہ کسی طرح میرا بھائی صحت یاب ہو جائے۔ دونوں بہنیں نصرت سے بہت قربت رکھتی تھیں۔ اسی قربت کا نتیجہ تھا کہ پتہ ہی نہیں چلا کہ کیسے نصرت کے علاج میں پانچ مہینے گزر گئے، مگر نصرت کے صحت میں کوئی افاقہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ نوشین سے ڈاکٹر ریڈی نے مرض کی تفصیلات بتائیں اور کہا کہ اب چونکہ مرض پورے جسم میں داخل ہو چکا ہے لٰہذا صحت یاب ہونے کی ایک

فیصدی بھی اُمید نہیں ہے۔اس خبر نے پورے خاندان میں نا اُمیدی کی ایک ایسی لہر دوڑا دی کہ سب پریشان ہو گئے، ہر شخص نصرت کو ایک نظر دیکھنے کے لئے ممبئی پہنچنے لگا۔

''باجی آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے صحت اور زندگی عطا کرتا ہے''۔نصرت نے کہا۔نصرت کے اندر خود اعتمادگی کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔اس کو اپنے موذی مرض کا احساس ہو گیا تھا مگر اسے پروردگار پر پورا اعتماد اور توکل تھا کہ زندگی اور موت صرف اسی کے ہاتھ میں ہے،اس نے اپنی جان سے عزیز امی کو مخاطب ہو کر کہا۔

''امی......میرے لئے آپ صرف دُعا کریں۔اللہ نیک بندوں کی ضرور سنتا ہے''۔

''نصرت!''نوشین درمیان ہے میں بولیں''بھیا تم نا اُمید نہ ہو''......

''باجی......آپ کا احسان میں بھول نہیں سکتا۔فیاض بھائی اور اپنے تینوں بچوں کو چھوڑ کر آپ مہینوں سے میری تیمارداری کر رہی ہیں''۔اتنا کہہ کر نصرت رونے لگے اور نوشین نے اپنے بھائی کو سینے سے لگا لیا جیسے ماں اپنے بچہ کو سینے سے لگا لیتی ہے۔وہ بھی رونے لگی۔خون کا رشتہ دُنیا کا سب سے عظیم رشتہ ہے جس کا کوئی متبادل نہیں ہے۔

پانچ مہینہ ملک کے سب سے اچھے اور مہنگے اسپتال میں علاج کے باوجود ایک دن نصرت سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔دونوں بہنوں نصرت کی بیوی حلیمہ اور معصوم بیٹی وانیہ کے علاوہ ضعیف ماں کی آنکھوں سے آنسو نہیں رُک رہے تھے۔اسّی سالہ امی کو اپنی جوان بیٹے کی موت کا انتہائی ملال تھا۔ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ انہیں اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اتنا بڑا غم دیکھنا پڑے گا۔لندن اور کویت اطلاع دے دی گئی۔فیاض اپنے تینوں بیٹوں کو لے کر نصرت کے جنازہ میں شریک ہونے کے لئے ممبئی پہنچ گئے۔ان پر اور اپنے بچوں پر نظر پڑتے ہی نوشین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''آپ صبر سے کام لیں''فیاض نے اپنی بیگم نوشین کو مخاطب ہو کر کہا''اللہ کی یہی مرضی

تھی“۔

”فیاض......میں نے نصرت کے علاج میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ہم دونوں بہنوں نے پانچ مہینے میں تقریباً پچاس لاکھ روپے خرچ کئے، مگر اسے بچا نہیں سکے“۔نوشین نے کہا۔

”آپ لوگوں نے اپنا فرض ادا کیا۔ مگر اللہ کی مرضی کے آگے سب بیکار ہے“۔ فیاض بولے۔

نصرت کی تجہیز و تدفین کے بعد فیاض بچوں کے ساتھ لندن واپس لوٹ گئے اور نوشین نے اپنی امّی، نصرت کی بیوی حلیمہ اور بیٹی وانیہ کو لے کر اپنے آبائی وطن آ گئیں۔ نصرت کی فیملی کے قیام کے علاوہ معصوم وانیہ کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ چونکہ حلیمہ کے والدین اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، بھائیوں نے پردیس میں گھر بنا لیا تھا، لہٰذا نوشین نے کرایہ کا دو کمروں کا ایک فلیٹ لے کر حلیمہ اور وانیہ کے گھر کو ہر سامان سے آراستہ کر دیا۔ وانیہ کا شہر کے سب سے اچھے اور معیاری اسکول میں داخلہ کرا دیا۔ حلیمہ کی گرہستی کے لئے ایک بڑی رقم دونوں بہنوں نے اپنے ذمہ اس طرح لے لیا کہ ایک مہینہ لندن سے تو دوسرے مہینہ کویت سے روپیہ آنے لگا۔ وانیہ کی اعلیٰ تعلیم اور شادی بیاہ کے لئے بھی بینک میں اکاؤنٹ کھول دیا گیا۔ قربت ایک ایسا جذبہ ہے جس کے تحت دونوں بہنیں اپنی اولاد سے زیادہ عزیز مرحوم بھائی کی بیوی بچی کے لئے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو گئیں۔ جوان بیٹے کی بے وقت موت سے امی جان ٹوٹ سی گئی تھیں۔ لہٰذا نوشین کے ساتھ لندن واپس چلی گئیں۔

لندن پہنچ کر بھی نوشین کو سکون نہیں ملا، وہ اپنے بھائی کی موت کو یاد کر کے کہا کرتیں کہ میرا ایک بازو کٹ گیا۔ دراصل بہنیں اپنے بھائی پر جان نچھاور کرتی ہیں خواہ بھائی کا رویہ بہنوں کے ساتھ جیسا بھی رہا ہو۔

......☆......

ایک خواب

پوری دُنیا میں بھائی بہن کے رشتہ کو بہت مقدّس مانا گیا ہے۔ بھائی بہن کا رشتہ اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے۔ بھائی کی ذرا سی تکلیف پر بہن کا روتے روتے بُرا حال ہوجاتا ہے اور جب بہن پر کوئی پریشانی آتی ہے تو بھائی بے قرار ہوجاتا ہے۔ بچپن میں بھائی اور بہن آپس میں خوب لڑتے جھگڑتے ہیں پھر چند لمحوں بعد دونوں گھل مل جاتے ہیں۔ ایک طرح سے بھائی بہن کی لڑائیوں سے گھر میں رونق برقرار رہتی ہے۔ دراصل بچپن کی یہ معصوم لڑائیاں پیار ومحبّت کی علامت ہوتی ہیں۔ ہندو مذہب میں بھائی بہن کی محبّت کو ایک تہوار ''رکچھا بندھن'' کے طور پر منایا جاتا ہے۔ جب بہنیں اپنے بھائی کی کلائی پر محبت کا دھاگہ باندھتی ہیں اور بھائی اپنی بہن کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہے۔ فیض کو بھی اپنی پیاری بہن شبانہ سے بڑی محبت تھی، عمر میں چار سال چھوٹا تھا مگر بڑوں کی طرح اپنی بہن کے ساتھ سایہ کی طرح لگا رہتا تھا۔ شبانہ جیسے ہی پندرہ سال کی ہوئی، اس کی شادی کردی گئی۔ فیض اپنی بہن کی جدائی کو برداشت نہیں کر پا رہا تھا، اس کا روتے روتے بُرا حال تھا۔ نو سالہ بھائی کو ایسا لگا کہ اب وہ اپنی بہن کو دوبارہ نہیں دیکھ سکے گا۔ اس کے نوشہ بھائی نے اسے سمجھایا۔

''پریشان نہ ہو فیض۔ تم جب کہو گے میں تمہاری شبانہ باجی کو پہنچادوں گا''۔

''سچ......'' فیض کو جیسے یقین نہیں آیا۔

''ہاں...... میں سچ کہہ رہا ہوں''۔ یہ سن کر فیض کو بہت حد تک اطمینان ہوگیا کہ میری پیاری بہن میرے پاس آئے گی اور ہم پھر لڑائی جھگڑہ کریں گے۔

وقت تیزی سے گزرتا گیا۔ بیس سال کے جوان فیض کو جب معلوم ہوا کہ شبانہ باجی بہت بیمار ہیں تو وہ تڑپ گیا۔ پہلی ٹرین سے پیاری بہن کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی باجی ایک تخت پر پڑی ہوئی تھیں اور بیحد کمزور لگ رہی تھیں۔ ان کو دیکھتے ہی وہ آبدیدہ ہوگیا۔ روتے روتے اس نے اپنی

پیشانی کو تخت پر ایسا مارا جس کی وجہ سے اس کی پیشانی لہولہان ہوگئی۔ بوجھل دل سے پیشانی پر ایک کٹے کا داغ لے کر وہ باجی کے گھر سے واپس آ گیا۔

فیض نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ شادی ہوئی اور بیوی بچوں کو لے کر عرب چلا گیا، جہاں اسے بہت اچھی تنخواہ اور اعلیٰ عہدہ پر مقرر کیا گیا۔ بچے بڑے ہونے لگے جن کی ہندوستانی اسکول میں تعلیم ہورہی تھی اس کی بیوی نسرین بچوں کو لے کر چھٹیوں میں وطن آتی تو شبانہ باجی سے ملنا نہ بھولتی، اسے معلوم تھا کہ فیض اپنی بہن سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ وہ اکثر اپنے بچپن کے قصے سناتا تھا کہ ہم بھائی بہن اپنے والد کے باغ میں کیسے دوڑتے ہوئے جاتے تھے اور خوب باغ کے پھل کھاتے تھے۔ فیض کے دونوں بیٹوں نے این آر آئی کوٹے میں سافٹ ویئر انجینئرنگ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ فیض نے دونوں کو اپنی کمپنی میں نوکری پر لگوا دیا۔ وقت کا پہیا گردش کر رہا تھا۔ فیض کی عمر ڈھلنے لگی، سر اور داڑھی کے بال سفید ہوگئے۔ نسرین بھی اب وطن آنے کے بارے میں سوچنے لگی۔

''اگر ہم واپس چلیں تو بتایئے کہ ہم رہیں گے کہاں''؟ نسرین نے فیض سے پوچھا۔

''دیکھو نسرین جب تک ہم اپنا گھر نہیں بنالیتے باجی کے یہاں رہیں گے۔ اب وہ بھی تنہا ہوگئی ہیں''۔ فیض نے کہا۔

پروگرام کے تحت فیض اور نسرین باجی کے مکان میں آ گئے۔ باجی کا مکان دومنزلہ تھا اوپر کی منزل میں فیض اور نسرین رہنے لگے۔ باجی بالکل اکیلی رہ رہی تھیں۔ بھائی صاحب کا انتقال کافی عرصہ قبل ہو چکا تھا، اللہ نے ایک بیٹی دی تھی جو اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ دور کے کسی شہر میں رہتی تھی۔ نسرین نے ایک دن فیض سے کہا کہ ہماری آمد سے باجی خوش تو ہیں کہتی ہیں کہ تم لوگوں کے آنے سے گھر میں رونق آ گئی مگر پتہ نہیں کیوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ کسی کشمکش میں مبتلا ہیں۔

''نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ تمہارا وہم ہے۔ میں کسی دن باجی سے گفتگو کروں گا''۔

''باجی۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ آپ پریشان سی رہ رہی ہیں۔ ایسا کیوں''؟ فیض نے

ایک دن اپنی باجی سے پوچھا۔

''نہیں نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کو علم ہوگا کہ تمہارے نوشہ بھائی سرکاری ملازمت میں تھے، ان کے انتقال کے بعد مجھے فیملی پنشن ملتی ہے، اسی سے گزر بسر کرتی ہوں، خاص کر علاج پر بہت خرچ ہوتا ہے''۔

''اب آپ بالکل فکر نہ کریں۔ آپ ہمارے ساتھ رہیں گی تو آپ کے اپنے اخراجات نہیں ہوں گے''۔

''نہیں بھیا۔ میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ یہ میری فطرت کے خلاف ہے''۔ باجی نے کہا۔

''اس میں بوجھ بننے کا کیا سوال ہے۔ آپ میری طرف دیکھئے۔ میری پیشانی کا داغ آپ کی محبت کی نشانی ہے۔ بھلا ہم آپ کو اکیلا کیسے چھوڑ سکتے ہیں''۔ فیض نے باجی سے کہا۔

''بھیا...... یہ تمہاری محبت ہے۔ دراصل میرا ارادہ تھا کہ......'' اتنا کہہ کر باجی رُک گئیں۔

''کیا ارادہ تھا آپ کا باجی'' ...... فیض نے پوچھا۔

''کہ ہم اوپری منزل کو کرایہ پر اُٹھا کر اپنے اخراجات پورے کریں گے''۔ باجی نے دل کی بات کہی تو فیض کو ایک دھکّا سا لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا باجی وہی بچپن کی باجی ہیں جن سے ہم لڑا کرتے تھے۔ زمانہ کے حوادث سے لوگوں کی سوچ میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ باجی اسی سوچ کی شکار نظر آئیں۔ اس نے باجی سے کہا۔

''باجی...... جب تک ہم اپنے رہنے کا انتظام نہیں کر لیتے آپ ہمارے ساتھ رہیں''۔

''میں کسی کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی''۔ باجی نے کہا۔ تو فیض اور نسرین کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

فیض نے بڑی تیزی سے پلاٹ کی تلاش شروع کردی تاکہ جلد از جلد اپنا مکان بنوا کر شفٹ ہوجائیں۔ روزانہ کا دستور بن گیا کہ صبح ناشتہ کر کے گھر سے نکل جاتا اور شام تک واپس آتا۔

’’کوئی پلاٹ پسند آیا‘‘؟ ایک دن باجی نے فیض سے دریافت کیا۔

’’بلڈر نے پلاٹ تو کئی دِکھائے مگر مجھے ایک بڑا پلاٹ پسند آیا ہے جس کی قیمت دو کروڑ روپیہ ہے‘‘۔

’’دو کروڑ......‘‘ باجی نے حیرت سے پوچھا‘‘۔ بہت مہنگا ہے کیا خوبی ہے اس پلاٹ میں‘‘ باجی نے پوچھا۔

فیض نے پلاٹ کی رجسٹری تو کرالی مگر بعد میں پتہ چلا کہ بلڈر نے بہت بڑا دھوکہ دیا ہے۔ فرضی رجسٹری کرائی ہے۔ پلاٹ بک چکا ہے، لہٰذا اصلی مالک نے اس پر مکان بنوانا شروع کر دیا۔ فیض اور نسرین کے لئے یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا جھٹکا تھا۔ شہر میں اجنبی سمجھ کر فیض کے ساتھ بے ایمانی کی گئی۔ فیض نے اپنی پوری زندگی کا پس انداز کیا ہوا سرمایہ اس پلاٹ کی خرید پر سرف کر دیا تھا۔ انسان اپنی عقل کے مطابق بڑے بڑے منصوبے مرتب کرتا ہے مگر مشیت ایزدی کے آگے مجبور ہے۔ فیض کو اس بات کا انتہائی افسوس تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بچپن کے بعد عمر کے آخری حصہ میں بھائی بہن کو ایک ساتھ رہنے کا حسین موقع عنایت فرمایا تھا جسے باجی کی عجلت نے گنوا دیا۔ نا چاہتے ہوئے فیض کو باجی کا گھر چھوڑ کر جانا پڑا۔ باجی نے مکان کرائے پر اٹھا دیا۔

’’ارے اُٹھیئے...... کب تک پڑے سوتے رہیئے گا‘‘۔ شبنم نے اپنے شوہر خالد کو جگایا۔

’’معاف کرنا شبنم...... میں ایک بڑا عجیب خواب دیکھ رہا تھا۔ فیض اور نسرین......‘‘ خالد اتنا کہہ کر آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔

’’یہ فیض اور محترمہ نسرین کون صاحبہ ہیں۔ ناول پڑھ پڑھ کر دماغ ماؤف کر لیا ہے‘‘۔ شبنم نے کہا۔

’’اب تمہیں کیا بتاؤں۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو ناول کے سارے کردار مجھے خواب میں دکھائی دیتے ہیں۔ لاحول ولاقوۃ۔ میں باتھ روم جا رہا ہوں تم ناشتہ تیار کرو۔ مجھے آج کچہری کی دیر ہو گئی ہے‘‘۔ اتنا کہہ کر خالد نے کندھے پر تولیہ ڈالا اور غسل خانہ میں داخل ہو گیا۔

......☆......

بھیگی بلّی

وہ سعید رُوحیں جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اعلان پر لبیک کہا تھا، ان کو زندگی میں کبھی نہ کبھی حج اور عمرہ کی سعادت نصیب ہو جاتی ہے۔ ہماری جمیلہ خالہ کی رُوح نے بھی لبیک کہا تھا، لہٰذا ان کے حج کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ خالو پہلے ہی حج کر چکے تھے۔ دونوں بیٹے عرب کی نوکریوں میں حج اور عمرہ کے فرائض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ اب جمیلہ خالہ کے ساتھ محرم جانے والوں میں یہ ناچیز ہی بچا تھا، جس نے ابھی حج نہیں کیا تھا۔ دقّت یہ تھی کہ یہ سن کر ہی میری روح فنا ہو گئی کہ جمیلہ خالہ کو لے کر مجھے حج پر جانا ہے، میرے لئے خالو کا حکم سرکاری حکم سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ جمیلہ خالہ ماشاء اللہ تندرست تھیں، ان کو کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی، مگر ان کی حکم عدولی کرنا اپنی شامت کو دعوت دینے سے کم نہیں تھا۔ خالو جان کی اپنی کوئی انفرادی شخصیت نہیں تھی بلکہ وہ خالہ جان کے شوہر کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ خالہ جان کی سخت گیر فطرت نے خاندان کے کسی بھی فرد کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔ ان کا دبدبہ ہمیشہ قائم رہا۔

''ارے کمبخت امجد کو بلاؤ...... مجھے اس نے ابھی تک نہیں بتایا کہ حج پر کب جانا ہے''۔ خالہ نے فرمان جاری کیا۔

''خالہ جان...... میں آپ کے قریب ہی ہوں۔ حج کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں، آپ پریشان نہ ہوں''۔ امجد نے کہا۔

''ارے بیوقوف...... تیاری کہاں ہوئی ہے۔ میرا احرام تک تو ابھی آیا نہیں''۔ جمیلہ خالہ نے کہا۔

''خالہ جان۔ امجد نے ہنستے ہوئے کہا'' احرام مردوں کے لئے ہوتا ہے، عورتوں کا احرام ان کا وہی لباس ہے جو وہ روز پہنتی ہیں۔ اور پھر میری پیاری خالہ کا سفید شلوار جمپر اور سفید دوپٹہ کیا کسی احرام سے کم ہے''۔

''قاسم کہاں ہے اس کو بلاؤ''۔ جمیلہ نے اپنے بیٹے قاسم کو بلانے کا حکم دیا۔

''جی امی جان......'' قاسم نہایت مہذب طریقہ سے اپنی امی سے مخاطب ہوئے۔

''دیکھو...... عثمانی صاحب کا لڑکا منّو مکّہ میں کام کرتا ہے، اس کی امی نے کہا تھا کہ کچھ سامان لیتی جایئے گا......'' خالہ نے قاسم سے کہا۔

''امی جان...... آپ ان سب چکروں میں نہ پڑیئے۔ حج کی کتابیں پڑھئے اور وہاں کے ارکان کو یاد کیجئے۔ منّو وہاں آپ کے کیا کام آئے گا جبکہ امجد ساتھ جا رہے ہیں''۔ قاسم نے سمجھایا۔

''قاسم...... شکیل صاحب اور ظاہرہ جب حج کرنے گئے تھے تو منّو نے ان لوگوں کی بڑی خاطر کی تھی''۔ جمیلہ خانہ نے کہا۔

''کس طرح کی خاطر کی تھی امی جان''؟ قاسم نے امی سے پوچھا۔

''ارے وہ جب ملنے آتا تھا تو دُنیا بھر کا کھانے کا سامان لے کر آتا تھا''۔ خالہ نے جواب دیا۔

''آپ کو کھانے سے کیا مطلب؟...... آپ لوگ پرائیویٹ ٹور والوں کے ساتھ جا رہے ہیں جو بیڈ ٹی سے لے کر رات کے ڈِنر تک آپ کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہیں گے۔ میرے خاص ملاقاتی بھی ہیں''۔ قاسم نے سمجھایا۔

''میں یہ کچھ سننا نہیں چاہتی۔ منّو کی امی سے جا کر ملاقات کر لینا''۔ خالہ کا حکم صادر ہو گیا۔ اور جو دیں، مجھے لا کر دے دینا''۔

حج کی پوری تیاری ہو گئی۔ ویزا آ گیا۔ جہاز کا دن اور وقت کا بھی اعلان ہو گیا۔ اب ہمیں لکھنؤ ایئر پورٹ سے جدّہ جانا تھا۔ عازمین حج کے لئے ضروری ہے کہ وہ جہاز میں سوار ہونے سے قبل اگر غسل کر چکے ہوں تو عمرہ کی نیت کر کے احرام باندھ لیں۔ احرام دو سفید چادروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک چادر لُنگی کی طرح پہن لی جاتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ لنگی کی طرح گانٹھ نہیں باندھی جاتی بلکہ اس کے باندھنے کا طریقہ حج کی ٹریننگ کے دوران باندھ کر بتایا جاتا ہے، اس طرح باندھیں، اور

دوسری سفید چادر اوڑھ لیں مگر سر کھلا رکھیں۔ چپل ایسی پہنیں جس کے پہننے سے پیر کی دوہڈیاں چپل سے دکھائی دیں، لہٰذا اس کی سب سے مناسب ہوائی چپل ہے۔ کوئی ایسی چپل پہننے سے گریز کریں جس کے پہننے سے پورا پیر ڈھک جائے۔

''امجد۔ ارے او امجد۔ کہاں مر گیا کمبخت''۔ جمیلہ خالہ نے آواز لگائی تو میں بھاگا ہوا آیا۔

''جی خالہ جان......'' امجد نے کہا۔

''ارے تو کہاں غائب ہو گیا تھا۔ دیکھ...... تُو میرے قریب ہی رہا کر۔ سمجھا''۔ خالہ نے نصیحت کی۔

''جی خالہ جان...... آپ نے غسل کر لیا تھا''۔ امجد نے پوچھا۔

''ہاں...... میں نے تو گھر پر ہی غسل کر لیا تھا، تُو نے غسل کی جو نیّت بتائی تھی ویسے ہی کیا مگر اب مجھے کیا کرنا ہے...... بتا؟'' جمیلہ خالہ نے پوچھا۔

''اب آپ عمرہ کی نیت کر کے دو رکعت نماز پڑھ لیجئے اور دُعا کیجئے کہ اے اللہ میرے لئے آسان بنا''۔ امجد نے کہا۔

''ارے کمبخت۔ ابھی مکّہ آیا نہیں اور عمرہ کی تو نماز پڑھا رہا ہے''۔ جمیلہ خالہ نے امجد کی خیریت لی۔

''خالہ جان...... جدّہ سے مکّہ پہنچ کر ہم سب کو عمرہ کرنا ہے جس میں سات بار خانۂ کعبہ کا طواف، سات چکّر صفا اور مروہ کے چکّر اور پھر مطاف، جہاں طواف کیا جاتا ہے، دو رکعت نماز پڑھنی ہے''۔ امجد نے سمجھایا۔

''ارے کمبخت امجد۔ تُو تو حج کا ماسٹر ہو گیا ہے۔ مجھے اسی طرح بتاتے رہنا''۔ جمیلہ خالہ نے کہا۔

''جی اچھا......'' امجد نے جواب دیا اور خالہ جان کے اگلے انجانے حملے کے لئے تیار ہو گیا۔

''ہاں'' خالہ جان نے کچھ کہنا چاہا۔ ''ہاں میں یہ کہہ رہی تھی کہ ہوائی جہاز کی کھڑکی کے پاس ہی بٹھانا۔ مجھے آسمان سے اپنے شہر لکھنؤ کو دیکھنا ہے''۔

''اور اگر وہ کھڑکی والی سیٹ کسی دوسرے کی ہوئی تو؟'' امجد نے خالہ جان سے کہا۔

''میں یہ کچھ نہیں جانتی......'' خالہ جان خفا ہو گئیں''۔ وہ جہاں چاہے جائے مجھ سے

مطلب نہیں"۔

"خالہ جان...... بھلا آسمان سے آپ لکھنؤ کے مکانات کیسے دیکھیں گی"۔ امجد نے پوچھا۔

"چپ رہ۔ اگر اپنا مکان نہیں دِکھے گا۔ تو کیا بڑا امام باڑہ، چھوٹا امام باڑہ، شاہ نجف کا امام باڑہ، چار باغ ریلوے اسٹیشن، میڈیکل کالج اور اونچی اونچی عمارتیں تو دکھائی ہی دیں گی بیوقوف"۔ خالہ جان نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسی آپ کی مرضی"۔ امجد نے اپنی پیاری خالہ جان کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

اللہ اللہ کر کے ہم جدّہ ایئر پورٹ پر اُتر گئے۔ لکھنؤ میں لوڈ کیا ہوا سامان لیا اور ایئر کنڈیشن بس کے ذریعہ مکّہ مکرّمہ کے اس ہوٹل میں پہنچ گئے جہاں ہمارا پرائیویٹ ٹور آپریٹر شفیق مرزا نے انتظام کیا تھا۔ سامان رکھنے کے بعد سب سے پہلا کام حرم شریف پہنچ کر خانۂ کعبہ کا طواف کیا۔ خالہ جان کا ہاتھ پکڑے رہا کہ کہیں بھیڑ میں گم نہ ہو جائیں۔ طواف کے بعد صفا اور مروہ کے سات چکّر لگائے اور مطاف میں دو رکعت نماز پڑھ کر میں اپنے بال کٹوانے چلا گیا۔ بالوں کا حلق کرا کر لوٹا تو خالہ جان مجھے پہچان ہی نہیں سکیں۔ میں نے غسل کیا اور احرام اُتار کر اپنے روزمرہ کے کپڑے پہن لئے۔ ہم حج شروع ہونے سے سات دن قبل مکّہ مکرّمہ پہنچ گئے تھے، لہٰذا ہم قصر نماز پڑھ رہے تھے۔

"امجد...... منّو کی امی نے کچھ کھانے کا سامان دیا ہے اس کا پتہ لگا تا کہ اس کی چیزیں اس تک پہنچ جائیں...... ورنہ خراب ہو جائیں گی"۔ خالہ جان نے عثمانی صاحب کے لڑکے منّو کی تلاش کی ڈیوٹی لگا دی"۔ خالہ جان آپ نے بلاوجہ یہ سب لے لیا۔ یہاں صرف عبادت کیجئے۔ خانۂ کعبہ میں نمازیں پڑھیے۔ ایک لاکھ گنا ثواب ملتا ہے یہاں"۔ امجد نے خالہ جان کو سمجھایا۔

"بیٹا یہ تو ٹھیک کہہ رہا ہے مگر منّو کا سامان پہنچانا بھی تو ہماری اخلاقی ذمہ داری بنتی ہے"۔

خالہ جان بھی پُرانی عورتوں کی ناول کی گرویدہ رہ چکی تھیں۔ اے آر خاتون کی پانچ پانچ سو صفحات کی ناولیں پڑھ ڈالی تھیں۔ خالو جان ان کے آگے پانی بھرتے تھے۔

"منّو کو کئی بار فون ملایا پر مِلا نہیں۔ دو دن میرے اسی میں گزر گئے۔ طواف کرتا تو ثواب

ملتا۔ ہر طواف پر بیحد ثواب کا وعدہ ہے"۔ امجد نے خالہ جان کو سمجھانے کی کوشش کی مگر ان کے اوپر منّو سوار تھا۔ نہ طواف اچھا لگ رہا تھا نہ خانۂ کعبہ کا دیدار۔

مکّہ مکرّمہ پہنچنے کے پانچویں دن خالہ امی کا منو سے رابطہ قائم ہوگیا۔ انہوں نے منو سے میری بات کرادی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ خانۂ کعبہ کی طرف پشت کر کے آپ سڑک پر چلتے رہئے جب تک کہ فلائی اوور نہ آجائے۔ میں اس فلائی اوور کے نیچے ہی ملوں گا"۔ قہر درویش بر جان درویش، خالہ جان کی خوشنودی کے لئے خانۂ کعبہ کا طواف اور نمازیں چھوڑ کر منّو کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتا رہا، دو تین کلومیٹر کے بعد فلائی اوور آیا جس کے نیچے منّو ایک چھوٹی لڑکی کے ساتھ اپنی کار کے پاس کھڑا تھا۔ جب میں نے خالہ جان سے مل کر اپنا سامان لینے کی بات کہی تو وہ بولا۔

"آپ جس سڑک سے آئے ہیں اس پر حج کے زمانہ میں کار چلانا جرم ہے"۔

"تو پھر آپ ایسا کیجئے کہ گاڑی یہیں چھوڑ کر ہمارے ہوٹل میں خالہ جان سے ملاقات کر لیجئے جو آپ کے لئے بیحد پریشان ہیں"۔ امجد نے عثمانی کے لڑکے منّو سے کہا۔

"معاف کیجئے گا، میں گاڑی چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتا"۔ منّو نے کہا۔

"کیوں"؟ امجد نے پوچھا۔

"پولیس اُٹھا لے جائے گی"۔ منّو نے جواب دیا۔ امجد نے پوچھا۔

"تب آپ یہاں کیوں آئے؟...... آپ ہوٹل تک جا نہیں سکتے کہ اس سڑک پر گاڑی چلانا ممنوع ہے۔ گاڑی چھوڑ کر خالہ جان سے ملنے نہیں جا سکتے کہ آپ کی گاڑی پولیس اٹھا لے جائے گی تو پھر میرا اتنا قیمتی وقت کیوں ضائع کیا؟...... مجھے اس وقت خانۂ کعبہ میں ہونا چاہئے تھا اور میں سڑک پر کھڑا ہوں"۔

امجد کو اب غصّہ آنے لگا کہ اس کا بلاوجہ وقت برباد ہو رہا ہے۔ مکہ مکرمہ کا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہے۔ عبادت کی جگہ ہے۔

"بڑی اماں کو یہ سم کارڈ اور کوکا کولا کی بوتل دے دیجئے گا"۔ منّو نے کہا اور سامان دے کر چلا گیا۔

"خالہ جان...... آپ کا پیارا بیٹا ملا تھا نہ وہ آ سکتا تھا نہ ملاقات کر سکتا تھا۔ یہ سم کارڈ اور یہ کوکا کولا کی ایک بوتل اپنی پیاری بڑی اماں کے لئے دے گیا ہے"۔ امجد نے بتایا۔ "سم کارڈ کو میں نے چیک کیا زیرو بیلنس ہے یعنی اس میں ایک ریال بھی نہیں ہے اور کولڈ ڈرنک منی ٹرک پر لاد کر مفت بانٹا جا رہا ہے۔

"بڑا بیہودہ ہے...... اس کی ماں نے کچھ کھانے کا سامان دیا تھا کمبخت لے جاتا"۔ خالہ جان نے کہا۔

"خالہ جان...... اس سڑک پر کار چلانے کی اجازت نہیں ہے۔ اور اگر کار چھوڑ کر آتا تو اس کی کار کو پولیس والے اُٹھا لے جاتے۔ اس لئے وہ نہیں آ سکا"۔ امجد نے پوری بات سمجھا دی۔

"ارے تو وہ نہیں آ سکتا تو میں تو جا سکتی ہوں"۔ خالہ جان نے کہا۔

"کیا مطلب؟...... میں سمجھا نہیں آپ کی بات کو"۔ امجد کا موڈ خراب ہو گیا۔

"میں شفیق مرزا سے وہیل چیر منگوا کر اس کے کسی آدمی کے سہارے اوور برج تک چلی جاؤں گی"۔ خالہ جان کا اتنا کہنا تھا کہ امجد کا غصہ ساتویں آسمان پر چڑھ گیا۔

"خبردار جو آپ نے کسی کو بلایا، اگر کوئی آیا تو میں اس کی ٹانگ توڑ دوں گا۔ آپ کو ہوا کیا ہے؟ اپنے ہوش میں آیئے۔ آپ حج کرنے آئی ہیں اپنا اخلاق بنانے نہیں آئی ہیں۔ منّو کو بھول جایئے اور حرم شریف میں نمازیں پڑھیے، خانۂ خدا کو صرف دیکھنے کا ثواب ہے۔ آج پانچ دن گذر گئے بجائے حرم اور خانۂ کعبہ کے اس کمبخت منّو کی تلاش کی جا رہی ہے۔ آج کے بعد اگر آپ نے اس کا نام لیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہو گا۔ میں خالو جان نہیں ہوں جو آپ کی جوتیاں اُٹھاؤں گا۔ چلیے حرم شریف میرے ساتھ اور طواف کیجئے"۔ امجد نے ڈانٹا تو خالہ جان بھیگی بلّی بن گئیں۔

......☆......

عمر کا فرق

''بچپن سے سنتے سنتے بوڑھی ہوگئی کہ اللہ میاں جوڑا بنا کر پیدا کرتے ہیں''۔ سترّ سالہ ثریا بیگم نے اپنے بڑے بیٹے عبدالوحید سے کہا جو بہت ہی دیندار، ذہین اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔

''اماں...... آپ نے جو سنا تھا وہ سب پرانے زمانے کی پُرانی باتیں ہیں''۔ عبدالوحید نے جواب دیا۔

''ارے وحید تو کیا ہمارے بزرگوں نے ہمیں غلط تعلیم دی تھی''۔ اماں خفگی سے بولیں۔

''نہیں نہیں۔ ہم اپنے بزرگوں کو بھلا ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں''۔ وحید نے کہا۔

''تب پھر؟......'' اماں نے سوال کیا۔

''اماں...... وہ سب روایتی باتیں تھیں...... بہت سے لوگوں کی شادیاں نہیں ہوتیں''۔ عبدالوحید نے کہا۔

''جیسے...... کون سے لوگ ہیں جن کی شادیاں نہیں ہوتیں۔ میں بھی تو سنوں''۔ اماں نے پوچھا۔

''جیسے پاگل......'' وحید نے اپنی ضعیف مگر ذہین اماں کو سمجھایا۔ ''پاگل کی شادی نہیں ہوتی''۔

بات تو تُو صحیح کہہ رہا ہے۔ مگر ہمارے نبیؐ نے فرمایا ہے کہ نکاح میری سنّت ہے۔ اس کا کیا مطلب''۔ اماں نے پوچھا۔

''مطلب یہ ہے کہ اماں کہ عرب میں دولہے کو مہر کی رقم کا انتظام کرنا پڑتا ہے تب اس کو دولہن نصیب ہوتی ہے۔ ان میں کچھ مالی طور پر اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ مہر کی رقم نہ ہونے کی وجہ سے نکاح نہیں کر پاتے۔ ایسے لوگ زندگی بھر کنوارے رہ جاتے ہیں جو شرعاً جائز نہیں ہے۔ گناہ سے

بچنے کا واحد طریقہ نکاح ہے"۔ عبدالوحید نے کہا۔ "کمبخت بغیر مہر دیئے دلہن لے کر چلے جاتے اپنے یہاں"۔اماں نے کہا۔

"اور مزے کی بات ہے کہ اماں"۔ وحید نے کہا "مہر بھی ایسی طے کریں گے جس کو بعد میں دینے کا وعدہ ہوتا ہے جسے بہت سے لوگ ادا ہی نہیں کرتے"۔

"تو کمبخت وہ بدکاری کرتے ہیں"۔اماں کو غصہ آ گیا۔

"ارے ایسا نہ کہیئے"۔ عبدالوحید نے اپنی اماں کے غصّے کو ٹھنڈا کیا۔

"ارے تیرے باپ نے میرے مہر میں تو مکان ہی لکھ دیا تھا"۔اماں نے بتایا۔

"مجھے علم ہے۔میرے والد نے پوری زندگی تقویٰ والی زندگی گزاری تھی"۔وحید نے کہا۔

"بیٹا...... کچھ نسیمہ کے لئے سوچو"؟ اماں نے وحید سے اپنی نواسی کے بارے میں کہا۔

"اماں میں اس کی طرف سے غافل نہیں ہوں۔ مجھے خود رات بھر نیند نہیں آتی جب اس کا خیال آتا ہے"۔وحید نے اپنی اماں کو تسلی دی۔

"وحید...... اس کی عمر کی ساری لڑکیوں کی شادیاں ہوگئیں اور وہ بال بچّوں والی ہوگئیں مگر ہائے میری بچّی" کہہ کر اماں بے اختیار رونے لگیں۔اُن کی بوڑھی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور جسم تھر تھر کانپنے لگا، ایسا لگا جیسے ان پر ہارٹ اٹیک ہوگیا ہو۔وحید نے اپنی ضعیف اماں کو گود میں بھر لیا روتے ہوئے انہوں نے اماں کو صبر کی تلقین کی اور خدا پر بھروسہ رکھنے کے لئے کہتے رہے۔آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

دو بھائی اور دو بہنوں میں وحید سب سے بڑے تھے، لہٰذا اپنی ذمہ داریوں سے بھی خوب واقف تھے۔انتہائی نیک، ملنسار، صوم وصلوٰۃ کے سخت پابند، حلال حرام پر کڑی نظر رکھنے والے وحید نے کبھی بینک میں پیسہ جمع نہیں کیا کہ اس پر سود لگے گا اور سود اسلام میں ایسے ہی حرام ہے جیسے خنزیر کا گوشت۔سرکاری اسکول کے ٹیچر کی حیثیت سے نوکری کی ابتدا کی اور اب وہ اسی اسکول کے پرنسپل تھے۔بے پناہ صلاحیت کے مالک تھے۔کبھی تنخواہ پوری لے کر گھر نہیں آئے۔ بیوی اگر دریافت

کرتیں کہ اس بار کچھ کٹ کر تنخواہ ملی ہے تو صاف صاف بتا دیتے کہ میرے چپراسی کے گھر فاقہ کی نوبت ہے۔ اس غریب نے اپنی بیٹی کی شادی کے لئے کسی ساہوکار سے سود پر قرض لیا تھا جو ادا نہیں ہو رہا ہے، جبکہ جتنی رقم اس نے شادی کے لئے لی تھی اس سے کئی گنا زیادہ سود اُدا کر چکا مگر اس پر قرض ابھی بھی واجب الادا ہے۔ رضیہ! میں نے کچھ روپیہ اس کو دے دیئے کہ اس کے گھر چولہا جل سکے۔ اللہ کا نام لے کر اسی سے خرچ چلاؤ وہی برکت دینے والا ہے"۔

"بہتر کیا آپ نے...... ہم اگر اللہ کے کمزور بندوں کا خیال نہیں رکھیں گے تو جواب دہ ہوں گے"۔ رضیہ نے کہا جو خود ایک دیندار گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ قناعت پسندی کی تعلیم ان کے والدین نے کم عمری ہی میں دے دی تھی، پھر بھی انہوں نے سوال کر لیا کہ سود کے بارے میں اسلام کا کیا حکم ہے؟

"رضیہ" وحید نے اپنی بیوی کو بتایا "اسلام میں سود لینا اور دینا دونوں بہت بڑا گناہ ہے، خواہ وہ ڈاکخانہ کا ہو، بینک یا کسی ساہوکار کا ہو۔ قرآن اور حدیث میں ہے کہ سود کا سب سے ادنیٰ گناہ اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے کے مترادف ہے"۔

رضیہ نے برجستہ کہا "اللہ بچائے سود لینے اور دینے سے"۔

اماں کے دو بیٹے عبدالوحید اور عبدالرحیم کے علاوہ دو بیٹیاں کلثوم اور طاہرہ تھیں۔ والدین خوبصورت تھے، بچے بھی ماشاء اللہ شکل وصورت کے اچھے تھے۔ عبدالوحید کے والد عبداللہ صاحب پرائمری اسکول میں اُردو کے ماسٹر تھے۔ قلیل تنخواہ ملتی تھی۔ چار بچے اور خود میاں بیوی چھ فرد کا خرچ اسی قلیل تنخواہ سے پوری ہو جاتی تھی۔ عبداللہ صاحب نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ جو ضرورت ہوتی صرف اللہ سے مانگتے تھے۔ مدرسہ کی تعلیم سے مزاج میں قناعت پسندی خود بخود عود کر آئی تھی۔ دونوں لڑکوں کو اچھے اسکول میں تعلیم کا انتظام کیا اور دونوں بیٹیاں کلثوم اور طاہرہ کو پڑھنے کا شوق اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا۔ لہٰذا دونوں لڑکیوں کے اسکول میں ہائی اسکول اور ٹین پلس ٹو کی طالبہ تھیں، جن کو ان کی پرنسپل کے علاوہ طالبات بھی بیحد پسند کرتی تھیں۔ چھوٹی طاہرہ ذہانت کے

ساتھ انتہائی خوبصورت تھی۔لڑکیاں اس کی خوبصورتی پر رشک کرتی تھیں۔ایسا محسوس ہوتا تھا گویا چاند زمین پر اُتر آیا ہو۔عبداللہ صاحب کے پاس شہر کے ایک اچھے شریف النفس خاندان کے برسر روزگارلڑکا کا رشتہ چھوٹی بیٹی طاہرہ کے لئے آیا تو انہیں خوشی بھی ہوئی اور پریشانی بھی کہ بڑی بیٹی کلثوم کی موجودگی میں چھوٹی بیٹی کی کیسے شادی کردیں۔

''ابو......'' عبدالوحید نے اپنے والد سے کہا ''آج کے دور میں لڑکیوں کے لئے اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں۔سرفراز میرا کلاس فیلو رہ چکا ہے، میں اس کو اور اس کے خاندان سے واقف ہوں۔آپ یہ رشتہ منظور کرلیجئے''۔

''عبدالوحید......'' عبداللہ صاحب نے کہا۔''بڑی بیٹی کی موجودگی میں چھوٹی کی شادی کردینا کیا مناسب ہوگا''؟

''ابو......یہ سب پُرانی باتیں ہیں بھول جایئے۔کلثوم کو پڑھنے کا شوق ہے،اسے پڑھنے دیجئے۔مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں اُردو میں پی ایچ ڈی کروں گی''۔عبدالوحید نے کہا۔

طاہرہ کی شادی ہوگئی اور وہ اپنے سسرال چلی گئی۔سرفراز اُسے بیحد چاہتا تھا۔اچھی نوکری تھی، دونوں کی ازدواجی زندگی خوش وخرم گزرنے لگی۔کچھ دنوں بعد وہ لوگ امریکہ منتقل ہوگئے اور مستقل سکونت اختیار کرلی۔

پی ایچ ڈی کرتے ہی کلثوم کی شادی اسی کے یونیورسٹی کے اسی شعبہ کے ایک تعلیم یافتہ شریف خاندان کے لڑکے سے ہوگئی اور وہ اپنے سسرال چلی گئی۔کلثوم پہلے سال ہی ماں بننے والی تھی، لہٰذا پورے گھر میں خوشیاں منائی جانے لگیں۔ماجد بھی بیحد خوش تھے کہ ہم بہت جلد باپ بن جائیں گے۔اللہ اللہ کرکے وہ دن آیا جب گھر میں معصوم بچّہ کی آوازیں گونجنے لگیں۔مگر جب بچّی کے دائیں پیر پر نظر پڑی تو کچھ عورتیں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔بچی کے داہنے پیر کا پنجہ ٹیڑھا تھا۔ماجد نے کلثوم کو ڈھارس بندھائی اور اس بات کو ذہن نشین کرادیا کہ اللہ تعالیٰ کا اصول ہے کہ اگر انسان میں کوئی کمی دیتا ہے تو اس کے عوض اس کو کئی گنا اچھی عادات سے نواز دیتا ہے۔کلثوم کی

بیٹی بھی تعلیم میں بہت دلچسپی لیتی تھی۔ نسیمہ کو اپنی جسمانی خامی کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ بس اس کو اپنی ماں کی طرح اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ بی اے کرنے کے بعد اس نے ایم اے میں داخلہ لے لیا اور ریسرچ کے لئے اچھے موضوع کا ذہن میں انتخاب کرنے لگی۔ اس کے پیر کی خامی نے اس کی تعلیم میں کہیں رُکاوٹ نہیں ڈالی بلکہ وہ عام طالبات کے مقابلے بہتر طالبہ ثابت ہوئی۔ اس کا ہر مضمون میں اوّل آنا اس کی خوداعتمادگی کی دلیل تھی۔

نسیمہ بہت ہی پیاری لڑکی تھی۔ اس کے والد ماجد تو ایک لمحہ اس کو خود سے جُدا ہونے نہیں دیتے تھے۔ کہتے تھے وہ والدین خوش نصیب ہیں جن کی پہلی اولاد لڑکی ہو۔ دینی مزاج کے ماجد نے اپنی بیٹی کو دینی تعلیم کے بعد کانوینٹ اسکول سے داخل کردیا۔ ذہین ہونے کی وجہ سے اسے برابر اسکالرشپ ملتی رہی۔ ہر مضمون میں اوّل آنا معمول بن گیا تھا۔ کانوینٹ اسکول کے فادر اس سے بیحد خوش تھے اور اس کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ چند سالوں میں نسیمہ یونیورسٹی میں پہنچ گئی۔ اس کے لئے شادی کے رشتے آتے۔ مگر گھر والے یہ کہہ کر انکار کردیتے کہ لڑکی ابھی پڑھ رہی ہے۔ رفتہ رفتہ اس نے ریسرچ کر کے یونیورسٹی میں لیکچرر ہوگئی، مگر اس درمیان اس کی زندگی میں ایسا انقلاب آیا کہ سب کچھ تحس نحس ہوگیا۔ جب اس کے ابّو ماجد کا ایک حادثہ میں انتقال ہوگیا۔ کلثوم اور اس کی بیٹی نسیمہ کی زندگی میں گویا اندھیرا چھا گیا۔ چند منٹوں میں دُنیا ہی بدل گئی۔ ماجد کی جگہ پر کلثوم کو آفس میں نوکری تو مل گئی مگر نسیمہ کی عمر بڑھتی گئی اور شادی کے لئے رشتے آنے تقریباً بند ہوگئے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نسیمہ کی نانی اماں ثریا بیگم فکرمند تھیں۔ ہر شخص سے اپنی نواسی کی بات چلاتیں، اس کی خوبیاں بیان کرتیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی اب شادی کی عمر سے آگے بڑھنے لگی تو سب کی نیندیں اُڑنے لگیں۔

عبدالوحید نے اپنے اکلوتے بیٹے عبدالکلیم کو انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دہلی کی یونیورسٹی میں پڑھنے کے لئے بھیج دیا۔ عبدالکلیم اپنے والد عبدالوحید کی مانند بہت نیک فرماں بردار، شریف النفس اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ ان کو اس بات کا احساس تھا کہ ان کے والد

عبدالوحید نے چھوٹی سی نوکری سے ابتدا کی، پریشانیاں اُٹھائیں، اپنے ضعیف والدین کی بے مثال خدمات انجام دیں، بہنوں کی تعلیم اور طاہرہ کی شادی میں ہر طرح کی مدد کی۔ کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ سادی زندگی گزاری، دو جوڑے کپڑوں سے گزر بسر کی۔ تیس سال کی سرکاری نوکری میں کبھی گرم کوٹ نہیں سلوا سکے۔ بیرونی ملکوں سے غریبوں کے لئے امداد کے طور پر استعمالی کوٹ پچاس روپیہ میں خرید کر اپنے مخصوص درزی سے فٹ کرا لیتے تھے اور ہر ہفتہ ایک نیا کوٹ پہن کر اسکول جاتے تھے۔ عبدالکلیم کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس کے ابّو نے ایک چمڑے کے جوتے کو تقریباً دس سال تک اس طرح استعمال کیا کہ کبھی ہاف سول بدلواتے، کبھی پورا سول بدلواتے۔ ایڑی گھس جاتی تو کبھی ہاف ہیل بدلی جاتی تو کبھی پوری ہیل تبدیل کی جاتی۔ نتیجتاً دس سال میں صرف جوتے کا اُپر اصلی رہتا بقیہ سب تبدیل ہو جاتا۔ مگر عبدالوحید صاحب نے اپنے بیٹے کے لئے باٹا کمپنی کا سب سے مہنگا ایمبسڈر جوتا خریدا تو عبدالکلیم نے پوچھا۔

''ابّو...... میرے لئے اتنا مہنگا جوتا خریدنے کی کیا ضرورت تھی؟

''بیٹا...... تم انجینئرنگ کر رہے ہو تمہارے لئے ضروری ہے۔ زندگی میں کبھی احساسِ کمتری کا شکار نہ ہونا''۔ عبدالوحید صاحب نے کہا۔ احساسِ کمتری کا احساس انسان کو بزدل بنا دیتا ہے اور احساس برتری کا احساس انسان کے اندر تکبّر اور گھمنڈ کا احساس پیدا کرتا ہے، پھر انسان دوسرے کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ اسی لئے شریعت میں میانہ روی اختیار کرنے پر زور دیا گیا ہے تاکہ انسان غلط راستہ اختیار نہ کرے۔

انجینئرنگ کرنے کے بعد عبدالکلیم کو دبئی کی ایک بہت بڑی کمپنی میں نوکری مل گئی۔ عبدالوحید کے ساتھ خاندان کے سبھی لوگ بیحد خوش تھے۔ عبدالکلیم اپنی دادی ثریا بیگم کی دُعائیں لینے ان کے کمرے میں گیا۔ ضعیف دادی اماں نے اپنی کمزور آنکھوں سے اس کو دیکھا اور کمزور آواز میں لاکھوں دُعائیں دیں اور اپنے دل کی بات کہی کہ نسیمہ کا کیا ہوگا۔

''اماں...... آپ نسیمہ کے لئے پریشان ہیں۔ نسیمہ تعلیم یافتہ ہے۔ یونیورسٹی میں جاب

کر رہی ہے۔ خوبصورت اور خوب سیرت ہے۔ اس کے پیر میں ایک معمولی خامی سے اس کی زندگی برباد نہیں ہو سکتی"۔ عبدالوحید نے کہا اور سناٹا چھا گیا۔ اس وقت گھر کے سبھی افراد اکٹھا تھے جو عبدالکلیم کی کامیابی پر مبارکباد دینے آئے تھے۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ نسیمہ کی شادی عبدالکلیم سے ہوگی۔ عبدالکلیم تمہیں کوئی اعتراض ہے؟ عبدالوحید نے پوچھا۔

"ابّو ...... آپ کا حکم سر آنکھوں پر"۔ لائق اولاد کی طرح عبدالکلیم نے جواب دیا۔

"مگر نسیمہ۔ عبدالکلیم سے دو سال بڑی ہے"۔ خاندان کی ایک صاحبہ بولیں۔

"صرف دو سال بڑی ہے"۔ عبدالوحید نے کمرے میں موجود درجنوں مرد اور عورتوں کو مخاطب ہو کر کہا۔ "حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پہلی شادی چالیس سالہ بیوہ حضرت خدیجہؓ سے ہوئی جب کہ آپؐ کی عمر مبارک محض پچّیس سال تھی، گویا کہ آپؐ سے پندرہ سال بڑی تھیں"۔

عبدالکلیم نسیمہ سے شادی کر کے نبی کریمؐ کی ایک سنّت پر عمل پیرا ہو رہا ہے کہ اپنی عمر سے بڑی بیوی لا رہا ہے۔

"عبدالوحید نے سب کو مخاطب ہو کر کہا کہ اگر شادی بعد کسی حادثہ میں نسیمہ ایک پیر سے مفلوج ہو جاتی تو کیا ہم اسے چھوڑ دیتے۔ ہرگز نہیں۔ مجھے تو خوشی اس بات کی ہو رہی ہے کہ میری حقیقی بھانجی میری بہو بن کر آ رہی ہے۔ کلثوم تم میرے فیصلہ سے خوش ہو"؟

"خوشی سے میں پاگل ہو رہی ہوں بھائی جان"۔ کلثوم نے جواب دیا۔

"کل جمعہ ہے۔ عبدالکلیم کا نکاح نسیمہ سے مسجد میں ہوگا انشاء اللہ۔ کیوں کلیم"؟

"جیسی آپ کی مرضی ابّو ...... میری دبئی کی فلائٹ اگلے ہفتہ ہے"۔

......☆......

آخری نصیحت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ملک کی واحد یونیورسٹی ہے جس کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کے فارغ التحصیل طلباء اپنے نام کے ساتھ فخریہ لفظ ''علیگ'' کا استعمال کرتے ہیں۔ اس یونیورسٹی کے بانی سرسیّد احمد خاںؒ نے ۲۸؍جنوری ۱۸۷۷ء کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے نام سے اس تعلیمی ادارہ کو قائم کیا تھا جو ۱۴؍ستمبر ۱۹۲۰ء میں ایک قانون کے تحت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے منظور کی گئی۔ دُنیا کے کسی بھی ملک میں خدمات انجام دینے والے ڈاکٹر، انجینئر اور سائنس داں اپنے لقب 'علیگ' سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہندوستان کی آکسفورڈ کہی جانے والی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائز ہر سال ۱۷؍اکتوبر کو اپنی یونیورسٹی کے بانی کے یومِ پیدائش کو جشن کے طور پر ''سرسیّد ڈے'' کا اہتمام کرتے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن ملک اور بیرون ملک قائم ہے جو اس جشن کو بڑے تزک و اہتمام سے منعقد کرتی ہے۔ ہندوستان کی یہ واحد یونیورسٹی ہے جس کا اپنا ترانہ ہے جسے اسی درسگاہ کے ایک طالب علم اور مشہور و معروف شاعر جناب اسرار الحق مجازؔ لکھنوی نے تحریر کیا تھا:

ع یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
سرشارِ نگاہِ نرگس ہوں، پابستۂ گیسوئے سنبل ہوں

یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

ملک کے قومی ترانہ کی مانند یونیورسٹی کے اس غیر معمولی ترانہ کو ہر طالب علم بڑے ہی خوش الحانی سے گاتا ہے۔ اس بے مثال ترانہ کی لاجواب دُھن کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نامور میوزک ٹیچر جناب اشتیاق خاں صاحب نے ترتیب دی ہے۔ اشتیاق صاحب ۱۹۷۴ء میں فلمی دُنیا میں کام کی غرض سے بمبئی ہجرت کر گئے اور فلمی دُنیا کے مشہور فلمساز مظفر علی کی فلم ''امراؤ جان'' میں انہوں نے خان اشتیاق کے نام سے ایک نوابِ کا کردار ادا کیا۔ یونیورسٹی کا مذکورہ لاثانی ترانہ تقریباً یونیورسٹی

کے صدفی صد طالب علموں کو ذہن نشین ہے جسے وہ فرصت کے لمحات میں گنگنانا پسند کرتے ہیں۔
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہت بڑے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک فیکلٹی سے دوسرے فیکلٹی بغیر کسی سواری کے جانا مشکل ہے۔ تعلیم کے ہر شعبہ کے علاوہ یونیورسٹی کا اپنا جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج ہے۔ نادر و نایاب کتب کے علاوہ درسی کتابوں کے عظیم ذخیرہ پر مشتمل ''مولانا آزاد لائبریری'' موجود ہے۔ پرائمری تعلیم کے لئے یونیورسٹی کا ایس ٹی ایس ہائی اسکول ''منٹو سرکل'' اسکول ہے۔ جس کے فارغ طلباء یونیورسٹی میں بہ آسانی داخلہ حاصل کرلیتے ہیں۔ اُردو زبان و ادب پر مشتمل ''جامعہ اُردو'' کے کورس ہیں جہاں ابتدائی، ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل کی تعلیم کا خوبصورت اور معیاری نظام ہے۔ ''جامعہ اُردو'' کے کورس کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے علاوہ ہندوستان کی بیشتر یونیورسٹیوں نے تسلیم کرلیا ہے۔ جس کی بنیاد پر اعلیٰ تعلیم جاری رکھی جاسکتی ہے۔ جامعہ اُردو سے ادیب کامل کے بعد مسلم یونیورسٹی میں اُردو کی اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ ریسرچ اسکالر تک کیا جاسکتا ہے اور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کر کے کسی بھی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں بہ آسانی تقرری ہو جاتی ہے۔
گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر کی حیثیت سے ڈاکٹر اختر بستوی، ڈاکٹر احمر لاری اور ڈاکٹر افغان اللہ خاں نے اپنی خدمات انجام دیں۔ یہ سبھی حضرات جامعہ اُردو کے فارغ التحصیل تھے۔
ڈاکٹر اشفاق حسین صدیقی نے جامعہ اُردو کے توسط سے مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی، اور شبلی نیشنل ڈگری کالج اعظم گڑھ کے صدر شعبۂ اُردو ہوئے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کچھ ایسی کشش ہے کہ طالب علم کورس مکمل ہونے کے بعد بھی یونیورسٹی چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔ لہٰذا اپنی درسگاہ سے تعلق بنائے رہنے کے لئے کسی دیگر کورس میں داخلہ لے لیتا ہے۔

پُرانے وقتوں میں ڈبل ایم اے کا رواج عام تھا۔ یونیورسٹی کی تاریخ میں ایسے بھی واقعے درج ہیں کہ ایم ایس سی کرنے کے بعد یونانی کے بی یو ایم ایس کورس میں داخلہ لے لیتے تھے تاکہ یونیورسٹی کو الوداع نہ کہنا پڑے۔ یونیورسٹی کے کچھ طالب علم اتنے سینئر ہو چکے تھے کہ نئے طالب علم

انہیں لیکچرر یا پروفیسر تصور کرتے تھے۔لڑکوں کی یونیورسٹی کے علاوہ کشش کا مرکز شمشاد مارکیٹ اور اس کے ڈھابہ نما چائے خانے تھے۔سڑک کے کنارے آباد چائے کے ہوٹل طالب علموں کی جاذبیت کے مرکز تھے جہاں ہر طالب علم بیٹھنا نہیں بھولتا تھا۔ان ہوٹلوں کے سامنے کھلے ماحول میں دس پندرہ کرسیاں بچھی رہتی تھیں۔لڑکوں کی آمد شروع ہوتی اور چائے کے آرڈر میں اضافہ ہوتا رہتا۔چائے کی عادت نے ایک نشہ کی صورت اختیار کرلی تھی۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ایک بہت قدیم روایت چلی آرہی ہے کہ جب کوئی طالب علم چھٹیوں میں اپنے وطن جاتا تو اس کو ریلوے اسٹیشن تک پہنچانے والے دس پندرہ لڑکے ضرور ہوتے ہیں۔وطن جانے والے طالب علم کو سب کے لئے چائے پلانا فرض ہوتا ہے جسے وہ ''سی آف ٹی'' کہتے ہیں۔

ضیاء الدین بھائی بھی ایسے ہی طالب علم تھے جن کو خود یاد نہیں تھا کہ وہ لکھنؤ سے کب علی گڑھ یونیورسٹی پڑھنے آئے تھے۔پری یونیورسٹی کورس (پی یوسی) سے اب تک یونیورسٹی کے تقریباً ہر کورس میں داخلہ لے چکے تھے۔ان کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ یونیورسٹی کے ہر طالب علم کی مدد کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے،خواہ وہ مالی مدد ہو یا تعلیمی مدد،خوش مزاج اور ہر دلعزیز ضیاء بھائی کسی کی مدد کرنے میں کبھی پیچھے نہیں رہتے تھے،ہمیشہ خوش رہنے والے ضیاء بھائی پوری یونیورسٹی میں مشہور اور مقبول شخصیت کے مالک تھے۔ان ہی تمام خوبیوں کی بنا پر یونیورسٹی کے لیکچرار اور پروفیسر صاحبان بھی ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ضیاء الدین احمد لکھنوی تہذیب وتمدن کی نمائندہ شخصیت تھے۔وضع داری،نفاست،شائستگی اور نازک مزاجی اُن کی شخصیت کا طرۂ امتیاز تھا۔

''ضیاء بھائی......آپ کی خواہش کے مطابق میں نے ایل ایل بی کرلیا،اب کیا علی گڑھ کچہری میں پریکٹس شروع کردوں''؟ بہار سے آئے ایک لڑکے عمران نے پوچھا۔

''ایل ایل ایم میں داخلہ لےلو اور داخلہ میں کوئی پریشانی ہو تو پھر تم مجھ سے آکر ملو''۔ضیاء بھائی نے عمران کو مشورہ دیا۔

''ضیاء بھائی ایل ایل ایم کے بعد پھر وہی وکالت......پھر ابھی سے کیوں نہ شروع

کردوں''۔عمران نے پوچھا۔

''ایل ایل ایم میں داخلہ لے کر منصفی کی تیاری کرو۔اس طرح تم کو یونیورسٹی اور کمرہ چھوڑنے کی ضرورت نہیں پڑے گی، تعلیم جاری رہے گی اور ایک دن تجھے جوڈیشیل مجسٹریٹ بننا ہے''۔سمجھ میں آیا، یا دوں ایک لمپٹ''۔ضیاء بھائی نے لکھنوی انداز میں ڈانٹا۔

''یہ تو آپ نے بڑی اچھی بات بتائی۔میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں جوڈیشیل سروس میں آسکتا ہوں''۔عمران نے شرمندہ ہو کر کہا۔

''آسکتا ہوں نہیں بیٹے...... سمجھو تم آگئے، میری دُعائیں تمہارے ساتھ ہیں''۔ضیاء بھائی نے کہا۔

''ضیاء بھائی...... ماں باپ تو ان پڑھ ہیں، یہاں آپ ہی ہمارے ماں باپ ہیں''۔ عمران نے عاجزی سے کہا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں متوسط طبقہ کے علاوہ غریب طبقہ کے طالب علموں کے لئے تعلیم کے دروازے کھلے رہتے تھے۔صاحب حیثیت گھرانے کے لڑکے ان غریب کمزور مگر ذہین طالب علموں کی مالی مدد کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے جو نہ اپنی فیس جمع کر سکتے تھے اور نہ کتابیں خرید سکتے تھے۔مالی مشکلات کبھی تعلیم میں مانع نہیں ہوتی تھی۔

ضیاء بھائی بحیثیت طالب علم بہت سینئر ہو چکے تھے۔ان کے کچھ ہم جماعت لڑکوں کی تعلیم کے دوران ہی شادیاں ہو گئیں اور وہ کئی بچوں کے باپ بن گئے۔ان میں سے کچھ ایسے بھی طالب علم تھے جو خود کسی مضمون میں ریسرچ کر رہے تھے اور ان کے بچّے یونیورسٹی کے پرائمری اسکول ''منٹو سرکل'' میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔یہ ریسرچ اسکالرس تھے جو ضیاء بھائی کی نصیحت پر عمل کر کے اپنا مستقبل سنوار رہے تھے، مگر ضیاء بھائی کے ساتھ ایک ستم ظریفی یہ تھی کہ انہوں نے شادی کی طرف کبھی دھیان ہی نہیں دیا۔ بزرگوں نے وقت پر شادی کا دباؤ ڈالا مگر وہ اپنی تعلیمی سرگرمیوں کی مشغولیت کا عذر پیش کر دیتے تھے۔ضیاء بھائی نے ریسرچ بھی نہیں کیا۔اس کی وجہ اس

دن معلوم ہوئی جب گورکھپور کے ایک طالب علم جاوید نے ضیاء بھائی سے ریسرچ کرنے کا مشورہ مانگا۔ضیاء بھائی نے برجستہ جاوید سے پوچھا۔

''بیٹا......لڑکا کھلا سکتے ہو، بازار سے سبزی اور گوشت لا سکتے ہو اور اپنے پروفیسر کے بچوں کو اسکول پہنچا سکتے ہو تو ضرور ریسرچ کرو''۔

''میں کچھ سمجھا نہیں ضیاء بھائی۔آپ کہنا کیا چاہتے ہیں''۔جاوید نے گھبرا کر پوچھا۔

''دیکھو۔آج کے ماحول میں ریسرچ کے لئے یہ ساری خوبیاں ہونا بھی ضروری ہیں''۔ ضیاء بھائی نے موجودہ ماحول کا ذکر کیا۔

''آپ نے پی ایچ ڈی کیوں نہیں؟'' جاوید نے دریافت کیا۔

''اماں۔تم بھی پورے گورکھپوریا ہو۔جس کا خود نہ کھانے کا ٹھکانا ہو نہ رہنے کا وہ بھلا دوسروں کے گھر کا انتظام کیسے کر سکتا ہے۔یہاں تو زندگی اس طرح گزر رہی ہے کہ کھانا امیر منزل میں تو سونا جیب ہال میں۔ریسرچ میرے بس کی بات نہیں تھی''۔ضیائی بھائی نے کہا۔

''اور اگر......'' جاوید نے کہا۔''میں یہ سب کرنے سے گریز کروں تو کیا ہوگا ضیاء بھائی''۔

''تو زندگی بھر ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہیں ملے گی۔میں نے یہاں ایک سے ایک قابل لڑکوں کے کیریئر برباد ہوتے دیکھے ہیں جن کو لیکچرر شپ سے محروم کر دیا گیا کہ وہ پروفیسر اور ان کی بیگم کی ہاں میں ہاں نہیں ملا سکتے تھے، مگر جنہوں نے چاپلوسی اور وفاداری کی حکمت عملی اپنائی، پڑھنے میں زیرو ہونے کے باوجود ان کو یونیورسٹی میں ترقی ملتی چلی گئی۔ایسے لوگوں کے لئے علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک کہاوت بہت مشہور ہو گئی تھی کہ اللہ مہربان تو گدھا پہلوان''۔

ضیاء بھائی نے بتایا''یونیورسٹی ہمیشہ گروپ بندی کا شکار رہی ہے جس کی وجہ سے کچھ اچھے طالب علموں کو نقصان اُٹھانا پڑا''۔مگر ہماری پہلی پسند ہوتی ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ مل جائے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔جاوید نے پوچھا۔

''دیکھو بیٹا۔متوسط مسلم گھرانے کے بچے دہلی یونیورسٹی یا جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں تعلیم

حاصل کرنے کے متحمل نہیں ہوتے ہیں۔اس کی دو اہم وجہیں بیان کی جاتی ہیں۔اوّل دہلی یونیورسٹی کے کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے یوپی اور بہار سے آئے بچوں کی رہائش اور تعلیمی اخراجات پورا کرنا مشکل ہوتا ہے۔دوئم ان یونیورسٹی کے کالجوں کی داخلہ کی کٹ آف لسٹ بہت اُونچائی پر بند ہوتی ہے۔مثلاً جس سال یوپی ایجوکیشن بورڈ سے %84 مارکس پانے والے طالب علم نے پورے صوبہ میں ٹاپ کیا تھا اسی سال سینٹ اسٹیفیسن کالج دہلی کی داخلہ کی کٹ آف لسٹ %90 پر بند ہوئی تھی۔لہٰذا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہی ایک ایسی درسگاہ ہے جہاں ہر امیر اور غریب تعلیم حاصل کر کے اپنا مستقبل سنوار سکتا ہے۔''ضیاء بھائی بہت جہاں دیدہ شخص تھے۔انہوں نے علی گڑھ جیسے چھوٹے شہر میں زندگی کا بیشتر حصہ گزارا تھا مگر پورے جہان کی خبر رکھتے تھے۔مردم شناس شخصیت کے مالک تھے۔ان کو اس بات کا احساس تھا کہ جاوید بہت ذہین، قابل اور محنتی طالب علم ہے۔اپنی فطرت سے مجبور وہ جاوید کی تعلیمی مدد کرنے کے خواہشمند تھے۔اتفاق سے پروفیسر زیدی نے ضیاء بھائی کو اپنی رہائش گاہ پر بلایا اور بتایا کہ انہیں اکنامکس پر ایک مقالہ پیش کرنا ہے۔آپ کی نظر میں کوئی ایسا طالب علم ہے جو اس سلسلہ میں میری مدد کر سکے۔ضیاء بھائی نے پروفیسر سے پوچھا۔

''آپ جاوید سے واقف ہیں جو اکنامکس میں ایم اے کر رہا ہے''۔

''ہاں...... ہاں۔وہ تو میرا بہت ہونہار اسٹوڈینٹ ہے۔کیوں''؟ زیدی صاحب نے پوچھا۔

''تب سمجھئے کہ آپ کا پیپر تیار ہو گیا''......ضیاء بھائی نے اپنے کمرے میں جاوید کو بلا کر پوری بات بتائی۔

''ضیاء بھائی......ایک طرح سے یہ ایک ریسرچ پیپر ہے۔مگر میں کروں گا، کیوں کہ آپ نے وعدہ کرلیا ہے اور آپ ہی ہم سب کے باپ ہیں''۔جاوید نے کہا۔

''بیٹا...... باپ ہی دُنیا کی وہ ہستی ہے جو اپنی اولاد کو ترقی یافتہ دیکھنا چاہتی ہے''۔ضیاء

بھائی نے کہا۔

''اور اولادیں بھی ایسی ایسی ہیں وہ بھی سن لو: ضعیف باپ سے جو بات تک نہیں کرتا۔ امیرِ شہر کو جھک جھک کر سلام کرتا ہے''۔

آڈیٹوریم طلباء اور استاد حضرات سے بھرا ہوا تھا۔ ضیاء بھائی جاوید کے ساتھ بیٹھے تھے۔ پروفیسر صاحبان بین الاقوامی شہرت یافتہ تاریخ کے پروفیسر ہارون رشید اور ان کی بیگم پروفیسر زہرہ رشید پہلی صف میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وائس چانسلر کی آمد پر سبھی شرکاء حضرات احتراماً کھڑے ہوگئے۔ کارروائی کے مطابق پروفیسر زیدی نے اپنا مقالہ پیش کرنا شروع کیا۔ مقالہ کی اہمیت اور افادیت کے مدِ نظر ہر شخص پروفیسر کی تحریر کو بغور سن رہا تھا۔ پروفیسر ہارون رشید نے اپنی بیگم پروفیسر زہرہ سے سرگوشی میں کہا۔

''کیا یہ پیپر اُن ہی کا لکھا ہوا ہے''؟

''اگر وہ خود پیش کر رہے ہیں تو یقیناً اُن ہی کا کہا جائے گا''۔ پروفیسر زہرہ نے آہستہ سے جواب دیا۔

پروگرام کے اختتام پر سب نے پروفیسر زیدی کو ان کے گراں قدر مقالہ پر مبارکباد دی جس میں وائس چانسلر بھی پیش پیش تھے۔ زیدی صاحب بیحد خوش نظر آرہے تھے۔ ضیاء بھائی مطمئن تھے۔

جاوید کو اکنامکس میں ریسرچ کا موقع مل گیا اور وہ پروفیسر زیدی کی نگرانی میں ریسرچ کرنے لگا۔ ضیاء بھائی نے اس سے کہا کہ اب تم کو پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر ہی جانا ہے۔

''ضیاء بھائی۔ اس کا مطلب ہے کہ مجھے علی گڑھ یونیورسٹی کی ڈنلپ روٹی اور بڑے کا گوشت کچھ دن اور کھانا پڑے گا''۔ جاوید نے کہا۔

''تم کو ریسرچ کے لئے اسکالرشپ ملے گی، ہاسٹل کے باہر اچھے سے اچھا کھانا کھا سکتے ہو مگر بیٹا اس ڈنلپ روٹی کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھو۔ ماضی میں اسے کھا کر آج پوری دُنیا میں

ڈاکٹر، انجینئر اور سائنس داں کام کر رہے ہیں۔ میں ذاتی طور پر ایک ایسے پروفیسر سے واقف ہوں جو گذشتہ چالیس سالوں سے امریکہ کی ''ہوائی یونیورسٹی'' میں پڑھا رہے ہیں۔ مگر جب وہ اپنے گاؤں سے آئے تھے تو سنا ہے کہ صرف گھر کا غلّہ لائے تھے روپیہ نہیں تھا''۔ ضیاء بھائی نے پرانے وقتوں کی یادگار واقعات کا ذکر کیا۔ ''اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہی امریکہ سے اب ہماری یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے آتے ہیں''۔

ضیاء الدین احمد کو یونیورسٹی انتظامیہ نے پبلک ریلیشن افسر کی حیثیت سے تقرر کر دیا مگر ضیاء بھائی نے شادی نہیں کی، اگر کوئی کہتا تو ہنس کر ٹال جاتے کہ یہ بچے میرے ہی بچے ہیں۔ ایک دن عمران مٹھائی کا ڈبہ لے کر ضیاء بھائی کے آفس پہنچا اور بتایا کہ آپ کی دُعا سے میں ایڈیشنل جوڈیشنل مجسٹریٹ ہو گیا۔ ضیاء بھائی بہت خوش ہوئے کہ تمہاری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ کہنے لگے۔

''میں سب کو نصیحت کرتا ہوں جس نے اس پر عمل کیا وہ کامیاب ہوا''۔

جاوید کو پی ایچ ڈی ایوارڈ ہو گئی اور وہ بہت اچھی ملازمت کے سلسلہ میں دہلی چلا گیا۔ ضیاء بھائی اب تنہا رہ گئے۔ ساٹھ سال تک ملازمت پوری کر کے ایک دن اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن لکھنؤ واپس چلے گئے۔ بزرگوں کا سایہ اُٹھ چکا تھا، والدین کے انتقال کے بعد ایک بڑے بھائی بھی اچانک ہارٹ فیل کے شکار ہو گئے۔ ضیاء بھائی کی صحت تیزی سے گرنے لگی مگر کوئی نگہداشت کرنے والا نہیں تھا۔ آج ان کو بیوی کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ انتقال سے قبل ضیاء بھائی نے اپنی آخری نصیحت کی کہ انسان کو شادی ضرور کرنی چاہیے۔

بڑی خوبیوں کے مالک تھے ضیاء الدین احمد، جو اب اس دُنیا میں نہیں رہے۔

......☆......

احساس

صحافت کا پیشہ خطرات سے گھرا ہوا پیشہ ہے۔ جمہوریت کا یہ چوتھا ستون بھی جرائم پیشہ اور دہشت گردوں کے نشانے پر رہتا ہے۔ صحافیوں کو اکثر و بیشتر اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتے وقت جان تک گنوانی پڑتی ہے۔ گو کہ یہ بہت معزز پیشہ ہے جس کی قدر سیاست دانوں اور رؤسا کے دل میں ہوتی ہے، پھر بھی صحافیوں کو دھمکیاں دینا، انہیں اغوا کرنا اور کبھی کبھی قتل کرنا سماج کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ صحافی جو کچھ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے اسے دائرۂ تحریر میں لاتا ہے، یہ اس کی ذمہ داری بھی ہے اور اخلاقی فرض بھی۔ صحافیوں کو اکثر دھمکیوں اور حملوں سے تنگ آ کر شہر چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ جب صحافی دھمکیوں اور حملوں پر شور مچاتے ہیں تو عوام کہتی ہے کہ پورا ملک غیر محفوظ ہے۔ آپ سوچ سمجھ کر اس پیشے میں قدم رکھیں۔ یہ باتیں اخبار کے چیف ایڈیٹر عابدی صاحب نے نو وارد اور نوجوان صحافی دانش کے گوش گزار کیں۔

"سر! مجھے احساس ہے کہ میں ایک ایسے پیشے میں قدم رکھ رہا ہوں جو خطرات سے گھرا ہوا ہے مگر سر میں اسے بہت ہی باعزت پیشہ تصور کرتا ہوں"۔ دانش نے اپنے چیف سے کہا۔

"تمہارے خیالات بہت اچھے ہیں اور تم میں کام کرنے کا حوصلہ ہے، لہٰذا میں فی الحال اتر پردیش کے ایک شہر گونڈہ کا نامہ نگار اور انچارج بنا کر بھیج رہا ہوں"۔ عابدی صاحب نے دانش سے کہا۔

"بہت بہتر جناب۔ آپ مجھے ایک شہر کا انچارج بنا رہے ہیں یہ میری خوش قسمتی ہے"۔ دانش بولا۔

"تب پھر آپ دفتر سے ضروری احکامات، شناختی کارڈ، تقرری لیٹر حاصل کر لیں اور اپنا کام شروع کر دیں۔ ہماری تمام نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ آپ کو اپنے حفظ و امان

میں رکھے۔ میرے لائق جو بھی کام ہو آپ بلا تکلّف مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں''۔ عابدی صاحب نے نیک دُعاؤں کے ساتھ نوجوان دانش کو رخصت کیا۔

دانش بہت نیک اور شریف نوجوان تھا۔ گونڈہ کی عوام نے اس کا تہہ دل سے استقبال کیا۔ دانش کے لئے ہندی اخبار کے ایک نامہ نگار نے ریلوے کے ایک ملازم کے کمرہ میں مشترکہ طور پر رہائش کا انتظام کر دیا۔ شمیم صاحب کم گو اور شریف انسان تھے۔ انہوں نے دانش کا کھانے کا انتظام گونڈہ چوک پر بہرائچی کے ہوٹل میں کرا دیا۔ ہوٹل شہر کے قلب میں واقع تھا، لہٰذا ہر طرح کی سرگرمیاں ہوتی رہتی تھیں۔ دانش کو یہ شہر اس لئے بہت پسند آیا کہ نہ یہ بہت چھوٹا تھا اور نہ بہت بڑے شہر میں شمار کیا جاتا تھا۔ لوگ سیدھے اور ملنسار تھے، پردیسیوں کی بڑی عزت کرتے تھے اور ہر وقت خدمت کے لئے تیار رہتے تھے۔ شہر میں منعقد ہونے والی ادبی اور سماجی تقریبات کی خبریں دانش کے اخبار میں شائع ہونے لگیں۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ شہر اودھ کی تہذیب سے بہت متاثر ہے۔ نشست و برخاست اور اندازِ گفتگو میں اس شہر کی عوام اودھ کی راجدھانی لکھنؤ سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔ عادات و اطوار میں بھی اودھ سے کافی مشابہت ہے۔ بازارِ حسن کا زمانہ تو اختتام پذیر تھا مگر شعر و شاعری اور محدود مُجرا کا ابھی رواج قائم تھا۔ بہرائچی کے ہوٹل کے بغل میں حکیم علوی صاحب کا دواخانہ تھا جہاں روزانہ شام کو اُردو ادب کے مشہور و معروف شاعر حضرت جگر مراد آبادی تشریف لاتے اور گھنٹوں شعر و شاعری پر پُر مغز گفتگو ہوتی تھی، جگر مراد آبادی کی غزلیں دانش کے نصابی کتابوں میں شامل تھیں۔ لہٰذا وہ اس بات پر خوش تھا کہ وہ جگر کے شہر میں مقیم ہے۔

ایک دن ایک صاحب اس کے چھوٹے سے دفتر میں ملاقات کرنے آئے۔

''مجھے صابر حسین کہتے ہیں۔ میں یہاں تھوک اور ریٹیل جوتوں کا بیوپاری ہوں''۔ انہوں نے تعارف کرایا۔

''بڑی خوشی ہوئی جناب سے مل کر۔ میرے لائق کوئی خدمت''...... دانش نے اس تناظر میں دریافت کیا کہ کوئی بلاوجہ کسی صحافی سے ملاقات کرنے نہیں آتا۔

''دراصل کچھ دنوں سے میرے جوتوں کی پیٹیاں، جو آگرہ سے آتی ہیں، ریلوے کے کچھ ملازمین کی مدد سے توڑ کر مال غائب کردیا جاتا ہے یا کم موصول ہوتا ہے، میں بیحد پریشان ہوں''۔

''بھلا اس معاملہ میں، میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں، سوائے اس کے کہ ثبوتوں کی بنیاد پر اس چوری کی رپورٹ تیار کرکے اپنے اخبار کے ہیڈ کوارٹر کو بھیج دوں''۔ دانش نے کہا۔

''نہیں۔ قانونی کارروائی تو اب معمول بن گیا ہے جسے میرے ملازمین کرتے رہتے ہیں، میں آپ کی شہرت سے متاثر ہوکر اس مسئلہ کا کوئی حل معلوم کرنے آیا ہوں''۔ صابر جوتے والے نے کہا۔

''اگر آپ میرا مشورہ لینا چاہتے ہیں کہ آپ کے مال کی چوریاں رُک جائیں تو اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ آگرہ والوں کو حکم دے دیں کہ ایک نمبر کے جوتے کا دایاں پیر کا ایک پیٹی میں اور بایاں دوسری پیٹی میں بھیجیں۔ یہی اصول آپ لیڈیز سینڈل اور بچوں کے جوتوں کے لئے اپنائیں۔ انشاءاللہ چوریاں بند ہوجائیں گی''۔ دانش نے مشورہ دیا۔

''بہت اچھی تجویز ہے آپ کی۔ نام ہی کی طرح آپ بہت دانشمند بھی ہیں''۔ صابر جوتے والے نے کہا۔

''مجھے اس بات کا احساس تھا کہ اس سلسلہ میں آپ ضرور میری رہنمائی فرمائیں گے''۔

شہنشاہِ تغزل حضرت جگر مرادآبادی کی ذات اور ان کی شخصیت کی وجہ سے گونڈہ شہر کو بڑی اہمیت حاصل تھی جس کو صرف اہل ذوق حضرات ہی محسوس کرسکتے تھے۔ جگؔر صاحب کے ساتھ چند لمحے بیٹھنا بذاتِ خود بڑی سعادت کی بات تھی۔ دانش نے شہر کے مشہور حکیم علوی صاحب کے دواخانہ پر جگر مرادآبادی سے بارہا ملاقاتیں کیں۔ ان کی ذاتی زندگی اور شاعری پر سیر حاصل گفتگو کی۔ حضرت جگر مرادآبادی اپنے استاذِ محترم حضرت اصغر گونڈوی کا ذکر بڑی عقیدت سے کرتے تھے۔ دانش نے ان سے ایک طویل انٹرویو لیا جس میں جگر مرادآبادی نے اودھ کے اس شہر کی

خوبیوں اور خامیوں کا ذکر کیا۔ گونڈہ کے ادب نواز شرفاء مجرا کا اہتمام کرتے تھے۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب اختری بائی فیض آبادی فیض آباد کے نامور وکیل عباسی صاحب سے نکاح کر کے بیگم اختر کہلانے لگی تھیں۔ ان کے مطابق اس شہر کے امراء کے شجرہ میں کسی نہ کسی مقام پر اختری بائی فیض آبادی جیسی گلوکارہ اور حسین شخصیت کا دخل ناگزیر تھا۔ دانش نے اپنی طویل رپورٹ حضرت جگر مرادآبادی کے مفصل انٹرویو کے ساتھ اپنے اخبار کے چیف ایڈیٹر عابدی صاحب کو ارسال کر دیا۔ انٹرویو بیحد پسند کیا گیا اور اس کی اشاعت کے بعد حضرت جگر مرادآبادی پر سیمینار کا سلسلہ چل پڑا۔ عابدی صاحب نے دانش کی عمدہ رپورٹنگ اور کامیاب صحافتی زندگی کے مدِ نظر ترقی دے کر لکھنؤ آفس کا انچارج مقرر کیا اور گونڈے سے لکھنؤ تبادلہ کر دیا۔

نوابوں کے شہر اور اودھ کی راجدھانی میں داخل ہوتے ہی دانش کی نظر ایک بہت بڑے بورڈ پر پڑی جس پر تحریر تھا...... ''مسکرائیے کہ آپ لکھنؤ میں ہیں''۔ لکھنؤ شہر تہذیب کا گہوارہ ہے۔ آپ اور جی سے گفتگو کا عام رواج ہے۔ ''پہلے آپ'' یہاں کی تہذیب کا ایک بہت اہم حصہ ہے۔ یہاں کے یکہ وان اور تانگے والے بھی مہذب انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ لفظ ''تم'' کا استعمال ممنوع ہے۔

دانش کی پہلی پریس کانفرنس میں ودھان سبھا کے محکمہ معلومات سے منسلک سکینہ صاحب سے ملاقات ہوگئی، جنہوں نے اس کے رہائش کے لئے لال باغ میں ایک کمرہ کا انتظام کر دیا اور خورد و نوش کے لئے لال باغ کے سب سے مشہور ''سعید ہوٹل'' میں کرا دیا۔ سعید ہوٹل میں دونوں وقت بکرے کا قورمہ روٹی چاول اور دال کے علاوہ صلاد وغیرہ فراہم کیا جاتا تھا۔ سکینہ صاحب نے بتایا کہ وہ لکھنؤ کے قریب کے باشندہ ہیں۔ لہٰذا گذشتہ بیس سالوں سے سعید ہوٹل میں کھانا کھا رہے ہیں۔ اتوار کی چھٹیوں میں بیوی بچوں کے پاس چلے جاتے ہیں۔ رکن اسمبلی کے سرکاری رہائش گاہ ''دارالشفاء'' کے ایک کمرے میں رہتے ہیں۔

دانش کے لئے لکھنؤ میں کام کرنے کے بہت زیادہ مواقع حاصل ہوئے۔ روزانہ کہیں نہ

کہیں سیاسی یا ادبی جلسے منعقد ہوتے رہتے تھے۔ امین آباد کے گنگا پرشاد میموریل ہال کے علاوہ شہر کا مقبول ہال ''رویندرالیہ'' تھا جہاں آل انڈیا یا انڈو پاک مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ ہر زبان کے اخبار شائع ہوتے تھے جو ریاست بھر میں بیحد مقبول تھے۔ صحافت کا نہ کوئی اسکول تھا اور نہ کوئی دیگر ذریعہ، سوائے اس کے کہ عام طور پر نو آموز صحافی سینئر صحافیوں سے تجربات حاصل کرتے تھے۔ انگریزی خبروں کا اُردو اور ہندی میں ترجمہ کی مہارت سینئر صحافیوں کی نگرانی میں حاصل کی جاتی تھی۔ دانش نے مقامی بزرگ صحافیوں سے رابطہ قائم کر کے اپنے فن میں مہارت حاصل کر لی۔ اس کے اخبار کے چیف ایڈیٹر عابدی صاحب اس کے کام سے مطمئن اور خوش تھے۔ حکومت کی سرگرمیوں کے علاوہ شہر کی ادبی مشغولیات کی مکمل خبریں ان کو مل رہی تھیں۔

لکھنؤ کے دورانِ قیام دانش کی تاخیر سے شادی ہوگئی اور وہ دو خوبصورت بیٹوں کا باپ بھی بن گیا۔ وہ اپنی موجودہ پوزیشن سے بہت مطمئن تھا۔ سسرال کے احباب اور رشتہ دار وضعدار تھے۔ اس کو انسان کی ایک کمی کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔ کچھ لوگ خود اپنے علاوہ دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ ان کو ہر شخص میں صرف خامی ہی خامی دکھائی دیتی ہے۔ صحافی زندگی میں ایسے اشخاص سے اکثر و بیشتر واسطہ پڑتا ہے۔ اس کے مطابق ایسے لوگ احساسِ کمتری کے شکار ہوتے ہیں۔ ان کی فطرت اس مکھی سے مطابقت رکھتی ہے جو انسانی جسم کے چکنے حصہ کو چھوڑ کر زخموں پر بیٹھتی ہے۔ ایسے لوگ ایک ایسی مصنوعی دُنیا میں جیتے ہیں جس میں ان کے علاوہ سب حقیر نظر آتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو عیب جوئی کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں، دوسروں کے عیوب کو اعلانیہ بیان کرتے ہیں جبکہ وہ خود اس کے زیادہ گھنونے مرض کے شکار ہوتے ہیں۔ گویا کہ اپنی آنکھ کی شہتیر نظر نہیں آتی، دوسروں کی آنکھوں کا تنکا دکھائی دے جاتا ہے اور کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو دوسروں کی ترقی دیکھ کر حسد کی آگ میں جلتے ہیں۔ ایسے ہی تھے مرزا تحفظ حسین صاحب۔ جو بن بلائے مہمان کی طرح ایک دن دانش کے مکان پر حملہ آور ہو گئے۔

''بھئی معاف کیجئے گا دانش صاحب...... مجھے مرزا تحفظ حسین کہتے ہیں۔ تھوڑی بہت

شاعری کر لیتا ہوں۔ آپ کے اخبار کے لئے اپنا کچھ کلام لیتا آیا ہوں''۔

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ میری خدمات آپ کے لئے حاضر ہیں، ویسے لکھنؤ تو شہر ہی شعراء کا ہے''۔ دانش نے کہا۔

''ارے لاحول بھیجئے۔ شاعر کم ہیں بلکہ سب متشاعر ہیں۔ شاعری ان لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ میں خاندانی شاعر ہوں، میرے والد اور والد کے والد بھی عظیم شاعر تھے''۔

''بہتر ہے آپ اپنا کلام رکھ دیجئے۔ انشاء اللہ سنڈے میگزین کے ادبی حصہ میں اسے شان سے شائع کیا جائے گا''۔ دانش نے مرزا صاحب کو رخصت کیا۔

ہر شخص کی زندگی میں نشیب و فراز کا ہونا ایک قدرتی عمل ہے۔ اچھے اور سنہرے مستقبل کے حصول کے لئے لوگ اپنا ملک چھوڑ دیتے ہیں۔ آج مغربی ممالک میں لاکھوں کی تعداد میں ہندوستانی آباد ہیں اور باحیثیت زندگی گزار رہے ہیں۔ کیونکہ ان ممالک میں وسائل کی کمی نہیں ہے، زندگی کے ہر شعبہ کے ماہرین کی ان کو ضرورت ہے۔ اسی لئے وہ ترقی یافتہ ملک کہلاتے ہیں۔ دانش کی زندگی میں بھی ایک غیر معمولی تبدیلی واقع ہوئی۔ اس کو زندگی کے آخری دور میں جبکہ وہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر آزادانہ صحافت سے وابستگی کا خواہشمند تھا، اس کے اخبار کے انتظامیہ نے اس کو احمد آباد کا انچارج کے عہدہ پر مامور کر کے لکھنؤ سے تبادلہ کر دیا۔ احمد آباد صوبہ کا بہت ترقی یافتہ شہر تھا، جہاں صحافت کے میدان میں کام کرنے کے بہتر مواقع تھے۔ عوام محنت کش اور تجارت پیشہ تھی۔ گجرات پریس کلب کے ایک صحافی منوج بھائی پٹیل نے دانش کی رہائش کا نشاط افزا سوسائٹی میں انتظام کر دیا، جہاں مسلمانوں کے پچاس خاندان آباد تھے۔ دانش نے محسوس کیا کہ لکھنؤ کے مقابلے احمد آباد کا ماحول بہت حساس ہے۔ اکثر کسی نہ کسی علاقہ سے ہیجانی کیفیت کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ دانش نے پہلی بار اپنی بیوی عائشہ کو بہت محتاط رہنے کی تاکید کی۔ اپنے دونوں بیٹوں صابر اور عامر کو بلا ضرورت باہر جانے سے منع کر دیا۔ پندرہ سولہ سالہ لڑکوں کو اس عمر میں دُنیا کی اچھائی اور بُرائی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ دانش نے چھوٹے چھوٹے روزانہ ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات

کی خبریں اپنے اخبار کو ارسال کرنا شروع کر دیں مگر ایک دن جو ہوا دانش کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اچانک شہر میں ایک فرقہ کے پچاس بے گناہ انسانوں کو زندہ جلانے کی خبر پھیل گئی۔

فرقہ پرست دہشت گردوں کے ایک ہجوم نے جو بھالے تلوار اور پستول سے لیس تھے، اچانک نشاط افزا سوسائٹی پر حملہ کر دیا۔ مکانوں میں آگ لگا کر سامانوں کو لوٹ لیا۔ عورتوں بچوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ جوان لڑکیوں کی کھلے عام آبروریزی کی گئی اور ہزاروں مرد عورتوں کے علاوہ بچوں کا قتل عام ہوا اور ان سب کو بھڑکتی ہوئی آگ کے حوالہ کر دیا گیا۔ دانش کے دونوں بیٹے گھر سے باہر تھے، لہٰذا وہ اور عائشہ بدحواسی کے عالم میں اپنے بیٹوں کو لاشوں کے درمیان تلاش کرتے رہے۔ مگر صابر اور عامر نہیں ملے، ان کا کوئی پتہ نہ چلا۔ پوری سوسائٹی میں قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ جرائم پیشہ افراد انسانوں کو قتل کر رہے تھے اور اِملاک کو لوٹ رہے تھے۔ منوج بھائی پٹیل چھپتے ہوئے کسی طرح دانش اور عائشہ کو سوسائٹی سے نکال کر بحفاظت اپنے گھر لے گئے۔

''منوج میرے بیٹے کہاں ہیں؟......تم نے انہیں کہیں دیکھا''؟ دانش نے روتے ہوئے اپنے صحافی دوست کا ہاتھ پکڑ لیا اور گڑگڑانے لگا۔ عائشہ کا روتے روتے بُرا حال تھا۔

''دانش تمہارے دونوں بیٹوں کو بلوائیوں نے زندہ جلا دیا''۔ منوج بھائی پٹیل اتنا کہہ کر زار و قطار رونے لگے۔

منوج بھائی پٹیل کو روتے دیکھ کر دانش نے سوچا کہ رشتے خون سے نہیں احساس سے ہوتے ہیں۔ اگر احساس ہو تو اجنبی اپنے ہو جاتے ہیں اور اگر احساس نہ ہو تو اپنے اجنبی ہو جاتے ہیں۔ جس انسان کی سانس نکل جاتی ہے وہ مردہ قرار دے دیا جاتا ہے اور جس انسان سے احساس نکل جائے وہ انسان ہی نہیں رہتا۔

......☆......

بیٹی

دہلی کی ایک تعلیم یافتہ لڑکی نے اپنی پہلی اولاد، جولڑکی تھی اس چار ماہ کی دودھ پیتی معصوم بچی کا گلا دبا کر مار ڈالا۔لڑکی کیوں پیدا ہوئی، لڑکا کیوں نہیں؟ یہ خبر میں نے ستمبر ۲۰۱۶ء کے تقریباً سبھی اخباروں میں مع قاتل ماں کی تصویر کے ساتھ پڑھی۔خبر سے معلوم ہوا کہ قاتل ماں یونیورسٹی کی گریجویٹ تھی، اب قتل کے جرم میں جیل میں قید ہے۔اس خبر نے میرے اندر کے انسان کو جھنجھوڑ کررکھ دیا۔جبکہ ایسی خبریں اب سماج میں عام ہوگئی ہیں۔تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل اسلام نے لڑکی کی پیدائش کو رحمت قرار دیا اور پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دو لڑکیوں کی پرورش پر جنّت کی بشارت دی۔اس حقیقت سے سارا عالم واقف ہے کہ اسلام سے قبل عرب کے باشندے اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔اسلام دُنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے لڑکیوں کو عزت بخشی۔نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خوش قسمت ہیں وہ والدین جن کی پہلی اولاد لڑکی ہو۔

جیسے جیسے اسلام کا فروغ ہوا عربوں کی جہالت کا خاتمہ ہوا اور وہ تمام بُرے رسم ورواج ختم ہوگئے جن کی بُرائیوں سے عوام گردنوں تک ڈوبی ہوئی تھی۔رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھنے والے نومسلم اپنے ماضی کو یاد کر کے بے چین ہو جاتے تھے۔ایسے ہی اسلام قبول کرنے والے ایک صحابیؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اپنے ماضی کی غلطیوں کا اعتراف اس طرح کیا:

"میں اپنی بیٹی کو دفن کرنے قبرستان لے کر جا رہا تھا۔بچی نے میری اُنگلی پکڑ رکھی تھی۔اسے اپنے باپ کی اُنگلی پکڑے ہوئے خوشی ہو رہی تھی۔وہ سارا راستہ اپنی توتلی زبان سے مجھ سے طرح طرح کی فرمائشیں بھی کرتی رہی اور میں سارا راستہ اسے جھوٹی تسلّی سے اس کی ہر فرمائش پر بہلاتا رہا۔میں اسے لے کر قبرستان میں داخل ہوا اور اس کی قبر کے لئے ایک جگہ پسند کی۔میں زمین

پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے ریت مٹی اُٹھانے لگا۔ میری بیٹی نے مجھے کام کرتے دیکھا تو وہ بھی میرا ہاتھ بٹانے لگی۔ وہ اپنے ننھے ہاتھوں سے مٹی کھودنے لگی۔ ہم دونوں باپ بیٹی مل کر مٹی کھودتے رہے۔ اس دن میں بہت صاف کپڑے پہنے ہوا تھا۔ مٹی کھودنے کے دوران میرے کپڑوں میں مٹی لگ گئی۔ میری بیٹی نے کپڑوں پر مٹی دیکھی تو اس نے پہلے اپنے ہاتھ جھاڑے، پھر ہاتھوں کو اپنی قمیص سے صاف کیا اور میرے کپڑوں میں لگی مٹی کو صاف کرنے لگی۔

قبر تیار ہوئی تو میں نے اس کو قبر میں بیٹھایا اور اس پر مٹی ڈالنا شروع کر دیا۔ وہ بھی اپنے ننھے ہاتھوں سے اپنے اوپر مٹی ڈالنے لگی۔ وہ اپنے اوپر مٹی ڈالتی جاتی اور کھلکھلاتی ہوئے مجھ سے فرمائش بھی کرتی جاتی تھی، لیکن میں دل سے دل میں اپنے جھوٹے خداؤں سے دُعا کر رہا تھا کہ تم میری بیٹی کی قربانی قبول کرلو اور مجھے اگلے سال بیٹا دے دو۔ میں یہ دُعا کرتا رہا اور بیٹی مٹی میں دفن ہوتی رہی۔ میں نے جب آخر میں اس کے سر پر مٹی ڈالنا شروع کی تو اس نے سہمی ہوئی نظروں سے مجھ کو دیکھا اور توتلی زبان میں بولی:

''بابا...... میری جان آپ پر قربان...... آپ مجھے مٹی میں کیوں دفن کر رہے ہیں''؟

میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے اور تیزی سے قبر پر مٹی ڈالنی شروع کردی۔ میری بیٹی روتی رہی، چیختی رہی، دہائیاں دیتی رہی لیکن میں نے اسے قبر میں زندہ دفن کر دیا۔

اتنا کہہ کر وہ صحابیؓ ڈھاریں مار کر رونے لگے۔ ان کے آخری الفاظ پر رحمت اللعالمین نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ضبط جواب دے گیا۔ آپؐ کی ہچکیاں بندھ گئیں، داڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی اور آواز حلق مبارک میں پھنسنے لگی۔ وہ صحابیؓ بے اختیار رو رہے تھے اور رحمت اللعالمینؐ ہچکیاں لے رہے تھے۔ ان صحابیؓ نے نبی کریمؐ سے پوچھا۔

''اے اللہ کے رسولؐ...... کیا میرا یہ گناہ بھی معاف ہو جائے گا''۔ رحمت اللعالمینؐ آبدیدہ تھے۔ عرب کے ایسے ماحول میں آپؐ نے ان لوگوں کو دین اسلام کا پیغام سنایا اور قرآن اور سنّت پر چلنے کی تلقین کی۔ آج اسی تعلیم کا اثر ہے کہ عرب کے جاہل بدّو بدعت اور شرک سے دستبردار ہو گئے

اور تمام بُرے رسم ورواج کو خیر باد کہہ دیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان صحابیؓ سے ارشاد فرمایا:

''اسلام قبول کرنے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ پچھلے سارے گناہ معاف فرمادیتا ہے اور اسی طرح مبرور حج کی بھی یہی بشارت ہے کہ حاجی اپنے گذشتہ گناہوں سے ایسا پاک ہوجاتا ہے جیسے بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے''۔

ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ جس بیٹی کے شکم سے بیٹا تولد ہوتا ہے ناعقل لوگ اسی بیٹی کا قتل کررہے ہیں۔ کچھ اسٹرا ساؤنڈ مشینوں کے ذریعہ علم میں آنے کے بعد اس غریب بچی کو اس دُنیا میں آنے سے ہی روک دیا جاتا ہے اور کچھ معصوموں کا گلا دبا کر قتل کردیا جاتا ہے۔ نتیجتاً بیٹی اور بیٹے کے تناسب میں حیرت انگیز فرق آگیا ہے۔ ہندوستان کے صوبہ پنجاب اور ہریانہ میں ایک ہزار لڑکوں کے لئے محض سات سو اسّی لڑکیاں ہیں۔ اخباری خبروں کے مطابق دوسرے صوبوں سے لڑکیاں برآمد کی جارہی ہیں تاکہ ان کی نسل آگے چل سکے۔

مسلم معاشرہ بُرائیوں سے قطعی مبرّا ہے۔ پریشانی اگر ہے تو وہ غیر اسلامی رسم ورواج کی وجہ سے ہے۔ اسلام میں جہیز کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ جبکہ اپنے وطن عزیز میں بغیر جہیز کی شادی کا تصور نہیں ہے۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنی اولادوں کا نکاح مسجدوں میں کررہے ہیں، جس میں وہ دُنیاوی لہولعب سے محفوظ ہیں۔ لڑکے کے نکاح پر ولیمہ کی سنّت ادا کرتے ہیں۔

......☆......

کرشمہ

منظور کو کرائے کا جو مکان ملا وہ ایک راجہ کی کوٹھی کے بغل میں واقع تھا۔ راجہ محمود علی خاں لکھنؤ کے قریب ایک ریاست کے راجہ تھے اور صوبہ کی راجدھانی میں قانونی ضرورتوں کی وجہ سے ایک کوٹھی بنوا کر کیمپ آفس کی طرح رہتے تھے فصل کٹنے کے وقت اکثر چلے جاتے تھے، ورنہ ان کے منیجر سمیع احمد دیکھ بھال کرتے تھے۔ ساری باتیں اس پراپرٹی ڈیلر نے بتائی تھیں جس کے توسط سے ان کو راجہ صاحب کے بغل میں رہنے کا موقع ملا تھا۔ ایک روز راجہ صاحب کا ایک خادم منظور صاحب کے پاس آیا۔

''حضور راجہ صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے''۔

منظور کے لئے عجیب کیفیت تھی کہ ایک عام شہری کسی راجہ سے ملاقات کرنے جائے تو پروٹوکول کا بھی لحاظ رکھے۔ دل میں طرح طرح کے خیالات لئے وہ خادم کے ساتھ راجہ صاحب سے ملاقات کرنے چلے گئے۔

''آیئے بھائی منظور صاحب...... میں خود آپ سے ملنے آتا مگر مجبوری یہ ہے کہ مجھے پیدل چلنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ معاف کیجئے گا''۔ راجہ صاحب نے جس محبّت اور خلوص کا مظاہرہ کیا وہ منظور کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ تو اس بات کی توقع کر رہے تھے کہ پہلی ملاقات ہی میں راجہ صاحب شکایت کریں گے کہ آپ ملنے نہیں آئے۔

''ارے نہیں...... یہ میری ذرّہ نوازی ہے کہ آپ نے مجھے یاد کیا۔ میں تو اسے اپنی خوش قسمتی تصور کرتا ہوں''۔ منظور صاحب نے بہت ادب سے جواب دیا۔ منظور نے راجہ صاحب کی شخصیت کا بغور مطالعہ کیا، ساڑھے چھ فٹ کے لحیم شحیم شخصیت کے مالک راجہ محمود علی خاں بہت نیک، شریف اور وضع دار آدمی لگے۔ مہذب گفتگو میں اُنسیت اور محبت کی خوشبو بھی نظر آئی۔ منظور کے دل

سے راجہ کی ہیبت کا خوف دُور ہو گیا۔

''بھئی منظور صاحب...... آپ بلا تکلّف یہاں چلے آیا کیجئے گا۔ میں تنہا رہتا ہوں۔ رانی صاحبہ اللہ والی خاتون ہیں۔ لہٰذا ان کا سارا وقت عبادت میں گزر جاتا ہے''۔ راجہ صاحب نے بے تکلّفی سے کہا۔

''بہت بہتر''۔ کہہ کر منظور اپنے گھر واپس چلے گئے اور اپنی بیوی کو تاکید کی کہ وہ رانی صاحبہ سے جا کر ملاقات کر لیں جو بہت ہی دیندار خاتون ہیں۔ اُن سے مل کر ضرور خوشی ہوگی۔

راجہ صاحب منظور سے کافی بے تکلّف ہو گئے۔ دراصل ان کو ایک مصاحب کی ضرورت تھی جو ان کے ساتھ وقت گزارے، اُن کی ریاست کی داستان سنے اور منظور کو ریٹائرمنٹ کے بعد راجہ صاحب جیسے مخلص انسان کی صحبت درکار تھی، جس سے وہ اپنے دل کی بات کہہ سکیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ بہت حد تک دونوں میں بے تکلّفی ہو گئی، پھر بھی منظور بہت احتیاط سے گفتگو کرتے وقت اس بات کا لحاظ رکھتے کہ وہ ایک ریاست کے سابق راجہ سے محوِ گفتگو ہیں۔ راجہ صاحب بہت پُر تکلّف باتیں کرتے تھے۔ ہر موضوع پر بات کرنے کے عادی تھے۔

''منظور صاحب...... رمضان کا مہینہ آیا نہیں کہ ہر مدرسہ کے مولوی صاحبان اپنے چندہ کی رسیدیں لے کر حاضر ہو جاتے ہیں''۔ ایک دن راجہ صاحب نے منظور سے کہا۔

''جی بجا فرمایا آپ نے۔ دراصل رمضان کے مہینہ میں صاحبِ حیثیت اپنی آمدنی کی زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ مدرسے اسی زکوٰۃ کے پیسوں سے چلتے ہیں''۔ منظور نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے میاں۔ مگر جب دیکھو گیٹ پر چار مولوی صاحبان کھڑے ہیں''۔ راجہ صاحب بولے۔

''کچھ سوچ کر آپ سے امداد کی درخواست کرتے ہیں''۔ منظور نے کہا۔

''ارے...... لیکن ان میں آدھے تو کمبخت فراڈ ہوتے ہیں''۔ راجہ صاحب نے کہا تو منظور کو سوچنے پر مجبور ہونا پڑا کہ راجہ صاحب بھلے سابق راجہ ہوں مگر رعب داب ابھی وہی ہے جو پہلے

تھا۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور چھ فٹ کی خوبصورت شخصیت کی مالکہ رانی صاحبہ ہاتھ میں تسبیح لئے ہوئے داخل ہوئیں۔ ان کو دیکھتے ہی منظور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''بھائی صاحب...... بیٹھئے...... آپ ان کی باتوں کا بُرا نہ مانئے گا۔ میں آپ کے لئے چائے بھیجتی ہوں''۔ کہہ کر اندر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر میں ایک ملازمہ چائے کی ٹرے اور بسکٹ نمکین لے کر آئی اور ٹیبل پر رکھ کر چلی گئی۔ دوسری ملازمہ ایک ٹرے میں پانی سے بھرا گلاس لے کر کمرہ میں داخل ہوئی۔ منظور نے محسوس کیا کہ نوکروں کی پوری ٹیم خدمت میں کھڑی رہتی ہے۔ درجنوں مرد اور عورت ملازمین کی زندگی بسر ہو رہی تھی۔ اور کوٹھی میں رہنے والے تھے صرف دو فرد۔ راجہ صاحب کے ایک ہی بیٹے تھے جو لندن پڑھنے گئے تو لوٹ کر نہیں آئے۔

ایک دن منظور نے راجہ صاحب سے پوچھ ہی لیا کہ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اتنی بڑی ریاست جس کے مین گیٹ سے محل تک جانے کے لئے سواری کی ضرورت پڑتی ہو، شہر میں عام انسانوں کے درمیان یہ کوٹھی بنوانے کی کیا ضرورت تھی۔ راجہ صاحب نے جواب دیا۔

''دیکھو میاں منظور...... رجواڑے اور تعلّقداری کے خاتمہ کے بعد ہماری زمینیں سیلنگ کے دائرے میں آنے والی تھیں جن کو مختلف لوگوں کے نام کر کے کسی طرح بچالیا، مگر اب ان حرام زادوں سے مقدمہ لڑ رہا ہوں جن کو کبھی پیروں کے پاس بھی بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی''۔ راجہ صاحب نے بتایا۔

''کیا ان سب نے زمین ہڑپ لی یا قبضہ کر لیا''۔ منظور نے پوچھا۔

''ہاں...... ایسا ہی کچھ سمجھئے۔ مہینہ میں تیس دن ہوتے ہیں۔ میں پینتیس مقدمے لڑ رہا ہوں''۔ راجہ صاحب نے کہا۔

''اب سمجھ میں آیا کہ آپ کا راجدھانی میں رہنے کا مقصد کیا ہے، مگر راجہ صاحب! اتفاق سے اس وقت صوبہ کے وزیرِ اعلیٰ بھی ایک سابق راجہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ان سے ملئے''۔

منظور نے مشورہ دیا۔

"آپ کا اشارہ وزیر اعلیٰ وی پی سنگھ صاحب کی جانب ہے"۔ راجہ صاحب نے کہا۔

"جی ہاں...... میں اُن ہی کی بات کر رہا تھا"۔ منظور نے کہا۔

"تو سنئے...... وی پی سنگھ سے ملاقات کرنے جب میں گیا تو مین گیٹ سے آدھے کلومیٹر پر بنگلہ کا باہری برآمدہ تھا۔ برآمدے میں بیٹھے وی پی سنگھ کی نظر جب گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے مجھ پر پڑی تو وہ وہیں کھڑے ہو گئے۔ میں نے ان کے پاس پہنچ کر کہا۔ آپ کھڑے کیوں ہو گئے بڑا تکلف کیا آپ نے۔ انہوں نے برجستہ جواب دیا۔ ایک راجہ ہی دوسرے راجہ کے لئے کھڑا ہو سکتا ہے"۔ راجہ صاحب نے ملاقات کا قصہ سنایا۔ منظور نے پوچھا تو کام بنا۔ انہوں نے مدد کی راجہ صاحب آپ کی؟

"قانونی معاملوں میں ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اس لئے وہ کوئی مدد کرنے سے معذور تھے"۔ راجہ صاحب نے جواب دیا۔

"راجہ صاحب...... معاف کیجئے گا آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ میری گستاخی کو معاف کر دیجئے گا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ راجہ مہاراجہ کا پریوی پرس حکومت نے ختم کر دیا۔ اب کیا مراعات ملتی ہیں"۔ منظور نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی منظور میاں۔ اب ہم نام کے راجہ ہیں۔ مراعات کے نام پر ہمیں یہ خصوصی اختیار حاصل ہے کہ ہم تین ریوالور یا بندوق کا لائسنس رکھ سکتے ہیں۔ اس وقت ہمارے پاس نو اسلحوں کے لائسنس ہیں"۔ راجہ صاحب نے جواب دیا۔

داڑھی ٹوپی اور شیروانی میں ملبوس مشیر جب راجہ صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوا تو راجہ صاحب نے اسے بہت ڈانٹا۔ بُرا بھلا کہا اور وہ سر جھکائے سب کچھ سنتا رہا۔ زبان گنگ تھی اور راجہ صاحب کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں تھی۔

"ابے بولتا کیوں نہیں کہ تو اتنے دن کہاں رہا۔ مہینوں سے غائب ہے۔ یہ سوچا کہ یہاں

کام کیسے ہوگا"۔

"حضور معاف فرمادیں۔ میں کچھ گھریلو پریشانیوں میں پھنس گیا تھا"۔ مشیر نے جواب دیا۔

"ابے مشیر...... تجھے معلوم ہے نا کہ تیرے نہ رہنے سے یہاں سارے کام ٹھپ ہوجاتے ہیں۔ سمیع احمد کے بس کی بات نہیں کہ ہر طرح کا کام کر سکے"۔ راجہ نے اپنے مینجر کا حوالہ دیا۔

مشیر احمد راجہ صاحب کا معتمد خاص تھا۔ ریاست کے تمام کاموں کی دیکھ بھال کے علاوہ راجہ صاحب کو نیک مشورے بھی دیا کرتا تھا۔ راجہ صاحب کو مشیر پر بہت بھروسہ تھا، لہٰذا اس کی غیر حاضری سے پریشان تھے۔

"ٹھیک ہے...... سارے کام پورے کر ڈال...... روزانہ ایک نہ ایک تاریخ پڑ رہی ہے مقدمہ کی"۔ راجہ صاحب نے کہا۔

"بہت اچھا......" کہہ کر اپنا چمڑہ کا بیگ رکھ کر یہ کہتے ہوئے اندر چلا گیا کہ "رانی صاحبہ سے مل کر آتا ہوں"۔

چمڑے کے بڑے بیگ کو دیکھ کر راجہ صاحب کو تجسّس ہوا کہ مشیر اب دوا وغیرہ تو نہیں بیچنے لگا۔ لہٰذا انہوں نے اس بیگ کو کھولا۔ بیگ میں درجنوں مدرسوں کے چندے کی رسیدیں، مہریں اور ملک کے نامی گرامی دارالعلوم کے سفارشی خطوط رکھے ہوئے تھے۔ انہیں حیرت ہوئی کہ کب سے یہ مدرسوں کا کام کرنے لگا۔

رانی صاحبہ سے مل کر اور ضروری ہدایات لے کر جب وہ باہر آیا تو راجہ صاحب نے اس سے پوچھا۔

"ابے مشیر...... تیرے بیگ میں مدرسوں کے چندے کی رسیدیں کہاں سے آئیں"؟

"یہ بیگ میرے ایک ملنے والے کا ہے حضور...... بھلا مجھ سے مدرسہ کا کیا تعلق"؟ مشیر

نے جواب دیا۔

چند مہینوں کے بعد مشیر اچانک غائب ہو گیا۔ اس کے بیوی بچّے فاقہ کرنے لگے تو ایک روز راجہ صاحب نے ڈرائیور سے پُرانے لکھنؤ کے ایک محلّہ میں چلنے کا حکم دیا۔ جس تنگ گلی میں مشیر رہتا تھا وہاں گاڑی نہیں جا سکتی تھی۔ لہٰذا سڑک پر گاڑی چھوڑ کر راجہ صاحب ناک پر رومال رکھے بدبودار گلی میں داخل ہوئے اور مشیر کی بیوی سلمہ اور بچوں کو دلاسا دیا کہ کھانے کی پریشانی نہیں ہوگی۔ غلّہ آتا رہے گا۔ اس طرح کئی سال گزر گئے۔

مشیر کا کوئی پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں چلا گیا۔ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ بیوی بچے نا اُمید ہو گئے اور راجہ صاحب نے مشیر کی جگہ پر ایک خاص آدمی کو کام پر مقرر کر لیا، مگر مشیر کے بچوں کے لئے پورے مہینے کا کھانے کی اشیاء بھجواتے رہے تاکہ وہ فاقہ سے مرنے نہ پائیں۔ آخر کہ مشیر راجہ صاحب کا انتہائی وفادار ملازم رہ چکا تھا۔

ایک دن راجہ صاحب اپنے مقدمہ کے سلسلہ میں ہائی کورٹ کے ایک نامی گرامی وکیل سے ملنے اپنی گاڑی سے وزیر حسن روڈ میں داخل ہوئے تو دیکھا ایک بہت بڑی کوٹھی توڑی جا رہی ہے۔ انہوں نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ گاڑی سے اُتر کر انہوں نے اس کوٹھی کو بغور دیکھا جسے مشین سے توڑا جا رہا تھا۔ انہوں نے ٹھیکیدار کو اشارہ سے اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ یہ کس کی کوٹھی ہے اور کیوں توڑی جا رہی ہے؟ ٹھیکیدار نے راجہ صاحب کی لحیم شحیم شخصیت پر ایک نظر ڈالی اور ادب سے بولا۔

''حضور اس کوٹھی کو ایک نواب صاحب نے خرید لیا ہے، اسے زمین بوس کر کے اس زمین پر نئی کوٹھی تعمیر ہوگی''۔

''کون ہیں نواب صاحب''؟ راجہ صاحب نے پوچھا۔

''ابھی میں بلا کر لاتا ہوں۔ نواب صاحب کام کا معائنہ کرنے آئے ہوئے ہیں''۔ وہ نواب صاحب کو بلا لایا۔ راجہ صاحب کے سامنے مشیر کھڑا تھا جو کئی سال سے گھر سے غائب تھا اور

اس کے گھر کے اخراجات راجہ صاحب پورا کر رہے تھے۔

''ابے مشیروا''۔ راجہ صاحب نے جیسے کہا فوراً وہ اُن کو کنارے لے گیا تا کہ کام کرنے والے نہ سن سکیں۔

''حضور...... آپ کا خادم مشیر بمبئی اور بمبئی سے ایجنٹ کے ذریعہ عرب چلا گیا۔ ایک شیخ نے اپنے ذاتی خدمت کے لئے مجھے نوکر رکھ لیا''۔ مشیر نے مختصراً اپنا حال بیان کیا۔

''ابے تو نے اتنی دولت کمالی کہ وزیر حسن روڈ پر نئی کوٹھی بنوا رہا ہے۔ چوری کر کے تو نہیں بھاگا ہے عرب سے۔ بلاؤں پولیس کو...... ساری نوابی دھری رہ جائے گی''۔ راجہ صاحب نے دھمکایا۔

''نہیں حضور...... میں نے چوری نہیں کی ہے''۔ مشیر گڑ گڑانے لگا۔

''تو پھر مدرسوں کی ان رسیدوں کا کرشمہ تو نہیں ہے جو اپنے ساتھ سفارشی خط کے ساتھ لے گیا تھا''۔ راجہ صاحب نے پوچھا۔

اتنا سنتے ہی مشیر نے سر جھکا لیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔

......☆......

آبائی مکان

کال بیل پر اُنگلی رکھتے ہی معصوم کی نظر سوئچ بورڈ کے نیچے ایک اعلان پر پڑی جس کو دیکھتے ہی معصوم کے ہاتھ رُک گئے اور وہ اس اعلان کو چشمہ لگا کر بغور پڑھنے لگا جس پر لکھا تھا۔
''ایک ضروری اعلان: کال بیل استعمال کرنے کے بعد کم از کم دس یا پندرہ منٹ دروازہ کھلنے کا انتظار کریں''۔

کال بیل بجا کر وہ اطمینان سے کھڑا ہو گیا، ٹھیک پندرہ منٹ بعد دروازہ کھلا اور شکیل الرحمٰن صاحب برآمد ہوئے۔ دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے ڈرائنگ روم کے ایک صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

''ارے معصوم میاں۔ کیسے ہو''؟

''آپ بزرگوں کی دُعائیں ہیں شکیل صاحب''۔ معصوم نے صوفہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''مگر کال بیل کے نیچے اس اعلان کی کیوں ضرورت پڑی''۔

''بھئی معصوم میاں۔ میرے دونوں گھٹنے جواب دے چکے ہیں، چلنا تو دُور کی بات ہے کھڑا ہونا مشکل ہے۔ اس لئے کال بیل کے قریب اس نوٹس بورڈ کو لگانے کی ضرورت پڑی۔ عام طور پر لوگ کال بیل استعمال کرنے کے بعد میزبان کے فوراً نکلنے کی توقع کرتے ہیں، مگر مجھے دروازہ تک آنے میں دس پندرہ منٹ لگ جاتے ہیں''۔ انہوں نے جواب دیا۔

''مگر اس کا علاج بھی ہے''۔ معصوم نے کہا۔

''بھئی۔ معصوم میاں۔ علاج بہت کیا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اب ڈاکٹر کا مشورہ ہے دونوں گھٹنے بدلوا لیجئے۔ میاں اس عمر میں یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔ اور سناؤ کیسے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔
''اللہ کا شکر ہے۔ آپ سے ایک لمبے عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جب آپ کے

شہر آنا ہوا تو آپ کی یاد مجھے یہاں کھینچ لائی‘‘۔ معصوم نے جواب دیا۔

’’یہ تم نے اچھا کیا‘‘۔ وہ اتنا کہہ کر گھر کے اندر چلے گئے۔

شکیل الرحمٰن صاحب معصوم سے اسکول میں دو سال سینئر تھے، یعنی جب معصوم ہائی اسکول میں تھا وہ بارہویں کلاس میں تھے اور پڑھنے میں بہت تیز اور بیحد ذہین تھے۔ رات رات بھر پڑھنا اُن کا معمول تھا اور رات میں جب چائے کی خواہش ہوتی تو معصوم کو حکم دیتے کہ دیکھو کوئی ہوٹل کھلا ہو تو دودھ لے آؤ۔ معصوم بڑی سعادت مندی سے ان کی خدمت کرتا تھا، کیونکہ وہ اپنے چھوٹوں کی بہت عزت کرتے تھے اور ان کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ مہذب شخصیت کے مالک تھے۔ لہٰذا بڑی نرمی سے گفتگو کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اچھی سرکاری نوکری حاصل کر لی تھی اور معصوم اپنے خاندانی تجارت کے پیشے سے منسلک ہو گیا تھا۔ دروازہ کھلا اور شکیل صاحب چائے کی ٹرے لئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ’’لو بھئی...... چائے پیو۔ ایک عرصہ کے بعد تم سے ملاقات ہو رہی ہے، لہٰذا میں اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلاتا ہوں۔ تم نے تو مجھے بہت چائے پلائی ہے‘‘۔ کہہ کر انہوں نے ٹکوزی سے ڈھکی کیتلی سے پیالی میں چائے، دودھ اور شکر ڈال کر چائے تیار کر دی اور بولے۔

’’دیکھو بھئی...... اب ہم عمر کے آخری پڑاؤ میں ہیں۔ دونوں بیٹے امریکہ میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہیں۔ دونوں لڑکیاں اپنے اپنے سسرال میں ہیں۔ مقامی ہونے کی وجہ سے ان کا آنا جانا لگا رہتا ہے‘‘۔

’’پھر بھی شکیل صاحب۔ تنہائی کا احساس تو ہوتا ہوگا‘‘۔ معصوم نے کہا۔

’’حالات کا تقاضہ ہے کہ ہم ایڈجسٹ کر کے زندگی بسر کریں‘‘۔ شکیل صاحب نے جواب دیا۔ جنہوں نے اپنی سرکاری نوکری میں بے انتہا دولت کمائی تھی، بہت بڑی کوٹھی میں اکیلے رہ رہے تھے۔

’’تمہاری تجارت کیسی چل رہی ہے‘‘۔ انہوں نے معصوم سے پوچھا۔

''بہت اچھی...... ماشاء اللہ...... میرے والد مرحوم نے انتقال سے قبل پوری جائیداد اور تجارت کو ہم سب بھائیوں میں تقسیم کردیا اور دونوں بہنوں کا حق ادا کر دیا تھا۔ اب ہم سب اپنے اپنے کاروبار کے خود ذمہ دار ہیں''۔ معصوم نے ایک جملہ میں پوری داستان بیان کر دی۔

''بڑی اچھی بات بتائی تم نے معصوم میاں۔ میرے پڑوسی اپنا آبائی مکان فروخت کر کے ایک بڑے شہر میں بسنے چلے گئے''۔ شکیل صاحب نے کہا۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔ آج کل بڑے شہروں میں رہنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ جہاں بجلی پانی کی سہولتیں میسر ہیں۔ چھوٹے شہر آج کے دور میں بھی رات بھر اندھیرے میں ڈوبے رہتے ہیں''۔ معصوم نے شکیل صاحب کی بات کا جواب دیا۔

''تم نے میری بات نہیں سمجھی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ میرے پڑوسی اپنی پانچ بہنوں کا حق بھی لے کر چلے گئے...... موروثی جائیداد میں بیٹیوں کا بھی حق ہوتا ہے جیسا کہ تمہارے والد نے بٹوارہ کے وقت لڑکیوں کا حق بھی ادا کر دیا''۔ شکیل صاحب نے اسلامی مسئلہ کی بات کہی۔

''آپ نے بجا فرمایا شکیل صاحب۔ ہمارے مسلم سماج میں یہ بہت بڑی کمی ہے''۔ معصوم نے کہا۔

''صرف کمی ہی نہیں میاں معصوم۔ حق تلفی بہت بڑا گناہ ہے۔ جائیداد میں لڑکیوں کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ لڑکوں کا، مگر میرے مشاہدہ میں آیا ہے کہ اچھے اچھے دیندار گھرانے کے وہ لوگ جو مسئلہ مسائل سے واقف ہیں، حج اور عمرہ کی سعادت سے بھی سرفراز ہو چکے ہیں، انہوں نے لڑکیوں کی حق تلفی کو جائز قرار دے دیا ہے''۔ شکیل صاحب ماشاء اللہ بہت تعلیم یافتہ تھے۔ دُنیا کے علاوہ دین کی بھی بڑی معلومات رکھتے تھے۔ قرآن اور حدیث کے علاوہ ان کے بک شیلف میں تفسیر کی مستند کتابیں بھی رکھی تھیں۔ ان کی قابلیت میں کوئی شک کی گنجائش نہیں تھی، لہٰذا معصوم میاں نے پوچھا۔

''شکیل صاحب۔ آپ سے مل کر بیحد خوشی ہوئی۔ آپ میری بہت سی الجھنوں کا ازالہ

کر سکتے ہیں"۔

"ہاں۔ہاں۔بولو معصوم میاں"۔شکیل صاحب نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"آج کل طلاقِ ثلاثہ پر ملک بھر میں بحث ہو رہی ہے، کیوں کہ حکومت وقت مسلم پرسنل لاء کے عوض کامن سول کو ڈلانے کے حق میں ہے جو جائیداد میں لڑکیوں کو حق سے محروم کر دے گا۔ ہمیں وراثت کے قانون کی لڑائی اسی طرح لڑنی چاہئے جیسی کہ طلاق کی جنگ ہو رہی ہے۔ مسلم معاشرہ میں عورتوں کو پورا پورا حق حاصل ہے کسی طرح کی تفریق نہیں کی جاتی۔روزہ نماز، حج اور زکوٰۃ مردوں کے علاوہ عورتوں پر بھی فرض ہے"۔معصوم نے شکیل صاحب سے کہا۔

"بہت صحیح کہا تم نے۔ہمیں وراثت پر بھی عمل کرنے کی ضرورت ہے۔آبائی جائیدادوں میں عام طور سے دیہی علاقوں میں ایک غلط رواج وجود میں آ رہا ہے کہ لڑکیوں کو شادی میں دیئے جہیز کو اس کی وراثت کا بدل قرار دے رہے ہیں جو بیحد خطرناک عمل ہے۔لڑکیوں کا بھی باپ کی جائیداد میں اتنا ہی حق ہے جیسے بیٹوں کا۔تناسب میں فرق ہے کہ بیٹی کو بیٹے کا نصف حصہ ہوتا ہے"۔شکیل صاحب نے معصوم کو سمجھایا اور اپنی تشویش کا اظہار بھی کیا۔معصوم بغور اُن کی قابلیت بھری گفتگو سنتا رہا۔

"آپ نے بہت اچھی باتیں بتائیں۔ہمیں حرام اور حلال پر بھی دھیان دینے کی سخت ضرورت ہے"۔

"بالکل...... جب ہم غیر مسلم کا ذبیح کیا ہوا گوشت نہیں کھا سکتے تو پھر ہم کو ہر حرام شئے سے دُور رہنے کی ضرورت ہے۔اللہ تعالیٰ صرف روزہ نماز کا ہی حساب نہیں لے گا بلکہ حقوق العباد کا بھی جواب دہ ہونا پڑے گا۔ہمارا پڑوسی بھوکا ہو تو ہمارا کھانا حرام ہے۔دینی کتابوں میں تو اتنی احتیاط کا حکم دیا گیا ہے کہ پھلوں کے چھلکے بھی اپنے غریب پڑوسی کے دروازہ پر نہ پھینکو۔بلکہ اُن کو بھی ان کا حصہ بھیج دو۔اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ سالن میں پانی ڈال کر شوربہ بڑھا دو اور اپنے پڑوسی کو بھی بھیج دو"۔شکیل صاحب نے کہا۔

شکیل الرحمٰن صاحب معصوم سے بہت بے تکلف بھی تھے اور محبّت بھی کرتے تھے۔ معصوم کو اس حقیقت کا علم تھا کہ ہم دونوں نے ایک ساتھ تعلیم حاصل کی۔ میں اپنے آبائی تجارت کے پیشے سے منسلک ہو گیا اور شکیل صاحب کو سرکاری ملازمت مل گئی جہاں رشوت کی بے پناہ دولت ان کی منتظر تھی۔ لہٰذا انہوں نے اپنے اخلاق اور رسوخ سے اتنی دولت پیدا کی کہ آج ایک بڑی کوٹھی نما مکان میں تنہا رہ رہے تھے۔ شکیل صاحب سے رخصت ہونے سے چند منٹ قبل معصوم نے ان سے صرف ایک سوال کیا اور ڈرائنگ سے باہر نکل گیا۔

شکیل صاحب۔ کیا اسلام میں رشوت لینا جائز ہے؟

شکیل صاحب حیرت سے معصوم کو جاتے ہوئے دیکھتے رہ گئے۔

......☆......

(طنز و مزاح)

میر صاحب نے تیاری کی

''اماں...... یہ عید کا چاند دن میں کیسے نکل آیا''۔ مرزا جی نے میر صاحب کو امین آباد کے چوراہے پر دیکھ کر کہا۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ میاں ہر وقت مذاق نہ کیا کرو۔ پتہ نہیں کون کس مصیبت میں گرفتار ہو اور آپ کو مذاق کی سوجھی ہے۔

''خیریت تو ہے میر صاحب''؟ مرزا جی نے تعجب اور افسوس کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔

''خیریت ہوتی تو میں اس طرح آپ کو بھلا امین آباد میں نظر آتا''۔ میر صاحب نے جواب دیا۔

''اللہ خیر کرے...... خدانخواستہ آپ کے دشمنوں کو کچھ ہو گیا ہے''؟ مرزا صاحب نے دریافت کیا۔

''دشمن تو سب الحمد للہ...... خیریت سے ہیں بلکہ میرے عزیز دوست نواب سعدالدین احمد کی طبیعت ناساز ہے۔ ان کی عیادت میں جانے کے لئے نکلا ہوں''۔ میر صاحب نے کہا۔

''تو پھر یہاں سے یکّہ پر سوار ہو جایئے۔ قباحت کی کیا بات ہے''؟ مرزا جی نے کہا۔

''قباحت کی ہی بات ہے کہ جوتے کی پالش نہیں ہے۔ اسی کی تلاش میں نکلا ہوں''۔ میر صاحب نے کہا۔

میر صاحب! مرزا جی نے سوال کیا ''میں سمجھا نہیں کہ حضور نواب سعدالدین احمد صاحب کی عیادت کا جوتے کی پالش سے بھلا کیا تعلق ہے''؟

''غضب خدا کا...... آپ کو اتنا بھی علم نہیں کہ نواب صاحب قبلہ کی عیادت کیلئے کیا میں

بغیر پالش کئے جوتے پہنے چلا جاؤں۔ خدا کا قہر نازل ہو جائے گا مرزا جی‘‘۔ میر صاحب نے کہا۔
’’اچھا اچھا...... تو اب سمجھ میں آیا کہ آپ جوتے کی پالش خریدنے امین آباد تشریف لائے ہیں‘‘۔

’’اور تو کیا۔ امین آباد کی ریوڑیاں خریدنے آیا ہوں‘‘۔ میر صاحب نے بُرا مان کر کہا۔
میر صاحب جوتے کی پالش خرید کر گھر آئے۔ ان کی بیگم نے ان کو دیکھ کر اطمینان کی ایک لمبی سانس لی اور بولیں...... ’’یہ بتایئے کہ نواب صاحب کی عیادت کے لئے شیروانی کس رنگ کی الماری سے نکالوں‘‘۔ میر صاحب نے جوتے پر پالش کرتے ہوئے جواب دیا۔
’’بھئی...... عیادت کے لئے تو سفید یا بھورے رنگ کی شیروانی ہی بہتر ہو گی‘‘۔
کوئی ایک بتایئے؟ بیگم صاحبہ نے کہا۔ ’’تا کہ میں اسے پریس کر دوں‘‘۔
’’بہتر تو یہ ہے کہ گلابی رنگ کی شیروانی ایسے موقع کے لئے بہت مناسب رہے گی۔ کیونکہ نواب سعد الدین احمد صاحب کو گلابی رنگ اور گلاب کے پھولوں سے بیحد عشق ہے۔ اپنی شیروانی میں جواہر لعل نہرو کی طرح گلاب کا پھول یا شیروانی کی اوپری جیب میں سرخ رنگ کا رومال ضرور رکھتے ہیں‘‘۔ میر صاحب نے کہا۔
بیگم صاحبہ نے ہلکے گلابی رنگ کی شیروانی پریس کر کے لٹکا دی مگر میر صاحب کی الجھن ابھی کم نہیں ہوئی تھی۔ پاجامہ میں ازار بند غائب تھا، لہٰذا انہوں نے بیگم کو پکارا اور فرمایا:
’’اب آپ ہی بتایئے۔ کوئی شریف آدمی بھلا بغیر ازار بند کے پاجامہ پہن سکتا ہے‘‘۔
’’ارے تو لایئے۔ میں ازار بند ڈالے دیتی ہوں۔ پریشان کیوں ہو رہے ہیں‘‘۔ مگر میر صاحب کی نظر جب پاجامہ کے ازار بند پر پڑی تو انہوں نے بیگم سے کہا...... ’’لاحول ولا قوۃ...... یہ ازار بند ہے یا دھاگے کی رسّی۔ مجھے کیا آپ نے جانور سمجھا ہے جو رسّی سے میری کمر باندھ رہی ہیں‘‘۔ بیگم نے برجستہ جواب دیا۔
’’اب دُکانوں پر ایسے ہی ازار بند ملتے ہیں۔ وہ زمانہ آپ بھول جایئے جب آپ پھلنے

والا ازار بند پہن کر سارے شہر کا چکّر لگا کر چلے آتے تھے اور لوگ لحاظاً آپ کے لٹکتے ہوئے ازار بند پر آپ کو ٹو کتے نہیں تھے"۔ بیگم صاحبہ نے میر صاحب کو پُرانی باتیں یاد دلائیں۔

"اچھا اچھا...... اب میں تیار ہوتا ہوں۔ بہت وقت برباد ہو گیا"۔ میر صاحب نے اپنی جھینپ مٹانے کے لئے بیگم سے کہا اور غسل خانہ میں داخل ہو گئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد غسل خانہ سے برآمد ہوئے تو وہ اب نواب صاحب کی عیادت کے لئے بالکل تیار نظر آرہے تھے۔ انہوں نے قدِ آدم آئینے پر کئی زاویوں سے اپنی شخصیت پر نظر ڈالی اور آدھے گھنٹے میں مطمئین ہوئے کہ نواب سعد الدین احمد صاحب کی عیادت کے لئے مناسب لباس انہوں نے زیب تن کیا ہے۔

گھر سے نکل کر جیسے ہی سڑک پر یکّہ کی تلاش میں آئے مرزا جی کا سامنا ہو گیا۔

"خیریت تو ہے...... یہ کہاں کی تیاری ہے"۔ مرزا جی نے دریافت کیا۔

"میں آپ کے گوش گذار کر چکا ہوں کہ مجھے اپنے عزیز نواب سعد الدین احمد صاحب کی عیادت کے لئے جانا ہے"۔ میر صاحب نے کہا۔

"جی......" مرزا جی نے کہا۔ "جی ہاں آپ نے صبح ذکر کیا تھا مگر آپ نے دیر کر دی"۔

"خیریت!...... کس بات کی دیر کر دی"۔ میر صاحب نے دریافت کیا۔

"یہی کہ نواب سعد الدین احمد کا ابھی ابھی انتقال ہو گیا"...... مرزا جی نے کہا۔

"کیا کہا"؟ میر صاحب نے تقریباً چیختے ہوئے کہا "نواب صاحب کا انتقال ہو گیا"۔

"جی ہاں...... بعد نمازِ مغرب تجہیز و تکفین ہو گی...... میں وہیں جا رہا ہوں۔ آیئے ساتھ چلتے ہیں"۔

"کیا غضب کی بات آپ کر رہے ہیں مرزا صاحب...... بھلا میں عیادت والے اس گلابی لباس میں کیسے جا سکتا ہوں۔ مجھے گھر جانا پڑے گا"۔ میر صاحب نے مرزا جی سے کہا۔

"کیوں؟ گھر کیوں جانا پڑے گا"؟ مرزا جی نے دریافت کیا۔

"آپ چلئے"۔ میر صاحب نے ان سے کہا۔ "میں ابھی لباس تبدیل کر کے پہنچتا ہوں"۔

''بہت بہتر''۔ مرزا جی نے کہا اور آگے بڑھ گئے۔

میر صاحب گھر میں داخل ہوئے تو بیگم صاحبہ کو سخت حیرانی ہوئی کہ اتنی جلد کیسے واپس آگئے، مگران کی حیرت کو دُور کرتے ہوئے میر صاحب نے بیگم کو بتایا کہ افسوس صد افسوس، میرے نواب سعدالدین احمد صاحب اب دُنیا میں نہیں رہے۔ یہ کہہ کر وہ رونے لگے۔ بیگم نے ڈھارس بندھائی اور دریافت کیا کہ جب آپ کو ان کے انتقال کی خبر مل چکی تھی تو پھر آپ واپس کیوں چلے آئے۔

''بھئی بیگم...... میں نواب صاحب کی عیادت کی مناسبت سے گلابی شیروانی میں گلاب کا پھول لگا کر تیار ہوا تھا کہ میرے نواب صاحب کو گلاب سے بے پناہ محبت ہے، مگراب تو پورا ماحول ہی تبدیل ہو گیا ہے''۔ میر صاحب نے تفصیل سے بتایا۔

''تب پھر آپ کیا کریں گے''؟ بیگم صاحبہ نے دریافت کیا۔

''بھئی موقع محل کے مطابق کپڑے پہننے کا اصول ہے۔ چونکہ مجھے نواب صاحب کے جنازے میں شرکت کے لئے جانا ہے تو میری کالی شیروانی، کالی ٹوپی اور کالا جوتا نکال دیجئے''۔ میر صاحب نے کہا۔

بیگم صاحبہ نے جلدی جلدی میر صاحب کی کالی شیروانی پر پریس کرنی شروع کی، جس پر ہزار شکنیں پڑی تھیں۔ کیونکہ کافی عرصہ سے کسی کی تعزیت میں استعمال نہیں ہوئی تھی۔ کالی ٹوپی کو پریس کر کے کالے جوتوں پر کالی پالش کی گئی۔ غرض کہ گھر میں ایک چھوٹا سا زلزلہ آ گیا تھا۔ میر صاحب نے غسل خانہ میں جا کر خوب اچھی طرح منہ ہاتھ دھویا تا کہ سینٹ اور پاؤڈر کی خوشبو کافور ہو جائے جو انہوں نے نواب صاحب کی عیادت کی تیاری میں استعمال کئے تھے۔

خدا خدا کر کے میر صاحب تیار ہو کر گھر سے باہر نکلے اور تانگے پر بیٹھ کر نواب سعدالدین احمد صاحب کی اسٹیٹ کی جانب چل دیئے۔ ابھی وہ رکاب گنج کے پل کے قریب ہی پہنچے تھے کہ دُور سے مرزا جی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ انہوں نے کوچوان کو تانگہ روکنے کا حکم دیا۔

''بھیا...... ذرا روکنا''۔ تانگہ رُک گیا۔ مرزا جی نے میر صاحب سے دریافت کیا۔

''کہاں تشریف لے جا رہے ہیں''؟

''نواب صاحب کی کوٹھی پر جنازے میں شرکت کرنے''۔ میر صاحب نے جواب دیا۔

''ہم سب نواب سعد الدین احمد صاحب کو عیش باغ کے قبرستان میں تدفین کر کے واپس لوٹ رہے ہیں''۔ مرزا جی نے بتایا۔

''کیا کہا...... نواب صاحب تدفین کر دیئے گئے۔ اور میں پہنچ نہیں سکا۔ افسوس''۔ میر صاحب نے بڑی افسردگی کے لہجے میں کہا۔

''کیسے پہنچتے میر صاحب آپ''۔ مرزا جی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آپ تو تیاریوں میں ہی لگے رہے اور نواب صاحب کی تجہیز و تدفین ہوگئی''۔ مرزا صاحب نے کہا۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پڑھا اور میر صاحب اسی تانگے سے گھر واپس لوٹ آئے۔

......☆......

مادرِ مہربان

ڈاکٹر عزیز احمد کی تقرری جب بحیثیت سول سرجن ہوئی تو شہر میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس چھوٹے سے شہر سے ڈاکٹر صاحب نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا تھا۔ ان کو اس شہر کی تمام گلیوں سے واقفیت تھی۔ ہر طبقہ خیال کے لوگوں سے ان کی ملاقات تھی۔ ان کو اپنے ماضی کی وہ ساری باتیں یاد تھیں جو ان کی موجودہ زندگی کا اہم حصہ تھیں۔ گاؤں سے معمولی سامان اور کتابیں لے کر جب وہ اس شہر میں وارد ہوئے تھے تو وہ اجنبی تھے۔ کسی سے کوئی شناسائی نہیں تھی۔ ہر شخص سے وہ ناواقف تھے۔ سول سرجن کے عہدہ کا چارج لینے کے بعد ان کے ذہن میں جو پہلی تصویر اُبھری وہ تھی ڈاکٹر تصور حسین کی عظیم شخصیت۔ ان کا مکان اور بنگلہ جو ایک بہت بڑے ہال پر مشتمل تھا اور جس کے چاروں کونے میں چار کمرے تھے جن میں دُور دراز سے آئے طالب علم رہ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ایک بڑا کمرہ ڈاکٹر صاحب کا ذاتی کمرہ تھا جس میں ان کی میڈیکل کی ضخیم کتابیں۔ مریض کو دیکھنے کا آلہ اور دیگر ڈاکٹری سامان میز پر رکھا رہتا تھا۔ اسی بڑے کمرے میں مریضوں کو دیکھتے تھے۔ بنگلہ سے ہٹ کر تھوڑے فاصلے پر کوٹھی نمار ہائشی مکان تھا جس میں ڈاکٹر تصور حسین کی اہلیہ، ان کے بچے اور درجنوں نوکر رہتے تھے۔ اسی ہال کے ایک کمرے سے ڈاکٹر عزیز احمد نے اپنی پڑھائی کی ابتداء کی تھی۔ ہائی اسکول اور انٹر میڈیٹ تک کی تعلیم اسی کمرے میں رہ کر مکمل کی تھی۔ اس وقت ان کی عمر بمشکل اٹھارہ بیس سال کی رہی ہوگی۔ بنگلہ کے ہر کمرے میں مقیم طالب علم اپنا کھانا خود اسٹوو پر پکاتا تھا۔ عزیز احمد کے گاؤں سے گھر کا غلّہ اور سبزی آتی تھی اور وہ بھی دیگر طالب علموں کی مانند اپنا کھانا خود پکاتے تھے۔ ہر طالب علم کا ابتدائی دور کانٹوں بھرا ہوتا ہے، جو ان کانٹوں سے بچ کر نکل گیا وہی زندگی میں کامیاب ہوتا ہے۔

ماضی کی دلچسپ یادوں میں کھوئے ڈاکٹر عزیز احمد کو اچانک اماں کا خیال آیا۔ ڈاکٹر تصور

حسین صاحب کی بیگم جنہیں پورا شہر اماں کے نام سے پکارتا تھا در اصل وہ بے لوث محبّت کا پیکر تھیں جو سب کی خبر گیری کرتی تھیں۔ حاجت مندوں کی ضرورت پوری کرنا ان کا معمول تھا۔ بنگلہ میں مقیم دُور دراز سے آئے طالب علموں کی خیریت لیتیں اور ان کی ضروریات کو پورا کرتی تھیں۔ ایک بار عزیز احمد کو بہت تیز بخار آیا۔ اماں کو خبر ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب سے دوا دلوائی اور جب تک وہ صحت مند نہیں ہو گئے ان کا ناشتہ اور دونوں وقت کا کھانا گھر سے بنگلہ میں بھجواتی رہیں۔ ہر طالب علم سے اپنی اولاد کی مانند برتاؤ کرتی تھیں۔ لڑکے آتے اور تعلیم مکمل کر کے چلے جاتے مگر وہ اماں کو نہیں بھولتے تھے۔ سب نے ان کو اپنی جانب سے ''مادرِ مہربان'' کا لقب عطا کیا تھا۔ مادرِ مہربان بھی سب کے لئے ماں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ یہ بچے ہمارے کرایہ دار ہیں۔

''کوئی بہت بڑی گاڑی میں آئے ہیں۔ آپ سے ملنے کو کہت ہیں'' نوکرانی نے اماں کو اطلاع دی۔

''ارے مجھ سے کون ملنے گاڑی پر آیا ہوگا''؟ اماں نے کچھ سوچا اور کہا کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا دو میں ابھی آتی ہوں...... اماں جب ڈرائنگ میں داخل ہوئیں تو اجنبی کو پہچان نہیں سکیں۔

''آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں اماں'' آنے والے نے کہا تو اس کی آواز اور اماں کہنے کے انداز سے اماں نے پہچان لیا۔

''ارے عزیز احمد...... تم کب آئے بیٹا''...... اماں نے کہا اور عزیز احمد نے چارفٹ کی اماں کو گلے لگا لیا۔

''اماں...... آپ کا نالائق عزیز احمد ڈاکٹر ہو گیا ہے اور آپ کے شہر میں سول سرجن کی حیثیت سے آ گیا ہے''۔

یہ تو تم نے بڑی اچھی خبر سنائی کہ تو ڈاکٹر بن گیا۔ میں تجھے یاد کیسے آئی''؟ اماں نے پوچھا:

''اماں...... میں نے تعلیم کے بعد دُنیا کے بہت سے ملکوں کا دورہ کیا۔ مگر اپنی مادرِ مہربان کی یادوں کو اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ میں بھولا نہیں ہوں کہ جب میں بیمار پڑتا تھا تو آپ میری

دیکھ بھال کرتی تھیں''۔عزیز احمد نے کہا۔

''ارے چل ہٹ۔معمولی معمولی باتوں کو یاد کرتا ہے''۔اماں اتنا کہہ کر اندر چلی گئیں کہ بیٹھو تیرے لئے چائے بھجواتی ہوں''۔وہ اس بات پر بیحد خوش نظر آ رہی تھیں کہ بنگلہ میں رہ کر اپنی تعلیم حاصل کرنے والا لڑکا ڈاکٹر ہو گیا ہے اور ان کے شہر میں سول سرجن کی حیثیت سے آیا ہے۔ خوشی سے ان کے پیر زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

وقت کا پہیا اپنے معمول کے مطابق تیزی سے گردش کرتا رہا۔دن مہینہ میں اور مہینہ سالوں میں بدلتے رہے۔ڈاکٹر عزیز احمد کے بچے بڑے ہو گئے۔بیرونی ملکوں میں تعلیم حاصل کرنے چلے گئے مگر جب دوبارہ اماں کے شہر میں ان کی تقرری ہوئی تو ان کو بتایا گیا کہ مادرِ مہربان بیحد بیمار ہیں۔چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔بڑے ڈاکٹر صاحب کا کافی عرصہ قبل انتقال ہو چکا ہے لہٰذا عزیز احمد جب اماں سے ملنے ان کے کمرہ میں داخل ہوئے تو کمرہ میں اندھیرا تھا۔ایک بلب کے ساتھ ایک لالٹین بھی جل رہی تھی جو بجلی چلی جانے کے بعد روشنی دیتی تھی۔ اماں ہڈی اور چمڑہ کا مجسّمہ بن گئی تھیں۔آنکھوں کی روشنی اور کانوں کی قوت سماعت سے محروم ہو چکی تھیں۔پورے ماحول سے ڈاکٹر عزیز احمد نے محسوس کیا کہ اماں کی صحیح نگہداشت نہیں ہو رہی ہے۔ان کے اکلوتے بیٹے وسیم بھی ڈاکٹر تھے اور زیادہ تر اپنے والد کے پرانے نسخوں کی بنیاد پر پریکٹس کرتے تھے۔والد کی میڈیکل کی ساری کتابیں ان کے کمرہ کی زینت بن گئی تھیں۔ڈاکٹر عزیز احمد نے بہت دل برداشتہ ہو کر وسیم صاحب سے دریافت کیا......

''آپ نے اماں کا چیک اپ کیا؟......کیا کیا تکلیفیں ہیں''؟

''کچھ نہیں......ان کو کوئی تکلیف نہیں۔بھلی چنگی ہیں''۔وسیم نے جواب دیا۔

''آپ انہیں بھلی چنگی کہہ رہے ہیں جو نیم مُردہ کی حالت میں بستر پر پڑی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب......آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔یہ بالکل ٹھیک ہیں ان کو کوئی تکلیف نہیں ہے''۔

وسیم نے باقاعدہ میڈیکل کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی بلکہ اپنے والد کے نسخوں کی بنیاد پر پریکٹس کر رہے تھے جسے عرفِ عام میں "جھولا ڈاکٹر" کہتے ہیں۔

قدرت کا کچھ نظام ایسا ہے کہ دُنیا کا کوئی کام رُکتا نہیں ہے۔ ہر کام اپنے وقت پر اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ پُرانے لوگ اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں، اُن کی جگہ لینے کے لئے نئے بچّوں کی پیدائش ہوتی ہے۔ وقت کا پہیا چلتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر عزیز احمد صوبہ کے مختلف شہروں کے اسپتالوں میں اپنی خدمات انجام دے کر ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ گئے۔ اپنی نوکری کی آخری پوسٹنگ اماں کے شہر میں اس خیال سے کروائی کہ مادرِ مہربان کی حتی الامکان خدمت کر سکیں، جن کے احسانات کو وہ فراموش نہیں کر سکے تھے۔ اماں کی شخصیت ہی اتنی عظیم تھی کہ ان کو بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔ دُنیا میں ایسے بہت کم لوگ ہیں جو غیروں کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتے ہیں۔ اماں ان ہی میں سے ایک تھیں۔

ڈاکٹر عزیز احمد کی کار اماں کے مکان کے سامنے رُکی تو وہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مکان غائب تھا، مکان کی جگہ پر ان کو ایک خالی میدان دکھائی دیا۔ بنگلے کی طرف نظر دوڑائی جہاں ان کے تعلیمی زندگی کے بہترین اوقات گزرے تھے۔ حیرت سے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بنگلہ زمین بوس ہو چکا تھا۔ ابھی وہ حالات پر غور کر ہی رہے تھے کہ محلّہ کے حاجی رمضان علی نے آ کر سلام کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

"حاجی صاحب...... یہ بنگلہ یہ گھر کو کیا ہو گیا"؟ رمضان علی نے جواب دیا کہ "اماں کی دردناک موت کے بعد سب تہس نہس ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب"۔ "اور ڈاکٹر وسیم کہاں ہیں"؟ ڈاکٹر عزیز احمد نے حاجی صاحب سے پوچھا۔

"چھوٹے ڈاکٹر صاحب...... اپنے ایک رشتہ دار کے گھر میں منتقل ہو گئے"۔ حاجی صاحب اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

......☆......

میرے حصّے میں ماں آئی

انسان کی زندگی کے آخری ایّام عموماً کسمپرسی میں گزرتے ہیں۔ الاّ ماشاء اللہ۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عمر کے آخری پڑاؤ میں قوتِ سماعت و بصارت اور کسی حد تک قوتِ گویائی بھی جواب دینے لگتی ہے۔ ایسی حالت میں گھر کے افراد کی توجہ بھی کم ہونے لگتی ہے جبکہ اسی عمر میں اس کو توجہ کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ملک کے بڑے شہروں میں ''اولڈ ایج ہوم'' کا رواج اب عام ہوگیا ہے۔ ایسے ہومس میں اولادیں اپنے ماں باپ کو داخل کر کے مطمئن ہوجاتے ہیں جیسے انہوں نے اپنے فرائض سے سبکدوشی حاصل کرلی ہو۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جن والدین نے اپنی قلیل آمدنی میں آٹھ آٹھ بچوں کی پرورش کی، ان کو تعلیم سے آراستہ کیا اور جب وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوگئے تو وہی ماں باپ ان کو بوجھ لگنے لگتے ہیں۔ بیٹے کے علاوہ اگر بہو بھی ملازمت پیشہ ہے تو ان کو خیریت تک دریافت کرنے کا وقت نہیں ملتا۔ ضعیف والدین دلجوئی کے متمنی اپنی ہی پیدا کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور صبر کر کے خاموش ہوجاتے ہیں۔

دراصل والدین سے عدم توجہی کا مرض مغربی ممالک سے آیا ہے جہاں بزرگوں کی حالت بہت ہی افسوس ناک اور قابل رحم ہے۔ بزرگ والدین بڑی کسمپرسگی کی زندگی جینے پر مجبور ہیں۔ مغربی سماج کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بچے اپنے عمر رسیدہ والدین کو اپنے ساتھ رکھنا پسند نہیں کرتے اور ضعیف والدین اپنے بچوں کے ساتھ رہنے پر راضی نہیں ہوتے۔ لہٰذا مجبوراً گزر بسر کے لئے انہیں ملازمت کرنی پڑتی ہے۔ ایسا ہی ماحول ہندوستان کے بڑے شہروں میں بھی دیکھنے کو مل رہا ہے۔ ان شہروں میں ایسے بھی والدین ہیں جن کے چار بیٹے چار مغربی ممالک میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے ہیں مگر انہیں اپنے ضعیف والدین کی خیریت دریافت کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ کچھ والدین ایسے بھی ہیں جو اپنے بچوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتے۔ میاں بیوی تنہا رہتے

ہیں اور بقول ان کے وہ آزاد ماحول میں جی رہے ہیں۔ کسی کے محتاج نہیں ہیں اور اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ ایک بالکل نیا ماحول وجود میں آ گیا ہے کہ جب لائق اولاد اپنے والدین کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہے تو وہ آزاد رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اور جب کوئی نالائق اولاد اپنے والدین کی خبر گیری نہیں کرتا تو دُنیا بھر میں اس کی نالائقی کی داستان بیان کی جاتی ہے۔

پنچانوے سال کی ضعیف ''نانی اماں'' تنہا رہنے پر مجبور تھیں، مگر ان کی تنہائی ان کی خود ساختہ تنہائی تھی۔ زمینداری کے معاملات انہیں کسی بیٹے کے پاس زیادہ عرصہ تک ٹکنے نہیں دیتے تھے۔ ان کے پاس گاؤں میں کھیت اور باغات تھے جس کی دیکھ بھال کے لئے درجنوں نوکر اور نوکرانیاں مامور تھیں۔ دو بیٹے اور دو بیٹی کی ماں جن کو ان کی ضعیف العمری کے تناسب سے سب ''نانی اماں'' کہتے تھے۔ اپنے بیٹوں کے ساتھ نہ رہنا ان کی مجبوری تھی۔ شوہر کا کافی عرصہ قبل انتقال ہو چکا تھا اور ''نانی اماں'' زمینداری کے معاملات کو بخوبی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ بہت بڑی حویلی نما مکان میں وہ رات میں کبھی تنہا نہیں رہیں۔ کئی ملازمہ رات کی ضروریات کے لئے مامور تھیں۔ ان کے حکم کے مطابق ان کا پاندان، ان کا اُگالدان اور پانی کا لوٹا معمول کے مطابق اپنی اپنی جگہ پر رکھ دیئے جاتے تھے۔ گاؤں میں بجلی نہیں تھی، لہٰذا چھوٹی بڑی لالٹینیں رات بھر جلتی رہتی تھیں، اس کے علاوہ ''نانی اماں'' کے سرہانے تکیہ کے نیچے چار سیل کی ایک بڑی سی ٹارچ بھی رکھی رہتی تھی جس کی تیز روشنی میں نانی اماں رات میں بھی بہ آسانی دیکھ سکتی تھیں، مگر وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا، بدلتا رہتا ہے۔ اچانک نانی اماں سخت بیمار پڑیں اور ان کی نگہداشت کرنے والا کوئی موجود نہیں تھا۔ ان کی حالت ایسی ہو گئی کہ ''اُٹھانا خود ہی پڑتا ہے، تھکا ٹوٹا بدن اپنا کہ جب تک سانس چلتی ہے، کوئی کاندھا نہیں دیتا''۔

''نانی اماں کو اب تنہا نہیں رہنا چاہئے''۔ پڑوس کے کلیم الدین صاحب نے کہا۔

''جی ہاں...... صحیح فرمایا آپ نے۔ ماموں لوگوں کے پاس چلی جائیں''۔ ایک دوسرے پڑوسی نے کہا۔ ہر شخص نانی اماں کے رشتہ سے ان کے دونوں بیٹوں کو ماموں کہتا تھا۔ جبکہ ان کی کوئی

رشتہ داری نہیں تھی۔

"کیا ان لوگوں کو "نانی اماں" کی علالت کی خبر دے دی گئی ہے"۔ ایک مقامی ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

"ضرور دے دی گئی ہوگی۔ نانی اماں اب پلنگ سے لگ گئی ہیں، دوبارہ اُٹھنے کی مجھے بہت کم اُمید نظر آ رہی ہے"۔ کلیم الدین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"اللہ رحم کرے۔ بڑی بزرگ خاتون ہیں۔ غریبوں اور بے سہاروں کی ہمدرد"۔ ایک صاحب نے کہا۔

ٹیلیگرام کا زمانہ تھا۔ نامی اماں کی بیماری کی اطلاع کسی قریبی عزیز نے ان کے دونوں بیٹوں اور دونوں بیٹیوں کو بذریعہ ٹیلیگرام دے دی۔ لہٰذا دوسرے دن ہی سے ایک کے بعد ایک ان لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سب سے نزدیک بڑے بیٹے حمید تھے مگر وہ دُور رہنے والے چھوٹے بیٹے سعید کے دو دن بعد پہنچے۔ دونوں بیٹیاں بھی اپنی والدہ کی علالت کی خبر پر بھاگی ہوئی چلی آئیں۔ مثل مشہور ہے کہ آپ کا بیٹا اسی وقت تک آپ کا بیٹا ہے جب تک کہ اس کی شادی نہیں ہو جاتی، مگر آپ کی بیٹی مرتے دم تک آپ کی بیٹی ہوتی ہے۔

مکان کے بڑے ہال میں چاروں بھائی بہنوں کی "نانی اماں" کی علالت کے سلسلہ میں ایک طویل کانفرنس ہوئی۔ بڑی بیٹی نے جیسے ہی نانی اماں کو اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش کا اظہار کیا چھوٹے بیٹے کی بیوی مہہ جبیں نے درمیان میں ہی بات کاٹ دی۔

"باجی...... آپ ماں کی محبت میں امی جان کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہیں مگر جن کے دو دو بیٹے ہوں ان کا آخری عمر میں بیٹی کے یہاں جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ ہم امی جان کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آئے ہیں۔ یہ ہمارا آخری فیصلہ ہے"۔

مگر...... حمید سے بھی پوچھ لو "وہ بڑے ہیں۔ ان کا پہلا حق ہے"۔ بڑی باجی نے کہا۔

"پوچھنا کیا ہے......"؟ سعید نے کہا۔ "بھائی جان کی نیت اپنے ساتھ لے جانے کی

ہوتی تو بھابی جان کو ساتھ لے کر آتے"۔

"کیوں حمید؟.....تمہارا کیا کہنا ہے؟" بڑی باجی نے حمید سے پوچھا۔

"باجی" انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر بڑی بہن سے مخاطب ہوئے اور مشورہ دیا" باجی آپ کو اس کا بخوبی علم ہے کہ میری بیوی کی نہ صحت اچھی ہے اور نہ عقل۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ آپ امی جان کو اپنے ساتھ لے جائیں"۔

"مجھے امی جان کو ساتھ لے جانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ امی جان میرے پاس فصل کٹنے کے بعد چھ مہینے تک رہی ہیں"۔ بڑی باجی نے کہا۔

"آپ لوگ بُرا نہ مانئے گا۔ دراصل امی جان کے جانے کے بعد کھیت اور باغات کی دیکھ بھال کرنا بھی ایک بڑا مسئلہ ہوگا۔ اتنی بڑی جائیداد کے غلّے کو مناسب جگہوں پر رکھوانا، باغات کو موسم کی مناسبت سے وقت پر نیلام کرنا، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے کام ہیں جن کی دیکھ بھال میں ہی کر سکتا ہوں"۔ بڑے بیٹے حمید نے امی جان کو اپنے ساتھ نہ لے جانے کی تاویلات پیش کیں جبکہ امی جان کی تیمارداری سے ان گھریلو مشغولیات کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ امی جان کے چھوٹے بیٹے سعید جو بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے اپنے بڑے بھائی کی باتوں کو بغور سن رہے تھے۔ سعید اپنے بھائی کی نفسیات سے بخوبی واقف تھے۔ وہ دولت کو دانت سے پکڑنے کے عادی تھے۔ خوبصورت انداز میں گفتگو کر کے تھوڑی دیر کے لئے اپنا ہم خیال بنانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ بخوبی واقف تھا کہ بھائی جان کے لئے دولت ان کی کمزوری تھی۔ سعید اپنے بھائی جان کی کچھ بے مثال تشبیہات کو فراموش نہیں کر پائے تھے۔ مثلاً:

مانا کہ پیسہ ہتھیلی کا میل ہے   پیسہ نہیں تو آدمی کولھو کا بیل ہے

اکثر و بیشتر کہا کرتے تھے کہ

اے زر تو خدا تو نہیں   مگر خدا سے کم بھی نہیں

ان کے مطابق جذباتی انسانی عقل سے کورا ہوتا ہے۔ ایسا شخص کبھی بھی صحیح فیصلہ نہیں

کرسکتا۔ اسی لئے وہ ہمیشہ مستقبل پر نظر رکھتے ہوئے کوئی فیصلہ کرنے کے عادی تھے۔ امی جان کے سلسلہ میں بھی وہ اپنے اسی نظریہ پر قائم تھے۔ کوئی بھی جذباتی فیصلہ مستقبل میں نقصان دہ ثابت ہوسکتا تھا۔ اسی لئے وہ مالی طور پر فائدہ نقصان کے مدِ نظر کوئی فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔

''امی جان کے بارے میں تم لوگوں نے کیا سوچا ہے''۔ بڑی باجی نے دونوں چھوٹے بھائیوں کو مخاطب کر کے ان کی رائے جاننی چاہی۔

''بھائی جان نے تو معاملہ صاف کر دیا ہے کہ اماں کی غیر موجودگی میں وہ کھیت اور باغات کا انتظام سنبھالیں گے اور اپنے بڑے ہونے کے فرائض انجام دیں گے''۔ سعید نے کہا ''باجی آپ امی جان کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے رضامند ہیں مگر چاروں بھائی بہنوں میں، میں سب سے چھوٹا ہوں، لہٰذا بقول اُردو کے مشہور و معروف شاعر منور رانا:

کسی کو گھر ملا حصّہ میں یا کوئی دُکاں آئی   میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا میرے حصّے میں ماں آئی

امی جان کو میں اپنے ساتھ ہمیشہ کے لئے لے کر جا رہا ہوں، نہ مجھے کھیت سے مطلب ہے نہ باغات سے غرض۔ مجھے صرف اپنی آخرت کی فکر ہے''۔

......☆......

دُشمن کی جائیداد

حاجی محمد عثمان کی وضعداری اور شرافت سے دُنیا واقف تھی، ان کے دشمن بھی اُن پر اُنگلی نہیں اٹھا سکتے تھے، کیونکہ مظلوموں، غریبوں، مسکینوں اور پریشان حال انسانوں کی خدمت کرنا ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ جس شہر میں رہے وہاں کی مسجدوں سے تعلق پیدا کر کے حتی الامکان اپنی خدمات وقف کر دیتے تھے۔ بہت کم ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو دوسروں کا کام کر کے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ محمد عثمان کی یہ بہت بڑی خوبی تھی کہ وہ بلا کسی غرض کے غیروں کی مدد کر کے خوش ہوتے تھے۔ اللہ نے ان کو حسن اخلاق کے ساتھ صالح اور نیک اولادیں بھی عطا کی تھیں جن کی تعلیم و تربیت پر انہوں نے کافی توجہ دی جس کے عوض ان کے سبھی بچے مطمئن زندگی بسر کر رہے تھے۔ محمد عثمان کے چار بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ ان کے بڑے دو بھائیوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ صرف دو بھائی باحیات تھے۔

عید کے موقع پر سب اپنے آبائی مکان میں اکٹھا ہوئے۔ دونوں بہنیں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آگئیں اور دو مرحوم بھائی کی بیوہ بھابھیاں بھی پہنچ گئیں۔ محمد عثمان سب کے ساتھ حسن سلوک کے عادی تھے۔ لہٰذا ہر تہوار میں ان کے ساتھ خوشی منانے پورا خاندان اکٹھا ہو جاتا تھا۔ عید کے دن جب خاندان کے سارے افراد بڑے ڈرائنگ ہال میں اکٹھا ہوئے تو محمد عثمان نے سب سے مخاطب ہو کر کہا:

"میں اب ریٹائر ہو چکا ہوں...... زندگی کے دن گنتی کے رہ گئے ہیں"۔

"کہو...... بڑی بیوہ بھابی نے کہا۔ کہو...... تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ زندگی کا دن تو سب کا روزانہ ایک ایک دن کم ہوتا ہے۔ مطلب کی بات کرو"۔

''میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ والد صاحب مرحوم کی ایک جائیداد برباد ہو رہی ہے۔ زمانہ اب بہت خراب آ گیا ہے۔ کسی کی بھی نیت خراب ہو سکتی ہے اور وہ اس پر قبضہ کر سکتا ہے''۔ محمد عثمان نے جواب دیا مگر بھابی نے ان کو پھر ٹوکا۔

''ابھی بھی تم اس پوائنٹ پر نہیں آئے ہو، جو تم کہنا چاہتے ہو''۔

''دراصل ایک بہت بڑا پلاٹ، جو کبھی کھیت ہوا کرتا تھا، اس پر بہت سے لوگوں کی نظر ہے گھر کے قریب ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ ہم اسے فروخت کر کے تمام حقدار کو ان کا حق ادا کر دیں''۔ عثمان نے کہا۔

سب نے ان کی بات کو بغور سنا اور کافی سوچنے کے بعد بڑی بھابی نے محمد عثمان سے کہا۔

''جس پلاٹ کی تم بات کر رہے ہو...... وہ ہماری جائیداد نہیں ہے''۔

''یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں......؟ ابو جان مرحوم کا نام کاغذ میں درج ہے''۔ عثمان نے کہا۔

''میں یہ نہیں جانتی کہ کاغذ پر کیسے درج ہے، مگر اس گھر میں اس وقت بہو کی حیثیت سے آئی تھی جب تمہاری پیدائش بھی نہیں ہوئی تھی''۔ بڑی بھابی نے کہا۔

''اس میں کیا شک ہے''۔ عثمان نے اپنی بڑی بھابی کی بات کی تائید کی۔

''تمہارے بڑے بھائی کو جیسے ہی اٹھارہ سال کی عمر میں سرکاری نوکری ملی تمہاری امی اور ابو کو بہولانے کی خواہش دل میں مچلنے لگی...... جب میری شادی ہوئی تو میں صرف چودہ سال کی تھی۔ میں قانونی بات کو نہیں جانتی، مگر ابو جان نے اپنی زندگی میں جو کچھ کیا اس کا مجھے علم ہے''۔ بھابی نے کہا۔

''تو کیا یہ زمین ابو جان نے نہیں خریدی تھی''؟ محمد عثمان نے اپنی بھابی سے وضاحت چاہی۔

''مجھے اس کا علم نہیں ہے''۔ بھابی نے کہا۔

''بہر حال کچہری کے کاغذات کے مطابق یہ کھیت ابو جان مرحوم کا ہے جس کو میں

فروخت کر کے سب کو قانون کے مطابق ساری رقم تقسیم کر دوں گا''۔محمد عثمان نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''ٹھیک ہے ہم سب راضی ہیں''۔سب نے ایک زبان ہو کر کہا سوائے بڑی بھابی کے۔

پورا خاندان حسب روایت عیدالاضحیٰ کے موقع پر پروگرام کے مطابق اپنے گھر اکٹھا ہوا۔ لڑکیاں بھی تہوار کے بہانہ میکہ منانے چلی آتی تھیں کیونکہ ان کی امی اور ابو کا انتقال ہو چکا تھا۔ دونوں بھائی بہنوں کا خیال کرتے تھے۔بچے بھی ماموں جان کے گھر جانے کے لئے بے قرار رہتے تھے۔محمد عثمان کا بچوں کے ساتھ خصوصی لگاؤ تھا۔بسکٹ چاکلیٹ سے بچوں کی خوب خاطر کرتے تھے۔لہٰذا بچے بھی اپنے ماموں کے آگے پیچھے لگے رہتے تھے۔بقرعید میں تین دن سب نے اپنی جانب سے قربانی کی۔بڑے سے آنگن میں روزانہ دو ایک بکرے قربان ہو رہے تھے۔محلّہ بھر میں محمد عثمان نے گوشت تقسیم کروا دیا۔گھر میں سب سے پہلے کلیجی اور پوریاں بنیں، جسے سب نے بہت شوق سے کھایا۔بیٹی اور داماد محمد عثمان کے حسن سلوک سے ہمیشہ متاثر رہتے تھے۔بہنیں کہتیں بھائی کی ذات سے مائکہ قائم ہے۔

پروگرام کے مطابق محمد عثمان کے وکیل نے زمین کے تمام حصہ داروں کو کچہری میں بلایا، لہٰذا سب کچہری گئے اور سب نے رجسٹری کے کاغذات پر دستخط کر دیئے۔خریدار رام اوتار نے ایک موٹی رقم عثمان کو پہلے ہی دے دی تھی جسے انہوں نے گھر آ کر بیٹے اور بیٹی کے حق کے مطابق تقسیم کر دیا۔سب کو اطمینان ہو گیا مگر بڑی بھابی مطمئن نظر نہیں آ رہی تھیں۔آہستہ آہستہ سب اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔محمد عثمان کو ایک ذہنی کوفت سے آزادی ملی کہ کہیں کوئی اس کھیت پر قبضہ نہ کر لے، کیوں کہ اِرد گرد کے سارے کھیت پلاٹنگ کر کے فروخت ہو چکے تھے، جن پر لوگ اپنے مکان تعمیر کروا رہے تھے۔مگر محمد عثمان کا اطمینان زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکا۔کھیت کے خریدار رام اوتار نے محمد عثمان کو مطلع کیا کہ یہ زمین آپ کے والد کی نہیں ہے۔سو سال پہلے کے کاغذات دیکھنے سے پتہ چلا ہے کہ کسی محمد عرفان کا یہ کھیت ہے۔محمد عثمان عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔انہوں

نے ذہن پر زور ڈالا کہ اگر ابو جان مرحوم زندہ بھی ہوتے تو سو سال کے نہ ہوتے، پھر یہ محمد عرفان کون ہیں اور پھر ابو کے نام کچہری میں کیسے درج ہو گئی۔ محمد عثمان بے سکونی کے شکار ہو گئے، وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اب کیا کریں۔ انہوں نے خاندان کے ایک انتہائی بزرگ حاجی محمد یعقوب صاحب سے دریافت کیا۔ انہوں نے محمد عثمان کو جو اطلاع بہم پہنچائی وہ ایٹم بم کی حیثیت رکھتی تھی۔ حاجی محمد یعقوب صاحب کے مطابق محمد عثمان کے خاندان کے ایک فرد محمد عرفان ملک کے بٹوارہ کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ زمین ان ہی کی ہے۔ حاجی عثمان کو اس حقیقت کا علم ہو گیا کہ یہ زمین ان کے والد کی نہیں ہے۔

''عثمان صاحب۔ اب آپ بتائیے کہ ہم کیا کریں''۔ رام اوتار نے محمد عثمان سے کہا۔

''میں کیا بتا سکتا ہوں رام اوتار''۔ محمد عثمان نے جواب دیا۔

''میرا کئی لاکھ روپیہ ڈوب جائے گا''۔ رام اوتار نے روہانسی صورت بنا کر کہا۔

''نہیں ڈوبے گا۔ تم پریشان نہ ہو۔ مجھے سوچنے دو''۔ محمد عثمان نے جواب دیا۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ رام اوتار بیٹھا ہوا محمد عثمان کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا جو چائے کی چسکی لے کر کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ خاموشی کو توڑتے ہوئے انہوں نے رام اوتار کو مخاطب کیا۔

''رام اوتار''۔

''جی حاجی صاحب''۔ رام اوتار ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''تم نے بالکل صحیح کہا تھا کہ یہ کھیت میرے والد کا نہیں ہے، لیکن کچہری کے کاغذات پر میرے والد محمد عرفان کا نام درج ہے''۔ محمد عثمان نے رام اوتار سے کہا۔

''اب تو معاملہ صاف ہو گیا ہے کہ کھیت آپ کے پتا جی کا نہیں ہے۔ میرا تو سارا پیسہ ڈوب جائے گا۔ میں نے اس کھیت کی پلاٹنگ کرا کے خریداروں سے پیشگی رقم بھی لے لی ہے''۔ رام اوتار نے بتایا۔

''تم میری بات کو بہت غور سے سنو اور جو باتیں میں تم کو بتانے جارہا ہوں اسے تم صرف اپنی ذات تک محدود رکھو گے۔ ایک طرح سے یہ راز کی بات ہے جسے صرف ہم اور تم جانتے ہیں''۔ محمد عثمان نے کہا۔

''بتایئے عثمان صاحب......'' رام اوتار ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''بھگوان کی قسم جو بات آپ بتائیں گے وہ ہم کسی سے نہیں کہیں گے بھلے میری جان چلی جائے''۔

''ویری گڈ...... یہ کھیت میرے خاندان کے محمد عرفان کا ہے جو بھارت کے بٹوارہ کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ اگر یہ بات سرکار کو معلوم ہوگئی تو بہت جلد دہلی میں ایک ایسا قانون بننے والا ہے جس کا نام ''اینمی پراپرٹی'' ہے۔ یعنی دشمن کی جائیداد۔ ایسی سبھی جائیداد کو، خواہ کھیت ہو مکان ہو کوٹھی یا محل ہو سرکار کا اس پر قبضہ ہو جائے گا۔ اس لئے تم سب سے یہی کہو گے کہ زمین حاجی عثمان کے پتا محمد عرفان کی ہے جسے میں نے خرید لیا ہے۔ نہ تم کو اپنے پلاٹ کے خریداروں کی پیشگی رقم واپس کرنی پڑے گی اور نہ مجھ کو تمہیں روپیہ واپس کرنا پڑے گا''۔ محمد عثمان نے رام اوتار کو سمجھایا۔

''جیسا آپ کہیں گے حاجی صاحب ویسا ہی ہوگا''۔ نمسکار کہہ کر رام اوتار مطمئین ہو کر چلا گیا۔

......☆......

ایمان کا سودہ

اپنا گھر ہر شخص کا خواب ہوتا ہے۔ وہ اس کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دیتا ہے۔ پھر بھی بہتوں کا خواب بس خواب بن کر رہ جاتا ہے۔

احتشام کا بھی اپنے ذاتی مکان کا ایک خواب تھا کہ ہمارا بھی اپنا مکان ہوگا جس میں ہم اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزار سکیں گے۔ اپنے مکان کو اپنی مرضی کے مطابق مزین کریں گے۔ ہم میاں بیوی کا علاحدہ ایک کمرہ ہوگا۔ ضعیف والدین کے ان کے ذاتی کمرہ کے علاوہ بچوں کے الگ کمرے ہوں گے جس میں وہ آزادی سے اپنی تعلیم پوری کریں گے۔ ابھی تک چار عدد بچوں، بیوی اور بوڑھے والدین کے لئے کرائے کے چھوٹے چھوٹے کمروں کے مکانوں میں گزر کر رہا تھا۔ ایسے مکانوں میں کھلی ہوا کا بھی گزر نہیں ہوتا تھا۔ بیماریاں بھی ایسی ہی تنگ گلیوں کے چھوٹے چھوٹے گھروں کو اپنا مسکن بنا لیتی تھیں۔ ٹی بی کے زیادہ تر مریض ایسے ہی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر اور مریض دونوں بیماریوں کی بنیادی وجھوں سے بہ خوبی واقف ہونے کے باوجود حالات کے آگے مجبور ہوتے ہیں۔

احتشام سرکاری محکمہ کے جس عہدہ پر فائز تھا وہاں رشوت کا بازار گرم تھا۔ رشوت کو باشرع، پنج وقتہ نمازی، حاجی اور حافظ صاحبان نے بھی ضرورتاً جائز قرار دے دیا تھا۔ ایک ہی دفتر میں رام پرشاد اور حافظ شوکت علی الاعلانیہ رشوت وصول کر رہے تھے مگر احتشام اپنی ایمانداری سے کسی قیمت پر سمجھوتہ کرنے پر رضا مند نہیں تھا۔ اس کی تربیت ہی ایسے پاک ماحول میں ہوئی تھی جہاں جھوٹ بولنا، رشوت لینا اور سود کھانا حرام کے زمرے میں آتا ہے۔ لہٰذا اپنے چار عدد بچوں، بیوی اور ضعیف والدین کی بنیادی ضروریات بڑی مشکل سے پوری کر پاتا تھا۔ کرایہ کے مکان میں کسی طرح گزر

بسر کر رہا تھا۔ دن میں بیٹھنے والا صوفہ رات میں کسی بچے کے بیڈ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ اس کی شرافت اور ایمانداری ہی اس کا سرمایہ تھی۔ اسی لئے اب تک شہر میں کرائے کے درجنوں مکان تبدیل کر چکا تھا۔ مالک مکان کے ایک ہلکے سے اشارہ پر مکان خالی کرنے کا پورے شہر میں ریکارڈ قائم کر چکا تھا۔

اس کے دفتر میں ساتھ کام کرنے والے ساتھی شفیق احمد نے مکان بنانے کے لئے جب زمین خریدی تو احتشام کو اس بات کا انکشاف ہوا کہ شفیق نے وہ راستہ اختیار کیا تھا جو اس کے لئے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ قدرت کا کرشمہ کہیے یا شفیق کی قسمت کہ ندی کا پانی سیکڑوں سال پرانے باندھ کو توڑ کر شہر میں داخل ہو گیا۔ کھیتوں میں باڑھ تو سب نے سنا تھا مگر شہر میں ایسی زبردست اور خوفناک باڑھ بزرگوں نے بھی اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ شہر کی جن سڑکوں پر رکشے چلا کرتے تھے وہاں حکومت کی مہیا کی ہوئی کشتیاں چلنے لگیں اور عوام اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے ان ہی کشتی کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے۔ عجیب منظر تھا۔ پانی سے لبالب بھری ہوئی سڑک کو پار کر کے دوسری جانب اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے کشتی پر بیٹھ کر جا رہے تھے جس کا کرایہ ایک روپیہ تھا۔

شہر کو باڑھ کے پانی سے بچانے کے لئے حکومت نے شہر کے چاروں طرف پختہ باندھ بنانے کا فیصلہ کیا تا کہ لاکھوں عوام کی زندگی کو بچایا جا سکے۔ اسکول کالج بند ہو چکے تھے۔ دفتروں میں برائے نام کام ہو رہا تھا۔ احتشام کے ساتھی شفیق احمد انجینئر کے اعلیٰ عہدہ پر تعینات تھے۔ لہٰذا حکومت نے پختہ باندھ بنانے کے لئے سیمنٹ، بالو، ڈیزل وغیرہ کا شفیق احمد کو انچارج بنا دیا۔ جنگی پیمانے پر باندھ بنانے کا کام شروع ہوا اور غیر معمولی حالات کے مدنظر حکومت نے اخراجات کے حساب دینے سے مبرّا کر دیا۔ لہٰذا باندھ بنانے میں انجینئر شفیق احمد نے دونوں ہاتھوں سے حکومت کی دولت کو لوٹا اور اپنا گھر بنانے کے لئے شہر میں ایک پلاٹ خرید لیا۔ کچھ عرصہ بعد اسی پلاٹ پر ایک دو منزلہ عالیشان عمارت تعمیر ہو گئی۔

اپنے ذاتی مکان کا خواب دیکھنے والے احتشام اپنے خاندان کی پرورش، تعلیم اور بچوں کی شادی بیاہ پر بہت تنگی سے زندگی گزاری مگر وہ اپنا مکان جس کا انہوں نے زندگی بھر خواب دیکھا تھا، بنوانا تو خیال وخواب کی بات ثابت ہوئی، ایک پلاٹ بھی نہیں خرید سکے۔ ان کے بچے تعلیم حاصل کر کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو گئے۔ لڑکیوں کی شریف گھرانوں میں شادیاں ہو گئیں۔ اور احتشام صاحب اپنے ریٹائرمنٹ سے قبل اللہ کے حضور ایک ہی دُعا مانگتے رہے کہ اے اللہ! اس شہر کو باڑھ سے بچانا تا کہ ہم ایمان کے سودے سے جیسے پہلے محفوظ رہے موت تک محفوظ رہ سکیں۔

......☆......

لکھنؤ کی عید

رمضان کریم کی آمد سے قبل ہی روزہ کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ سحری اور افطاری کا مینو بن جاتا ہے۔ گرمیوں کے روزوں میں شربت اور برف کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہر گھر میں حسب استطاعت رمضان مبارک کا استقبال کیا جاتا ہے۔ اس مبارک مہینہ میں لوگ گناہ سے توبہ کر لیتے ہیں اور عادی شرابی بھی شراب پینا چھوڑ دیتے ہیں۔ گھر کی مستورات افطار تیار کرنے میں مشغول ہو جاتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ قرآنِ پاک کی تلاوت سے بھی غافل نہیں ہوتیں۔ جمعہ جمعہ نماز پڑھنے والے بھی ماشاءاللہ پانچوں وقت کی نماز اور تراویح کا اہتمام کرتے ہیں۔ لہٰذا شہر اور دیہات کی سبھی مسجدیں نمازیوں سے بھری رہتی ہیں۔ ایسی رونق اور ایسا روحانی ماحول پورے سال دیکھنے کو نہیں ملتا۔ یہی وہ مہینہ ہے جس میں قرآنِ مجید ہمارے پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اُتارا گیا تھا۔ اس پاک مہینہ میں ہر نیک کام کا ثواب ستّر گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔ اسی مہینہ میں ہر صاحب حیثیت ایک لاکھ روپے کی بچت پر ڈھائی ہزار زکوٰۃ نکال دیتے ہیں جو غرباء، مساکین کے درمیان تقسیم کر دی جاتی ہے تاکہ غریب بھی اپنے افطار اور سحری کا انتظام کر سکیں۔ عام دنوں کے بہ نسبت رمضان کے مہینہ میں لوگ عبادت میں زیادہ مشغول رہتے ہیں۔ لہٰذا غرباء اور مساکین کا بھی بہت خیال کرتے ہیں۔

"ارے سنئے...... اگر آج چاند ہو گیا تو آپ کو تراویح پڑھنے جانا ہوگا اور ہم سب کے لئے سحری بھی لانی ہوگی۔ آپ تو اطمینان سے اخبار پڑھ رہے ہیں"۔ بیگم نے کہا۔

"ارے ہاں...... بتاؤ کیا لانا ہے"۔ رفیع صاحب نے پوچھا۔

"یہ لسٹ لیجئے۔ میں نے ضروری سامان لکھ دیئے ہیں۔ مگر سحری کے لئے پھینی لانا نہ بھولئے گا ورنہ بغیر سحری کے روزہ رہنا پڑے گا"۔ نوشابہ نے کہا۔

''ہاں بھئی۔ہاں۔ مجھے معلوم ہے کہ ہم لکھنؤ میں ہیں اور لکھنؤ میں دودھ میں بھیگے لچھے یعنی پھینی نہ ہو تو پھر سحری کیسی؟'' رفیع نے پرچہ لیا اور بازار کے لئے نکل گئے۔

رمضان کا مہینہ برکتوں کا مہینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے رزق میں اضافہ کر دیتا ہے۔ عام دنوں کے مقابلے رمضان میں طرح طرح کے پھل، مثلاً پکے پپیتے جس کو ارنڈ خربوزہ بھی کہا جاتا ہے۔ کیلے امرود، ناشپاتی پورے رمضان میں افطار کے وقت میسر ہو جاتا ہے۔ روزے بھی آج کی طرح ایئر کینڈیشن کمروں میں گزار کر نہیں رہا جاتا تھا۔ بجلی کے پنکھے نہیں تھے، ہاتھ کے پنکھوں سے گرمی دُور کی جاتی تھی۔ پانی کی قلّت تھی۔ پانی بھرنے والے طے شدہ تین یا چار گھڑے پانی مہیا کر دیتے تھے، ورنہ سرکاری نلوں پر جسے عرف عام میں بمبا بھی کہا جاتا تھا، محلّہ کے بچوں عورتوں اور مردوں کی ایک بھیڑ جمع رہتی تھی۔ رفیع کے لئے وہاں سے پانی لانا بھی اس لئے ممکن نہیں تھا کہ سرکاری نلوں میں مقرر اوقات تک ہی پانی مل سکتا تھا اور وہی وقت آفس میں حاضر ہونے کا ہوتا تھا۔

''سنئے! سحری میں اُٹھنا کیسے ہوگا؟...... آپ سے کہا تھا کہ ایک الارم گھڑی لا دیجئے۔ آپ نے وہ بھی نہیں کیا'' ......نوشابہ نے کہا۔

''دیکھو نوشابہ۔ امین آباد میں ایک گھڑی کی دُکان پر معلوم کیا الارم گھڑی پچاس روپیہ میں مل رہی تھی۔ میرے بس کے باہر تھی نہیں لے سکا''۔ رفیع نے بتایا۔

''پھر کیسے وقت پر اُٹھیں گے''؟ نوشابہ نے کہا۔

''گھبراؤ مت...... سحری جگانے والے وقت پر آ کر ہم سب کو جگائیں گے''۔ رفیع نے جواب دیا۔

''صحیح کہا آپ نے۔ اگر یہ سحری پارٹی نہ آئے تو شاید محلّہ کے بہت سے لوگ بغیر سحری کے روزہ رہ جاتے''۔ نوشابہ نے پوچھا۔

رمضان المبارک مہینہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر گھر سے دوسروں کے یہاں افطاری بانٹی جاتی ہے۔

لکھنؤ صرف تہذیب کا ہی شہر نہیں ہے بلکہ یہ شاعروں کا بھی شہر ہے۔ قدیم زمانہ کے شعراء مثلاً عزیز لکھنوی، جوش ملیح آبادی، عبدالباری آسی، پنڈت آنند نرائن ملا، عبدالحلیم شرر لکھنوی اُردو زبان وادب کے عظیم شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ مگر ہر دور میں اور ہر گھر میں ایک شاعر ضرور پیدا ہوتا ہے۔ جن کو ان کے گھر والے بھی نہیں جانتے کہ ہمارا ہونہار بیٹا شاعری بھی کر رہا ہے۔ ایسے شاعروں سے کچھ خوش الحان نوجوان سحری کے نغمے لکھوا کر محلّہ محلّہ سحری جگانے نکلتے تھے۔ سحری پارٹی کی خوش الحانی اور رمضان میں اللہ کے پیغام کو اتنے خوبصورت انداز سے پڑھتے تھے کہ گھر کے بچے اور عورتیں اپنے اپنے دروازوں پر کھڑے ہو کر لطف اندوز ہوتے تھے۔

لکھنؤ میں روزوں کے ساتھ عید کی تیاریاں بھی بڑے زور و شور سے شروع ہو جاتی ہیں۔ رمضان میں نخاس، چوک، امین آباد اور نظیر آباد کی دُکانیں رات بھر کھلی رہتی ہیں۔ بڑی رونق رہتی ہے اِن دُکانوں پر۔ ہر ہوٹل اور ریسٹورینٹ میں رات میں روزہ دار چائے اور کافی کی چسکیاں لیتے ہیں۔ یہ سلسلہ سحری تک چلتا رہتا ہے۔ جیسے جیسے عید کے دن قریب آنے لگتے ہیں امین آباد کی رونق میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ پورا شہر خریداری کے لئے ٹوٹ پڑتا ہے۔ بازار عورتوں اور بچوں سے گلزار ہو جاتا ہے۔ عورتوں اور خصوصاً کم سن لڑکیوں کی سب سے پسندیدہ خریداری کی جگہ ہے امین آباد کا گڑبڑ جھالا مارکیٹ۔ گڑبڑ جھالا کی چھوٹی چھوٹی دُکانوں پر ہر طرح کی چوڑیاں، لپ اِسٹک، نقلی خوبصورت گہنے کی وجہ سے عورتوں اور لڑکیوں کی دلچسپی کی واحد جگہ ہے۔ بعض سنہرے گہنے، چوڑیاں، گلے کا ہار، ہاتھ کے کنگن اتنے دلکش اور دلفریب ہوتے ہیں کہ ان پر اصلی سونے کا گمان ہوتا ہے۔ ایسے ہی گہنوں کے لئے امین آباد کے بازار میں ایک شخص آواز لگا کر فروخت کر رہا تھا کہ ''اصلی سے کم نہیں۔ کھو جائے تو غم نہیں''...... پورے رمضان گڑبڑ جھالا کی مارکیٹ رات بھر کھلی رہتی ہے۔ خصوصاً چاند رات کو عورتیں چوڑیاں پہن کر صبح فجر کے وقت واپس آتی ہیں۔

''سنئے''...... نوشابہ نے رفیع کو مخاطب کیا۔

''ہاں کہیے''۔

''میں نے کہا عید کے دن قریب آ رہے ہیں۔ بچوں کے کپڑے بھی بنوانے ہیں''؟

''بن جائیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں''۔ رفیع نے نوشابہ کو سمجھایا۔

''پریشانی مجھے اس بات کی ہے کہ آپ پچھلے سال کی طرح نظیر آباد کی جمعرات کی فٹ پاتھ مارکیٹ سے خریداری نہ کریں۔ اس سال بچوں کو دُکانوں سے اچھے اچھے کپڑے بنوادیجئے''۔

''بالکل بنواؤں گا...... انشاء اللہ...... مگر تم جمعرات کی فٹ پاتھ کی بازار کو حقیر نہ سمجھو۔ لکھنؤ کی یہ وہ مشہور و معروف مارکیٹ ہے جس نے ہر امیر و غریب کے جسم پر چمکتے اور چمچماتے ہوئے کپڑے پہنائے ہیں۔ جمعرات کے کپڑے پہنتے پہنتے کتنوں کی عمریں ختم ہو گئیں۔ متوسط طبقہ کے شرفاء کی عزت کی ضمانت ہے فٹ پاتھ کی جمعرات مارکیٹ''۔

رفیع کو دفتر سے عید کے موقع پر ''تہوار ایڈوانس'' مل گیا جس کی وجہ سے عید کے موقع پر سب کے لئے اچھے اچھے کپڑے بن گئے۔ کپڑوں کا ایک ڈھیر لاکر نوشابہ نے پلنگ پر رکھا اور بولیں:

''سب کے کپڑے دُکانوں سے خریدے ہیں دیکھ لیجئے''۔ رفیع نے ایک ایک پیکٹ کو کھول کر دیکھا، بچے بیحد خوش تھے۔ لڑکوں کے لئے کُرتا پائجامہ ٹوپی کے علاوہ شرٹ اور پینٹ بھی تھی۔ لڑکیوں کے لئے جمپر شلوار دوپٹہ کے علاوہ غرارہ سوٹ بھی خریدا گیا تھا۔ رفیع نے دیکھا کہ اس کے لئے بھی کرتا پائجامہ ٹوپی کے علاوہ پینٹ شرٹ بھی خریدی گئی ہے مگر نوشابہ کا کپڑا نہیں تھا۔

''نوشابہ...... تمہارا کپڑا نہیں دکھائی دے رہا ہے''۔ رفیع نے دریافت کیا۔

''دیکھئے۔ ایسا ہے کہ امی جان اس سال ہم لوگوں کے پاس نہیں ہیں، ہر سال ان کے لئے میں کپڑا بنواتی تھی، لہٰذا میں نے اپنا نہ بنوا کر امی جان کے لئے ان کا مخصوص سفید شلوار، سفید قمیص اور سفید دوپٹہ خرید لیا ہے''۔ نوشابہ نے ایک سانس میں ساری داستان بیان کر دی۔

''مگر...... امی جان اس سال بھائی جان کے پاس ہیں وہ جب سب کا کپڑا بنوائیں گے تو امی جان کا بھی کپڑا بنوائیں گے۔ پھر تم نے اپنے لئے تو کچھ خرید لیا ہوتا''۔ رفیع نے کہا۔

''میرا کپڑا بجٹ میں نہیں آیا۔ اس لئے میں نے امی جان کا لینا مناسب سمجھا۔ دیکھئے ایسا ہے کہ زندگی کا کیا بھروسہ۔ اگلے سال امی جان ہمارے درمیان رہیں یا نہ رہیں''۔ نوشابہ نے بڑی افسردگی سے کہا۔

رمضان کا آخری عشرہ نجات کا بھی ختم ہونے کو تھا۔ ہر ایک کو اب عید کا انتظار تھا۔ نوشابہ نے رفیع سے کہا کہ رات بھر کا سفر ہے، آپ امی جان کا کپڑا دے کر دوسرے ہی دن لوٹ آیئے۔

''اور اگر اُنتیس کا چاند ہو گیا تو''؟ رفیع نے کہا۔

''تو آپ اپنے بڑے بھائی اور امی جان کے ساتھ عید کر لیجئے گا۔ میں یہاں بچوں کے ساتھ کرلوں گی''۔

قہر درویش بر جان درویش رفیع رات بھر کا سفر کر کے امی جان کے پاس پہنچ گئے اور ان کے سامنے ان کا عید کا کپڑا رکھ دیا۔ امی جان نے اپنے بڑے بیٹے کی طرف دیکھا اور کہا۔

''دیکھو...... اللہ کیسے انتظام کرتا ہے۔ اس گھر میں تم نے میرے سوا سب کے لئے کپڑے بنوائے تھے۔ بیٹا رفیع یہ لو نوشابہ کو دے دینا''۔ انہوں نے جیب سے کچھ روپے نکال کر دیئے جس سے نوشابہ نے رفیع کی واپسی کے بعد اپنے لئے عید کے کپڑے بنوائے۔ کیونکہ عید کا چاند تیس دن کا ہو گیا تھا۔ لہٰذا خریداری کا موقع مل گیا۔

......☆......

تار آیا ہے

دادی اماں کی عمر کا کسی کو صحیح علم نہیں تھا کہ وہ کتنے سال کی ہوگئیں۔ کوئی کہتا سو برس کی ہیں تو کوئی ایک سو دس اور ایک سو بیس برس بتاتا۔ خود دادی اماں کا کہنا تھا کہ جب میں دس برس کی تھی تو بڑا زلزلہ آیا تھا۔ اب مشکل یہ تھی کہ بڑا زلزلہ کب آیا تھا، اس کو کیسے معلوم کیا جائے۔ دادی اماں کے چار بیٹے اور چھ لڑکیاں ہوئیں۔ بیٹے بھی اب دادا اور نانا بن چکے تھے اور بیٹیاں ماشاء اللہ دادی اور نانی بن چکی تھیں۔ ان کی ذات سے ایک فوج تیار ہو چکی تھی۔ سب سے بڑے بیٹے کلیم کے سب سے چھوٹے لڑکے معاذ کو دادی اماں سے بڑی اُنسیت تھی۔ وہ ہمیشہ دادی اماں کے قریب چکر لگاتا رہتا اور کہتا کہ میں ایک دن دادی اماں کو لمکا بک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج کراؤں گا۔ معاذ کے مطابق دادی اماں شہر ہی کی نہیں ملک کی سب سے بزرگ خاتون تھیں۔ انہوں نے سات حج کئے تھے۔ پہلا حج داداجان کے ساتھ کیا اور ان کے انتقال کے بعد لڑکے جب حج پر جاتے تو دادی اماں کو ساتھ لے جاتے۔ اس طرح دادی اماں نے سات حج کئے۔ دادی اماں کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت یہ تھی کہ پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھتی تھیں۔ مزاج میں شاہ خرچی تھی اور غرباء اور مساکین کی مدد کو سب سے بڑی عبادت تصور کرتی تھیں۔

ان کا دلارا پوتا معاذ اپنے اسکول کے سارے اخراجات دادی اماں سے پوری کراتا تھا۔ دادی اماں کو گود میں بھر کر کہتا دادی اماں آپ کتنی اچھی ہیں۔ آج مجھے پزّا کھانا ہے۔ دادی اماں فوراً اپنے جیب والے کرتے سے روپیہ نکالتیں اور وہ اپنی پیاری دادی کا بوسہ لے کر گھر سے نکل جاتا۔ محلّہ کے ہر گھر کی خبر لیتی رہتی تھیں دادی اماں۔ کس کے گھر کیا کمی ہے اس کو بلا کر روپے دیتیں۔ غریب لڑکی کی شادی کا سارا بوجھ اپنے سر پر اُٹھا لیتیں۔ اللہ نے ان کے دو بیٹوں کو عرب ممالک میں بڑے عہدوں پر فائز کیا تھا۔ اچھی تنخواہیں تھیں اور دادی اماں کی ضرورت کو وہ فوقیت دیتے تھے۔ لہٰذا

دادی کا ہاتھ کبھی خالی نہ رہا۔ دوسروں پر خرچ کر کے وہ ہمیشہ خوش ہوتی تھیں۔

''امی جان''۔ دادی اماں کے سب سے چھوٹے بیٹے نسیم نے ان کے کان کے قریب جا کر کہا۔

''کیا ہے؟...... نسیم تجھے کچھ چاہئے''۔ دادی اماں نے پوچھا۔

''امی جان۔ اس بار میں دبئی سے طے کر کے آیا ہوں کہ آپ میرے ساتھ چلیں گی''۔ نسیم نے کہا۔

''ارے ہٹو۔ دبئی۔ اب اس عمر میں دبئی جا کر میں کیا کروں گی''۔ دادی اماں نے کہا۔

''آپ کچھ نہیں کریں گی۔ ہم آپ کی خدمت کریں گے''۔ نسیم نے کہا۔

''خدمت تو یہاں بھی ہو رہی ہے بیٹا۔ تم پریشان نہ ہو''۔ دادی اماں نے کہا۔

''ہمارا بھی تو کچھ حق ہے''۔ نسیم کی بیوی عائشہ نے درمیان میں کہا۔ ''ہم آپ کی خدمت سے بالکل محروم ہو گئے ہیں۔ اس لئے آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہی پڑے گا''۔

''بیٹی عائشہ...... تم خود بتاؤ میں دبئی میں کیا دیکھوں گی۔ نسیم کچھ سمجھتا نہیں ہے اس کے باپ نے میرا پہلا حج کرایا۔ امریکہ کی سیر کرائی، اب کہیں جانے کی خواہش نہیں ہوتی''۔ دادی اماں نہ جانے کی ضد کرنے لگیں۔

''امی جان۔ میں آپ کو صرف گھمانے نہیں لے جا رہا ہوں''۔ نسیم نے نفسیاتی داؤ کھیلا۔

''تب پھر کیوں لے جا رہا ہے۔ کیا تو مجھ سے کام کرائے گا نالائق''۔ دادی اماں مصنوعی غصہ میں بولیں۔

''میں دبئی سے آپ کو اپنی کار میں لے کر عمرہ کرانے لے جاؤں گا''۔ نسیم نے کہا تو دادی اماں سوچ میں پڑ گئیں۔ سات حج کے بعد بھی خانۂ خدا کو دیکھنے کی تمنا انسان کے اندر زندہ رہتی ہے۔ عمرہ کا ذکر سنتے ہی ان کے کمزور جسم میں جیسے توانائی آ گئی۔ بولیں۔

''نسیم۔ کیا تو سچ کہہ رہا ہے''۔

''امی جان۔ بھلا ہم آپ سے جھوٹ کیوں بولیں گے''۔ عائشہ نے کہا۔ ''اسی بہانے ہمیں آپ کی خدمت کا موقع بھی مل جائے گا''۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں تم دونوں کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتی''۔ دادی اماں نے بظاہر اپنی منظوری دے دی، مگر حقیقت یہ تھی کہ ان کو عمرہ کی خواہش دبئ لے جا رہی تھی۔

دادی اماں تین مہینے بیٹے نسیم کے گھر دبئ میں رہیں۔ اس درمیان نسیم نے وہیل چیئر پر ان کو کئی عمرے کرائے۔ مکہ مکرمہ کا بدلا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ بیحد خوش ہوئیں۔ وہاں کی موجودہ خوبصورتی اور انتظام قابل دید ہے۔ دادی اماں خوش ہوئیں اور نسیم کو بڑی دُعائیں دیں۔ انہوں نے بتایا کہ میرے پہلے حج کے زمانہ میں اونٹ دکھائی دیتے تھے، مگر اب تو مکہ مکرمہ کی چکنی اور خوبصورت سڑکوں پر صرف کاریں ہی دوڑ رہی ہیں۔ انہوں نے بڑا فرق محسوس کیا۔ بڑے منظّم طریقہ سے طواف اور سعی کر کے ان کو بیحد سکون ملا۔ صفا اور مروہ کے راستوں کی خوبصورتی دیکھ کر ان کی کمزور آنکھوں میں تازگی اور روشنی آ گئی۔ انہوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کیا جس نے ان کو عمر کے آخری پڑاؤ میں عمرہ کی سعادت سے سرفراز کیا۔ خانۂ کعبہ اور مطاف کی نئی تعمیرات سے وہ بہت متاثر ہوئیں۔

''بیٹا نسیم۔ بہت رہ لئے تیرے ساتھ۔ اب مجھے تو سلیم کے پاس پہنچا دے''۔ دادی اماں نے اپنی واپسی کا پروگرام بنا لیا اور دبئ سے منجھلے بیٹے سلیم کے پاس جانے کی خواہش ظاہر کی جو دہلی میں بڑی عالیشان کوٹھی میں رہتا تھا اور کاروبار کرتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم آپ کو بھائی جان کے پاس خود لے کر چلیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں''۔ نسیم نے کہا۔

دادی اماں سلیم کے پاس دہلی آ گئیں۔ سلیم اور اس کی بیوی شاہین بہت خوش ہوئے کہ امی جان اس ضعیفی میں ہمارے گھر آئیں اور ہمیں خدمت کا موقع دیا۔ شاہین دادی اماں کا ہر طرح کا خیال رکھتی۔ وقت پر ناشتہ کھانا اور سونا تاکہ ان کو تکلیف نہ ہو۔ ضعیفی العمری بذاتِ خود ایک مہلک مرض ہے اور دادی اماں تین مہینے دبئ میں بچوں کی خوشی کے لئے کہیں نہ کہیں تفریحاً گئیں۔ لہٰذا جسم تھک سا گیا تھا۔ دہلی پہنچ کر ان کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ سلیم نے دہلی کے بڑے بڑے اسپتالوں میں دادی اماں کا علاج کرایا۔ ایک مرض میں افاقہ ہوتا تو دوسرا پیدا ہو جاتا۔ مرض بڑھتا گیا جیوں

جیوں دوا کی، کے مصداق دادی اماں نے پلنگ پکڑ لیا۔ دادی اماں کی علالت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ان کے آبائی شہر میں پھیل گئی۔ بڑے بیٹے کلیم کے پاس روزانہ درجنوں لوگ دادی اماں کی خیریت لینے آنے لگے۔ دادی اماں کا بہت ہی دلارا پوتا معاذ ان کی بیماری کی خبر سن کر سست رہنے لگا۔ اس کی ساری شوخی غائب ہوگئی اور وہ چوبیس گھنٹے اپنی پیاری دادی اماں کی فکر میں غرق رہنے لگا۔ اس نے دہلی جا کر ان کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر اس کے والد کلیم نے یہ کہہ کر روک دیا کہ اپنے انجینئرنگ کی تیاری کرو۔

ایک دن کلیم کے مکان کی کال بیل بجی۔ دروازہ کھولا گیا تو وہاں ڈاکخانہ کا خاکی وردی میں ملبوس ایک ملازم کھڑا تھا جس نے کلیم کی طرف ایک کاغذ دے کر کہا۔

''اس پر دستخط کر دیجئے۔ تار آیا ہے''۔ تار کا نام سنتے ہی سب کو جیسے سکتہ سا لگ گیا۔ سب کے سب بے اختیار رونے لگے۔ آہ بکا کی آواز سن کر اڑوس پڑوس کے سیکڑوں افراد کلیم کے دروازے پر آگئے۔ ہر ایک کا ذہن دادی اماں کی طویل علالت اور ضعیفی کی جانب مبذول ہوگیا۔ ہر ایک کی زبان پر دادی اماں کا ذکر تھا۔ معاذ جو دادی اماں کا سب سے پیارا پوتا تھا روتے روتے اس کا گلا بیٹھ گیا۔ گھر کا ماحول چند لمحوں میں غمگین ہوگیا۔ ہر شخص کے چہرے پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ کلیم کے پڑوسی لیبر کمشنر معراج اشرف نے کلیم سے کہا کہ تار کھول کر دیکھو کہ دادی اماں کی تجہیز و تکفین کب اور کہاں ہوگی۔ دہلی میں کریں گے یا گھر لائیں گے۔ کلیم ڈرائنگ روم سے اُٹھ کر اس کمرہ میں گئے جس کی میز پر وہ تار چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ انہوں نے تار لا کر معراج اشرف کو دے دیا۔ معراج اشرف نے تار کو چاک کیا اور پڑھنے کے بعد ہنسنے لگے۔ کلیم کو تار واپس کرتے ہوئے بولے۔

''مبارک ہو...... تمہارے بیٹے معاذ کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے انجینئرنگ میں داخلہ ہوگیا ہے۔ یہ تار محکمہ ڈاک و تار کا آخری تار تھا جو رات کے بارہ بجے دیا گیا تھا۔

......☆......

...گھر بنانے میں

اُردو کے مشہور شاعر ڈاکٹر بشیر بدر نے کیا خوب کہا ہے:

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

حنیف صاحب اس شعر کو اکثر گنگنایا کرتے تھے۔ ایک صاحب نے ان سے پوچھ لیا ''حنیف صاحب! آپ کا مکان تو صحیح سلامت ہے اللہ نہ کرے آپ پر ایسی آفت آئے جو ڈاکٹر بشیر بدر پر میرٹھ کے فساد کے وقت آئی تھی، پھر آپ یہ شعر کیوں گنگنایا کرتے ہیں''۔

''شبیر صاحب۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ مجھ کو اس شعر کا صرف پہلا مصرعہ پسند ہے۔ کیونکہ وہ میری زندگی کی صحیح ترجمانی کرتا ہے''۔ حنیف صاحب نے اپنے پڑوسی اور عزیز دوست شبیر صاحب کی غلط فہمی کا ازالہ کیا۔

''آپ درست فرما رہے ہیں کہ انسان ایک گھر بنانے میں ٹوٹ سا جاتا ہے۔ ساری توانائی ختم ہو جاتی ہے اور میرے مشاہدے میں آیا ہے کہ جوانی میں گھر بنوانا شروع کیا، ادھیڑ عمر تک پہنچتے پہنچتے مکان کو کسی طرح کھڑا کیا اور اس کی فنشنگ کے وقت وہ خود بوڑھے ہو گئے۔ سر اور داڑھی کے بال سفید ہو گئے''۔ شبیر صاحب نے کہا۔

''بجا فرمایا آپ نے۔ سماج کا دو طبقہ اگر اپنا سر چھپانے کے لئے گھر بنا لیتا ہے تو معجزہ سے کم نہیں ہے''۔ حنیف صاحب نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں۔ سماج کا دو طبقہ۔ کون سا طبقہ؟'' شبیر صاحب نے پوچھا۔

''ایک میرے جیسا پرائمری اسکول کا ٹیچر اور دوئم ڈاکخانہ کا بابو۔ سماج کے یہی دو طبقے سب سے زیادہ مظلوم ہیں''۔ حنیف صاحب بولے۔

"صحیح کہا آپ نے" شبیر صاحب نے کہا۔

"پرائمری اسکول کے ٹیچر کی حالت سرکاری دفتروں کے چپراسیوں سے بھی بدتر ہے۔ سب سے کم تنخواہ پر محنت اور مشقت سے بچوں کی تعلیم وتربیت کرتے ہیں، اسکول کا نتیجہ بہتر آئے اس فکر میں اپنی گھریلو ذمہ داریوں تک کو فراموش کرجاتے ہیں۔ لباس کے نام پر محض دو جوڑے کپڑے، ایک پہنئے اور دوسرا دھو کر ڈال دیجئے"۔ حنیف ماسٹر صاحب نے اپنی سرگذشت کا کچھ حصہ بیان کیا۔ شبیر صاحب بغور ان کی باتوں کو سن رہے تھے۔ بولے۔

"ماسٹر صاحب۔ دوسرا طبقہ ڈاکخانہ کا بابو کے بارے میں آپ کچھ بتا رہے تھے"۔ شبیر صاحب نے کہا۔

"ڈاکخانہ کا کلرک جسے بابو کہتے ہیں، مرکزی حکومت کا سب سے مظلوم طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی حالت بھی پرائمری اسکول کے ماسٹر سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ خشک کام اور آمدنی محدود۔ گھریلو اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ڈاکخانہ کے سیونگ سرٹیفکٹ وغیرہ فروخت کرنا اس غریب کی مجبوری ہوتی ہے۔ ڈاکخانہ کے بابو کو ریٹائرمنٹ کے بعد ڈاکخانہ کا دو آنہ کا پوسٹ کارڈ بھی خریدنا پڑتا ہے جبکہ مرکزی حکومت کی ریلوے وزارت کا بابو ریٹائرمنٹ کے بعد پورے ملک کا ریل کا مفت سفر کا پاس کا حقدار ہوتا ہے۔ یہ دونوں محکمے مرکزی حکومت کے تحت آتے ہیں"۔ حنیف ماسٹر صاحب نے پرائمری ٹیچر اور ڈاکخانہ کے ملازم کا موازنہ بیان کیا۔

"بڑی اچھی بات بتائی ماسٹر صاحب آپ نے۔ میں نے کبھی اس پر غور ہی نہیں کیا تھا"۔ شبیر صاحب نے کہا۔

"یہ مکان میری اور میری بیوی کی زندگی بھر کی تمناؤں کی تعبیر ہے۔ اس کی تعمیر کے لئے روکھی سوکھی کھا کر پیسہ پس انداز کرنا۔ خواہشات کا گلہ گھونٹا۔ ضروریات کو ملتوی کرنا پڑا۔ وہ سب کچھ کیا جس کو سوچ کر شاعر کا وہ شعر گنگناتا ہوں"۔ حنیف صاحب نے کہا۔

"گھنٹوں سے کیا باتیں ہو رہی ہیں"۔ حنیف ماسٹر صاحب کی بیگم فاطمہ نے ڈرائنگ روم

میں داخل ہو کر کہا'' ۔ابھی تک آپ نے ناشتہ نہیں کیا۔ شبیر صاحب چائے پی کر جائیے گا۔ میں ابھی آئی'' ۔ کہہ کر فاطمہ اندر چلی گئیں۔

حنیف ماسٹر صاحب نے اپنی دونوں بیٹیوں کو خوب اچھی تعلیم دلائی۔ گھر کا ماحول پڑھنے پڑھانے کا رہا، لہٰذا لڑکیوں کو کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ بڑی بیٹی صوفیہ کا ذہن میڈیکل کی تعلیم کی جانب جھکاؤ تھا جبکہ چھوٹی بیٹی رضیہ کو درس و تدریس کی خواہش تھی۔ اس نے اپنے والد کو مشقت بھری زندگی سے یہ سبق حاصل کیا کہ انسان کے اندر اگر جذبہ ہو کام کرنے کی خواہش اور لگن ہو تو وہ دُنیا کے بڑے سے بڑے مسئلہ کا حل نکال سکتا ہے۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ کسی بھی مضمون میں ریسرچ کرے گی اور کالج یا یونیورسٹی میں پڑھائے گی۔ اس کی سوچ و فکر کے مطابق درس و تدریس کا پیشہ عبادت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ چھوٹا بچہ، جو گیلی مٹی کی مانند ہوتا ہے، اس کو شکل دینا کمہار کا کام ہے۔ بالکل ایسا ہی معاملہ استاد کا اپنے شاگرد کے تئیں ہوتا ہے جو اس کو اس کی مرضی کے مطابق تعلیمی دُنیا میں مستقبل کی تعمیر کرتا ہے۔

ماسٹر حنیف صاحب کی دونوں بیٹیاں اپنے اپنے مقصد میں کامیاب ہوئیں۔ صوفیہ میڈیکل کی تعلیم مکمل کر کے ایک اسپتال میں نوکری کرنے لگی اور رضیہ اُردو زبان و ادب میں پی ایچ ڈی کر کے یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں لیکچرر مقرر ہو گئی۔ حنیف صاحب بہت مطمئن تھے کہ بچیوں نے اپنا خواب پورا کر لیا۔ وہ اپنی دونوں لڑکیوں سے بیحد پیار کرتے تھے۔ انسانی فطرت کے مطابق اکثر خیال آتا کہ اللہ نے انہیں اولادِ نرینہ نہیں دی مگر دینی مزاج اور ٹیچر کا ذہن اللہ کی رضا پر راضی ہو جاتا ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے بیٹی دیتا ہے جس کو چاہتا ہے صرف بیٹا دیتا ہے۔ کسی کو بیٹا اور بیٹی دونوں مرحمت فرماتا ہے اور کسی کو کچھ بھی نہیں دیتا۔ یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی پر منحصر ہے، انسان کا اس میں ذرّہ برابر دخل نہیں ہے۔

''سنئے'' فاطمہ نے حنیف صاحب سے کہا ''دونوں بچیوں کے لئے اچھے اچھے رشتے آ رہے ہیں۔ کیا سوچا ہے آپ نے''؟

''سوچنا کیا ہے۔ شادی کر دو''۔ حنیف صاحب نے برجستہ جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ دونوں کی بارات ایک ہی دن بلالوں۔ خاندان اور تمام رشتہ دار بھی ایک بار ہی میں دونوں کو اپنی نیک دُعاؤں سے رخصت کریں۔ آپ کا کیا خیال ہے''؟ فاطمہ نے پوچھا۔

''اس میں پوچھنا کیا ہے۔ میرا بھی وہی خیال ہے جو تمہارا ہے۔ یہ ہر طرح سے مناسب ہوگا۔ ہم بھی ایک ہی بار میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ اخراجات میں بھی کفایت ہوگی''۔ حنیف صاحب نے کہا۔

دونوں بیٹوں کو رخصت کر کے حنیف صاحب اور فاطمہ نے بڑا اطمینان محسوس کیا۔ وقت گزرتا رہا اور ماسٹر صاحب ریٹائر ہو کر گھر پر بیٹھ گئے۔ سرکاری اسکول کی پنشن سے دونوں میاں بیوی کا گزر بسر ہو جاتا تھا۔ قناعت پسند طبیعت کے مالک تھے۔ لہٰذا ہر حال میں خوش اور مطمئن رہنے کے عادی تھے۔ اُن کی قناعت پر اگر فاطمہ کچھ تبصرہ کرتیں تو برجستہ جواب دیتے کم خرچ بالانشیں۔

فاطمہ کے ایک بھانجے مجسٹریٹ ہو کر ان کے شہر میں تعینات ہوئے تو ایک دن اپنی خالہ اور خالو سے ملاقات کرنے کی غرض سے تشریف لائے۔

''ارشد۔ بڑی خوشی ہوئی کہ تم مجسٹریٹ ہو گئے''۔ فاطمہ نے اپنے بھانجے سے کہا۔

''خالہ جان۔ یہ سب آپ بزرگوں کی دُعاؤں سے ممکن ہوا''۔ ارشد بولے۔

''ارے بھئی ارشد۔ میں نے جب سنا تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ خاندان کے تعلیم یافتہ لڑکے اب اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو رہے ہیں''۔ حنیف صاحب نے کہا۔

''خالو جان۔ فخر کی بات تو یہ ہے کہ آپ نے اپنی پرائمری اسکول کے ٹیچر کی حیثیت سے میری دونوں بہنوں کو اعلیٰ تعلیم دی اور ان کی شادیاں کر دیں''۔ ارشد نے اپنے خالو حنیف صاحب سے تعریفی لہجے میں کہا۔

''ارے بیٹا۔ یہ سب اللہ کی مہربانی سے اور لڑکیوں کے تعلیمی شوق سے ہی ممکن ہو سکا ورنہ

میری کیا اوقات کہ میں اتنی اعلیٰ تعلیم دلا سکتا''۔ حنیف صاحب نے کہا۔

''خالو جان۔ ایک بات پوچھوں۔ بُرا نہ مانئے گا''۔ ارشد نے کہا۔

''ہاں ہاں۔ پوچھو۔ ایسی کیا بات ہے''۔ حنیف صاحب نے کہا اور فاطمہ بھی بغور سننے لگیں کہ میرا بھانجہ بھلا ایسی کون سی بات پوچھنا چاہتا ہے جس کے لئے اجازت مانگ رہا ہے۔

''خالو جان۔ میں نے پہلے وکالت پڑھی۔ اس کے بعد مجسٹریٹ بنا۔ قانونی نقطہ نظر سے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ مکان کس کے نام ہے''۔

''میرے نام ہے''۔ حنیف صاحب نے تعجب سے کہا کہ ''اس میں قانونی نقطہ نظر کہاں سے آ گیا۔ میں تمہاری بات کو سمجھ نہیں پا رہا ہوں''۔

''گستاخی معاف، خالو جان۔ آپ کے کوئی اولاد نرینہ یعنی بیٹا نہیں ہے''۔ ارشد نے کہا۔

''ہاں۔ دُنیا جانتی ہے''۔ حنیف صاحب نے کہا۔

''قانون کے مطابق آپ کا مکان آپ کے بعد آپ کے بھائیوں کی ملکیت میں چلا جائے گا۔ خالہ کو تھوڑا سا رہائشی حصہ ملے گا۔ لڑکیوں کا کوئی حق نہیں ہوگا''۔ ارشد نے بتایا۔

''اچھا۔ یہ بات تو مجھے نہیں معلوم تھی''۔ حنیف صاحب نے کہا۔

''جی ہاں۔ کیا آپ کو اپنے بھائیوں پر بھروسہ ہے کہ وہ آپ کے بعد خالہ جان کا ہر طرح سے خیال رکھیں گے''۔ ارشد نے دریافت کیا۔

''نہیں۔ مجھے اپنے کسی بھائی سے ایسی اُمید نہیں ہے''۔ حنیف صاحب نے کہا۔ ''مگر ارشد اگر میں یہ مکان تمہاری خالہ کے نام لکھ دوں تو''؟

''تو خالہ جان کے بھائیوں کے قبضہ میں چلا جائے گا''۔ ارشد نے جواب دیا۔

''اچھا۔ یہ بات ہے''۔ حنیف صاحب نے کہا۔

''ہاں۔ اگر آپ کو خالہ جان کے بھائی پر بھروسہ ہو تو خالہ جان کے نام ٹرانسفر کر دیجئے۔ مسلم پرسنل لاء اور قرآن کی آیت سورۃ النساء میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو کسی بھی تفسیر سے

تصدیق کر لیجئے گا"۔ ارشد نے کہا۔

"بھئی۔ مجھے ان کے بھائی ذوالفقار پر مکمل بھروسہ ہے"۔ حنیف صاحب نے کہا۔

"جیسی آپ کی مرضی۔ میں نے آپ لوگوں کو ایک قانونی نقطہ بتادیا"۔ ارشد نے کہا۔

"ذوالفقار نے اپنی سسرال سے ملی جائیداد کو یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ اللہ نے مجھے بہت دیا ہے۔ لہٰذا ارشد میاں میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس مکان کو فاطمہ کے نام لکھ دوں گا"۔ حنیف صاحب نے کہا۔

حنیف صاحب نے اپنے مکان کو اپنی بیوی فاطمہ کے نام ٹرانسفر کر دیا اور چند سالوں بعد ان کا اچانک ہارٹ اٹیک میں انتقال ہو گیا۔ فاطمہ تنہا ہو گئیں اور ماسٹر صاحب کی پنشن اب ان کو فیملی پنشن کی حیثیت سے ملنے لگی۔ دونوں لڑکیاں والد کے انتقال کے بعد مستقل اپنی امی کی خیریت لیتی رہیں۔ فاطمہ کو کوئی بھی تکلیف ہوتی صوفیہ انہیں اپنے اسپتال میں داخل کر کے علاج کرتی۔ رضیہ روزانہ امی سے ملاقات کرنے آتی تھی۔ اس کے شوہر اسی شہر کے ڈگری کالج میں لیکچرر تھے، کرائے کے مکان میں مقیم تھے۔ خوش دامن کی مستقل بیماری کے مدنظر وہ رضیہ اور بچوں کو لے کر شفٹ ہو گئے۔ اب فاطمہ کا گھر آباد ہو گیا۔ رضیہ بھی مقامی یونیورسٹی کے شعبہ میں تھی، لہٰذا سب کی مستقل رہائش ہو گئی۔ رضیہ کے شوہر رشید نے ایم بی اے کر کے نوکری شروع کی تھی، لہٰذا ان کا ذہن تجارتی ذہن کے طور پر کام کرتا تھا۔ رشید نے اپنے ہم زلف صوفیہ کے شوہر انعام کو مکان کی مالیت کے لحاظ سے نصف ادائیگی کر کے فاطمہ سے اپنے نام مکان لکھوالیا۔ فاطمہ اب اپنے بیٹی داماد کے گھر میں سکون سے رہنے لگیں۔ گھر گرہستی کے جھنجھٹوں سے بھی آزادی مل گئی۔ زندگی سکون سے گزرنے لگی۔

فاطمہ کے بھائی ذوالفقار اپنی بہن سے ملاقات کرنے آیا کرتے تھے۔ بھائی بہن میں آپسی محبت اور خلوص تھا۔ ذوالفقار کو اس بات کی فکر ہوتی تھی کہ اپّی کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ انہیں یہ دیکھ کر بیحد خوشی ہوتی تھی کہ اپّی کے داماد رشید اور رضیہ کے بچے ان کا ہر طرح سے خیال رکھ رہے

تھے۔رشید نے ایک دن ذوالفقار سے سوال کیا۔

''ماموں کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ابّو نے کن وجوہات کی بنا پر اپنے مکان کو امّی کے نام ٹرانسفر کیا تھا''؟ ذوالفقار خاموشی سے سوچنے لگے کہ ان کو اس کی وجہ بتانا کسی طرح مناسب نہیں ہے کسی کو ذہنی طور پر الجھن میں مبتلا کرنا شرافت سے بعید بات ہے۔ جبکہ حنیف صاحب اور ارشد مجسٹریٹ کی ہر نشست میں وہ موجود رہتے تھے اور وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ اس مکان پر صرف اور صرف ان کا ہی حق ہے مگر انہوں نے رشید کو بہت ملائمیت سے جواب دیا۔

''رشید۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے''۔

......☆......

مہر فاطمی

بارات آئی مگر شادی نہیں ہوئی۔ اس معمّہ کو سمجھنے سے پورا شہر قاصر تھا۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ کوئی اسے جہیز کے لین دین کے تناسب سے دیکھ رہا تھا، تو کوئی مسلکی فرق کو اس حادثہ کی وجہ قرار دے رہا تھا۔ لڑکی کا گھرانہ شہر کا سب سے متمول اور دولت مند گھرانوں میں شمار ہوتا تھا، لڑکے والے بھی اپنے شہر کے تاجر تھے اور اور شرع کے سخت پابند تھے۔ مگر حقیقت سوائے مشتاق بھائی کے کسی کو علم نہیں تھا۔ مشتاق بھائی کسی سرکاری دفتر میں کبھی چپراسی رہ چکے تھے اور ترقی کر کے کلرک کے عہدہ پر کام کر رہے تھے۔ بہت نیک اور ملنسار فطرت کے مشتاق بھائی نے صرف اتنا بتایا کہ لڑکی کے والد بڑے دولت مند ہیں، شوگر مل کے مالک ہیں اور کہا جاتا ہے کہ گنّا کسانوں کا کروڑوں روپیہ اب تک ہضم کر چکے ہیں۔ سیاسی رسوخ سے فائدہ اٹھانے کے عادی ہیں۔ بقول مشتاق بھائی کے لڑکی کے والد کا حکم تھا کہ مہر کی رقم کم از کم ایک کروڑ روپے سے کم نہ ہو جس کو لڑکے والوں نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ ہم مہر فاطمی پر نکاح کریں گے۔ لہٰذا دوسرے شہر سے آئی بارات واپس نہیں گئی مگر شادی نہیں ہوئی۔ دولہا عمران نے اپنے قریبی دوستوں کو روک لیا اور شہر کے ایک صاف ستھرے علاقہ میں کرائے کا مکان لے کر اسی شہر میں رک گئے۔ مشتاق بھائی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب وہ اس شہر سے بغیر دلہن لئے اپنے گھر واپس نہیں جائیں گے۔ مشتاق بھائی سے بھی شہر کے کسی اچھے خاندان کی لڑکی دیکھنے کے لئے کہا گیا۔ پڑوس میں رہنے کی وجہ سے ان لوگوں کی گھریلو ضروریات پوری کرنا اب مشتاق بھائی کی اخلاقی ذمہ داری بن گئی۔ متوسط طبقہ کے مشتاق بھائی کو باحیثیت حضرات کی خدمت کا موقع نصیب ہو گیا، لہٰذا عمران نے اپنی تمام گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ ان کے کندھوں پر ڈال کر شہر میں تفریح کرنے نکل جاتے اور بڑے بڑے مال میں خریداری کرتے۔ دوستوں کے ساتھ ریسٹورینٹ میں اچھے سے اچھا کھانا کھاتے اور تھک ہار کر

اپنے کرائے کے مکان میں آرام کرتے۔ عمران کے والد کا کپڑوں کا بزنس تھا۔ خصوصاً ان کے کارخانہ کی بنی لنگیاں پورے جنوبی ہندوستان میں سپلائی ہوتی تھیں۔ اس لئے دولت کی کوئی کمی نہیں تھی، مگر نماز کے سب بیحد پابند تھے۔ قریب کی مسجد میں جاتے تو مہتمم صاحب کو اچھی خاصی بڑی رقم دیتے۔ عمران نیک اور پرہیز گار تھے، لہٰذا مالی طور پر کمزور مشتاق بھائی کا ہر طرح سے خیال کرتے۔ دینی مزاج فراغ دل خاندان سے تعلق تھا، لہٰذا کھلے ہاتھوں خود پر اور دوسروں پر بھی خرچ کرتے۔ اللہ نے دولت کے ساتھ دل بھی بڑا دیا تھا۔

مشتاق بھائی محلّہ میں اپنی نیکی اور شرافت کی وجہ سے مقبول تھے۔ پنج وقتہ نمازی تھے اور کسی مسلکی جھنجھٹ سے دُور رہتے تھے۔ شب برات میں گھر میں حلوہ بھی بنواتے اور تبلیغی جماعت آتی تو اس کی رہبری بھی کرتے۔ سرکاری نوکری بڑی خوش اسلوبی سے کر رہے تھے۔ ایک دن مسجد میں آئی ایک جماعت کے امیر نے مشتاق کی بزرگی کا خیال کرتے ہوئے مصلیان سے کچھ دین کی بات کرنے کی گزارش کی۔ مشتاق بھائی نے کہنا شروع کیا۔

''میں ایک غریب انسان ہوں اور غربت کو اللہ کی رحمت سمجھتا ہوں۔ جس نے غربت نہیں دیکھی وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کی دل سے قدر نہیں کرسکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر کریں، کیونکہ بہت سے اللہ کے بندے ایسے ہیں جن کو وہ بھی نصیب نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑو اور نماز کے عادی بنو''۔

مشتاق بھائی کی اس پُرمغز تقریر کا اثر سارے موجود حضرات پر پڑا، مگر عمران سوچ میں پڑ گئے۔ دوسرے دن عمران نے مشتاق بھائی کی بیٹی سے مسجد میں مہر فاطمی پر نکاح کیا اور بذریعہ ہوائی جہاز دلہن اور دوستوں کو لے کر واپس اپنے شہر چلے گئے۔

کچھ دنوں بعد اپنی لختِ جگر کی محبت اور بار بار کی گزارش پر مشتاق بھائی اپنے داماد عمران کی کوٹھی میں داخل ہوئے تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایسا عالیشان مکان انہوں نے کبھی اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ بیٹی کی پیشانی کا بوسہ دے کر گلے سے لگایا تو روتے روتے ان کا گلا رونده گیا۔

جانور اور انسان

گھوڑے کا فوج سے بہت قدیم اور گہرا تعلق ہے۔ تقریباً ہر ملک کی فوج میں ایک یونٹ گھوڑ سواروں کی ضرور ہوتی ہے۔ لندن کے (بکنگھم پیلیس) کے عالیشان گیٹ کے دونوں جانب گھوڑ سوار تعینات رہتے ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ عرب نسل کے بہترین گھوڑوں پر فورس کا جوان اور اس جوان کی فر والی اُونچی کیپ قابل دید ہوتی ہے۔ عام طور پر گھوڑ سوار فوج کو ملک کے کسی بھی حصے میں پھیلے انتشاری ماحول پر قابو پانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ملک کی سرحد پر جہاں کوئی سواری نہیں جا سکتی گھوڑ سوار فوج ہی حفاظت کی ذمہ داری نبھاتی ہے۔ تیز رفتار گھوڑے گھنٹوں کا سفر منٹوں میں طے کر لیتے ہیں۔ سرحد کی نگرانی میں گھوڑے بہت اہم رول ادا کرتے ہیں۔

اُتراکھنڈ کی راجدھانی دہرہ دون میں سیاسی پارٹیوں کی زبردست احتجاج کو قابو میں کرنے کے لئے ریاستی حکومت نے فوج کے گھوڑ سواروں کی مدد طلب کر لی۔ گھوڑوں کی فوج میں مشہور و معروف گھوڑا ''شکتی مان'' بھی شامل تھا۔ فوج کا یہ سفید رنگ کا خوبصورت گھوڑا اپنی تیز رفتاری اور دیگر خصوصیات کی وجہ سے پورے صوبہ میں مشہور تھا۔ ۲۶ رجنوری اور ۱۵ راگست کے دلکش پروگرام میں ''شکتی مان'' نامی گھوڑا سب سے آگے رہتا تھا۔ دہرہ دون میں زبردست بھیڑ کو کنٹرول کرنے کے لئے ''شکتی مان'' کو استعمال کیا گیا مگر کسی شرارتی شخص نے اس کے پیروں پر ایسی لاٹھی ماری کے اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ''شکتی مان'' بہت قیمتی گھوڑا تھا اس کے علاج کے لئے امریکہ سے جانوروں کی ایک ماہر ڈاکٹر تشریف لائیں، مگر مجبوراً اس کا پیر کاٹنا پڑا۔ امریکن ڈاکٹر نے مصنوعی پیر لگایا پھر بھی ''شکتی مان'' جانبر نہ ہو سکا۔ ۲۰ راپریل ۱۶ء کو اُسے باعزت طریقہ سے فوجی احترام کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ اس کی قبر پر اُتراکھنڈ کے سابق وزیر اعلیٰ ہریش راوت نے پھول چڑھائے۔ اس کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ رخصت کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی گئی۔

ایک جانور کی دردناک موت کی تفصیل کے بعد میں ایک ایسے انسان کی دل کو دہلانے والی قتل کی داستان بیان کر رہا ہوں جو ہندوستانی تاریخ میں ایک بہت بڑے المیہ کے طور پر درج کیا گیا۔ دہلی سے محض پچاس کلومیٹر دُور ایک گاؤں دادری ہے۔ دادری بہت ترقی یافتہ گاؤں کے طور پر جانا جاتا ہے۔ محمد اخلاق نامی ایک شخص جو پیشہ سے لوہار کا کام کرتا تھا، اپنے خاندان کے ساتھ بڑے سکون کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا ہندوستانی فوج کا بہادر سپاہی تھا۔ ایک رات جب سارا گاؤں نیند کی غفلت میں تھا، مندر کے لاؤڈ اسپیکر سے ایک غیر معمولی اعلان ہوا۔

''بھائیو...... اخلاق کے گھر میں بیف کھایا گیا ہے اور اس کے فریج میں بھی رکھا ہوا ہے''۔

اس اعلان کو سنتے ہی گاؤں کے ہر گھر کے دروازے کھل گئے اور سیکڑوں کی تعداد میں لوگوں نے نعرہ لگاتے ہوئے اخلاق کے گھر پر حملہ کر دیا۔ اس کے گھر کا لوہے کا مین گیٹ توڑ کر مجمع گھر میں داخل ہو گیا۔ حملہ آوروں نے سوتے ہوئے اخلاق کو مارنا شروع کیا۔ پورے گھر میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ گھر کی خواتین اور بچے چیخنے چلانے لگے۔ مدد کی درخواست کی مگر فرقہ پرست مجمع پر جنون سوار تھا، لہٰذا اخلاق کو سلائی مشین سے پیٹ کر مار ڈالا گیا۔ سوشل میڈیا پر اس انسانیت سوز واقعہ کو پوری دُنیا نے دیکھا۔ پولیس نے اخلاق کے فریج میں رکھے گوشت کو لیبوریٹری جانچ کروایا جس کی رپورٹ آئی کہ بکرے کا میٹ ہے۔ بیف نہیں۔ افواہ پھیلا کر ایک بے گناہ کا بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔ مرنے کے بعد اخلاق کو دہرہ دون کے فوجی گھوڑے ''شکتی مان'' کی طرح نہ عزت ملی اور نہ کسی سیاسی نمائندہ نے اس کی قبر پر پھول چڑھائے۔ ہمارے بہت عظیم ملک ہندوستان میں انسانوں کے مقابلہ جانوروں کی زیادہ قدر و منزلت ہے۔ کاش! اخلاق بھی جانور ہوتا۔

......☆......

ڈھابہ

میری بیگم نے کہا کہ کہیں رُک کر ناشتہ کرلیں، بہت سویرے ہی گھر سے نکلے ہیں۔

"اچھا ابھی کسی ڈھابے پر رُکتے ہیں"۔ میں نے جواب دیا۔

"ارے ہٹئے...... آپ بھی مذاق کرنے لگے۔ امریکہ میں ڈھابہ"؟

"جی ہاں محترمہ...... ہندوستان ڈھابے کی طرح امریکہ کے ہائی وے پر بھی ڈھابے ہیں، جسے واش روم کہتے ہیں"۔

"تب پھر چلئے"...... بیگم نے کہا۔

ہم سب امریکہ کے شہر شکاگو سے بذریعہ سڑک نیویارک جارہے تھے۔ سفر بہت ہی لمبا تھا، فلائٹ سے کم وقت میں پہنچا جاسکتا تھا، مگر امریکہ کے دیہی علاقوں کی زندگی کا بھی لطف اٹھانا مقصد تھا۔ لہٰذا طے ہوا کہ بذریعہ کار آٹھ گھنٹے کا سفر کریں گے۔ لمبے سفر پر نکلنے والوں کو راستہ میں جو سب سے پر کشش مقام دکھائی دیتا ہے وہ ڈھابہ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ہزاروں کلومیٹر کے سفر پر نکلنے والے ٹرک کے ڈرائیوران ہی ڈھابوں پر رُک کر خورد نوش کے بعد آرام کرتے ہیں جس کے لئے ڈھابہ کے مالکان چار پائیاں مع تکیہ اور چادر کے مہیا کراتے ہیں۔ ایک بڑے سے ٹب میں پانی بھرا ہوتا ہے اور ڈونگا رکھا رہتا ہے۔ ڈرائیور ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھاتے ہیں اور ان ہی چار پائیوں پر لیٹ کر آرام کرتے ہیں۔

ایسے ڈھابہ پر جب کوئی کار رکتی ہے تو ان کی سواریوں کے لئے ڈھابہ کے اندر میز کرسی کا اہتمام ہوتا ہے۔ جہاں بیٹھ کر سواریاں چائے سموسے پکوڑے وغیرہ کھاتے ہیں اور کولڈ رنک پیتے ہیں۔ آدھا پون گھنٹہ گزار کر پھر اپنی منزل مقصود کے لئے روانہ ہوجاتے ہیں۔ کسی بھی ہائی وے پر بنے ان ڈھابوں کی بڑی اہمیت ہے۔ لمبے سفر پر تھوڑی دیر آرام کرنے کا یہ واحد ذریعہ ہیں۔

''ارے وہ سائن بورڈ پڑھئے''۔ میری بیگم نے میری توجہ ایک سائن بورڈ کی طرف دلائی جس پر تحریر تھا...... ''اگلا واش روم یہاں سے دو میل آگے ہے''۔

''بیگم صاحبہ...... یہ امریکہ ہے، یہاں سے دو میل پر واش روم ہے جس کو ہم ہندوستان میں ڈھابہ کہتے ہیں''۔ میں نے کہا۔ ''ہاتھ منھ دھو کر تروتازہ ہو جایئے''۔

امریکن ہائی وے کے جس واش روم پر ہم رُکے وہ بہت ہی خوبصورت جگہ تھی۔ بیٹھنے کے لئے ہال میں میز اور کرسیاں آراستہ تھیں۔ عورتوں اور مردوں کے لئے علاحدہ باتھ روم بنے ہوئے تھے۔ مرکزی ہال کا خودکار دروازہ خوبصورت شیشہ کا بنا ہوا تھا۔ کھانے کی اشیاء بہت صاف ستھری تھیں۔ ہم سب نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق کھانے کی اشیاء خریدیں اور خود کاؤنٹر سے لے کر ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ واش روم کی خوبصورت عمارت کے چاروں طرف بہت ہریالی تھی۔ گھنے پیڑوں سے گھری ہوئی تھی۔ یہ عمارت بڑی پُرسکون جگہ پر واقع تھی۔ امریکہ کی سب سے بڑی خوبصورتی اس کی ہریالی ہے۔

''لمبی ڈرائنگ پر نکلنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ واش روم ایسی جگہ بنائے جائیں جہاں مسافروں کو چند لمحے سکون سے گزریں اور وہ دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں''۔ میں نے کہا ''میرا خیال ہے کہ اپنے ملک ہندوستان میں بھی ڈھابے پُرسکون جگہ پر ہیں''۔

''تم نے درست کہا''۔ بیگم بولیں۔ ''تمہیں یاد ہے ہم ایک بار کشمیر سے کنیا کماری تک کی لمبی ڈرائیو پر نکلے تھے اور طے کیا تھا کہ فلاں فلاں ڈھابے پر رک کر کھانا کھائیں گے''۔

''جی ہاں مجھے یاد ہے۔ راستے میں ہر ڈھابے کے قریب ایک سائن بورڈ دیکھا تھا۔ ناصر کا پُرسکون ڈھابہ یہاں سے چھ کلومیٹر دُور ہے۔ راستے بھر ہم ناصر کے ڈھابے کا اشتہار دیکھتے رہے۔ بیگم نے کہا۔

''اور ہم کو چند کلومیٹر کے بعد اشتہار نظر سے گزرتا کہ ''ناصر کا یہ پُرسکون ڈھابہ'' میں نے بیگم سے کہا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میلوں یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ ہم سرینگر کی سرحد میں

داخل ہو گئے۔ ہم بیحد خوش تھے کہ آخر ناصر کا ڈھابہ آ ہی گیا۔ دل بے چین تھا کہ ڈھابہ پر اپنا حلیہ درست کرنے کا موق مل جائے گا۔

ناصر کے ڈھابہ کے کاؤنٹر پر بیٹھے ناصر صاحب اونگھ رہے تھے۔ ان کے قریب جلتے ہوئے کوئلے کی بھٹی تھی، جس پر المونیم کی ایک کیتلی میں چائے کا پانی کھول رہا تھا۔ کیتلی کی ٹونٹی سے کھولتے ہوئے پانی کا بھاپ نکل رہا تھا۔ ناصر صاحب نے ناک بھوں چڑھا کر اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر اونگھنے میں مشغول ہو گئے۔

''ناصر صاحب...... ہم بہت دُور سے آئے ہیں۔ آپ کے مشہور و معروف ڈھابے کی شہرت چاروں طرف ہے'' ...... ناصر صاحب بمشکل تھوڑا مسکرائے اور فرمایا: آپ کا خیر مقدم ہے، ہم اپنے مہمانوں کی خاطر میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ آج اتفاق سے دودھ پھٹ گیا ہے''۔

''دودھ پھٹ گیا ہے......'' میری بیگم نے پوچھا۔ ''پھر ہمیں آپ چائے کیسے پلائیں گے''۔

''بغیر دودھ کی چائے بھی اچھی ہوتی ہے''۔ ناصر بولے۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر''۔ میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ وہ درمیان ہی میں بولے ''دیکھئے نوکر شکر لینے بازار گیا ہے''۔

''یعنی شکر بھی نہیں ہے''۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔

''جی...... بس نوکر آتا ہی ہوگا، بازار سے شکر لے کر''۔ ناصر نے کہا۔

''کتنی دُور ہے بازار''؟ میں نے دریافت کیا۔

''یہی کوئی آٹھ کلومیٹر...... ایک گھنٹہ میں آجائے گا۔ سائیکل سے گیا ہے''۔

''ایکس کیوزمی......'' واش روم کی گوری صفائی والی عورت نے میرے پیر کی طرف اشارہ کر کے کہا تو میں نے چونک کر اپنا پیر ہٹا لیا تا کہ وہ فرش کو صاف کر سکے۔

''آپ کہاں کھو گئے تھے''؟ بیگم نے میری بے خیالی دیکھ کر پوچھا۔

''بیگم...... میں اس وقت کشمیر کے ناصر کے ڈھابہ میں تھا جن کے یہاں دودھ پھٹ گیا

تھا اور نوکر سائیکل سے آٹھ کلومیٹر دُور بازار سے شکر لینے گیا تھا۔ میں نے انہیں یاد دلایا۔ ''یاد ہے وہ سفر''، ہم دونوں ہنسنے لگے۔

امریکن ڈھابہ جسے ''واش روم'' کہتے ہیں بہت خوبصورت صاف ستھرے اور اور آرام دہ ہیں۔ یہاں کھانے پینے کے علاوہ عیش کا سامان بھی مہیا ہوتا ہے۔ میں نے واش روم کے مخالف سڑک کی طرف اشارہ کر کے بیگم کو بتایا۔ ''دیکھو۔ بہت اُونچے مینار پر ایک بورڈ لگا ہوا ہے جو کئی میل دُور سے دکھائی دیتا ہے۔ جانتی ہو یہ کیا ہے؟ انہوں نے سوال کیا۔ کیا ہے؟...... بتایئے؟''

''بورڈ پر تحریر ہے......ایڈلٹ ویڈیو۔ آپ کی تفریح کے لئے''۔

''کیا مطلب...... میں سمجھی نہیں''۔ بیگم نے پوچھا۔ ''بالغ مردوں کے لئے فحش ویڈیو کلب۔ دراصل عیاشی کے یہ اڈّے ان ٹرک ڈرائیوروں کے لئے ہیں جو ٹرین کے کمپارٹمنٹ کے برابر کے ٹرک پر ہزاروں ٹن سامان لے کر دُور دراز کے شہروں کے سفر پر نکلتے ہیں، اپنے گھر اور خاندان سے ہفتہ عشرہ کے لئے دُور رہتے ہیں''۔ میں نے بیگم کو بتایا۔

''خاندان سے دُور رہتے ہیں تو فحش ویڈیو دیکھتے ہیں''۔ بیگم نے کہا۔

''ہاں۔ یہ گورے ڈرائیور اس کلب میں عیاشی کرتے ہیں''۔ میں نے بتایا تو بیگم نے لاحول پڑھا۔

''بھئی دیکھئے یہ امریکہ ہے۔ جہاں کھلی سوسائٹی ہے۔ ہائی وے پر ایسے کلب لمبے سفر پر نکلے ٹرک ڈرائیوروں کی دل بستگی کا سامان مہیا کرتے ہیں''۔ میں نے کہا۔

''لعنت بھیجئے۔ ایسی دل بستگی پر، چلئے اب چلتے ہیں''۔

''چلو''...... ہم واش روم کے ہال سے نکل کر اپنی گاڑی کے پاس آئے۔ چاروں طرف کا معائنہ کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ کے ڈھابے بہت ہی آرام دہ، خوبصورت اور صاف ستھرے ہیں جہاں تھوڑی دیر بیٹھ کر قلبی سکون حاصل ہوتا ہے۔ لمبے سفر کی تھکان دُور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ واش روم میں تھوڑا وقت گزار کر آگے کا سفر جاری رکھا جائے۔

......☆......

یتیم

فہیم کو ہمیشہ اس بات کا غم دامن گیر رہا کہ وہ پیدائشی یتیم ہے۔ جب وہ اپنی ماں کے شکم میں تھا اس کے والد کا ایک حادثہ میں انتقال ہو گیا تھا۔ بچپن میں اسے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ اس کے والد اس دُنیا میں نہیں ہیں مگر جیسے جیسے اس نے ہوش سنبھالا اسے اپنے والد کی کمی کا احساس ہونے لگا۔ جب وہ اپنے ہم عمر بچوں کو اپنے ڈیڈی کی اُنگلیاں پکڑ کر پارک میں گھومتے ہوئے دیکھتا تو اس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی۔ وہ ایک عجیب طرح کی بے چینی محسوس کرتا جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ چونکہ اس نے اپنے والد کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ لہٰذا اپنی امی کے بتائے ہوئے والد کی شکل و شباہت کے ہر شخص میں اپنے والد کو تصور کی آنکھوں سے دیکھتا اور خوش ہوتا۔ قدرت کا یہ نظام ہے کہ بچہ جب آنکھ کھولتا ہے تو سب سے پہلے اپنی ماں کو دیکھتا ہے۔ ماں جو اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے، اس کی معمولی سی تکلیف پر بے چین ہو جاتی ہے۔ جاڑے کے دنوں میں جب کہ سخت ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں، بیٹے کے گیلے بستر پر خود سو کر خشک بستر پر اپنے لختِ جگر کو سُلاتی ہے۔ ایسی جان دینے والی ہستی دُنیا میں سوائے ماں کے کوئی دوسری نہیں ہے۔ ماں وہ نایاب ہستی ہے جس کے بارے میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ماں کے پیروں تلے جنت ہے۔ قرآن کی بے شمار آیتوں میں والدین کا ذکر آیا ہے کہ ان کو "اُف" تک نہ کہو۔ باپ کے مرتبہ کے بارے میں حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ دُنیا میں باپ ہی صرف ایک ایسی ہستی ہے جو چاہتی ہے کہ میرے بچے مجھ سے زیادہ ترقی کریں اور کامیاب ہوں۔

قدرت کا کچھ ایسا نظام ہے کہ عورت کے اندر اس نے بے مثال صلاحیت پوشیدہ رکھی ہیں۔ نامساعد حالات کے تقاضے کے مطابق خود کو ڈھال لیتی ہے۔ کبھی کبھی ان تقاضوں کی فراہمی کے لئے وہ یتیم بیٹے کی باپ بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خوبی صرف عورت کو ہی عطا کی ہے۔

ایسی ہی بے مثال خوبیوں کی مالک تھیں فہیم کی ماں رشیدہ بیگم۔

فہیم کی ماں نے اپنے مرحوم شوہر کی پینشن سے اس کی تعلیم جاری رکھی اور طویل جدو جہد کے بعد ایک دن فہیم بھی اپنے والد مرحوم کی طرح انجینئر ہو گیا، مگر پہلی نوکری گھر سے کافی دُور بنگلور میں ملی۔ وہ اپنی ماں رشیدہ بیگم کی تنہائی کی وجہ سے پش و پیش میں تھا کہ جوائن کرے یا نہ کرے، مگر رشیدہ نے کہا۔

''بیٹا...... بڑی تعلیم حاصل کی ہے تو بڑی نوکری بڑے شہر میں ہی ملے گی۔ تم میرے لئے قطعی پریشان نہ ہو، میں حالات سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں''۔

فہیم اپنے جاب پر چلا گیا اور رشیدہ نے اس بھانجی زرینہ کو اپنے پاس بلا لیا۔ زرینہ کے شوہر کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب اس کی بارات واپس لوٹ رہی تھی کہ اس کی کار ایک تیز رفتار ٹرک سے ٹکرائی۔ زرینہ تو بچ گئی مگر دولہے کی جائے حادثہ پر ہی موت ہو گئی۔ زرینہ نام کی دلہن بنی اور سسرال پہنچنے سے قبل ہی بیوہ ہو گئی۔ پھر اس نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنی خالہ رشیدہ کے پاس آ کر اسے بیحد سکون ملا۔ گھر کا سارا انظام رشیدہ نے زرینہ کے حوالے کر دیا اور خود صرف عبادت میں وقت گزارنے لگیں۔ زرینہ نے بڑی خوش اسلوبی سے صبح ناشتہ سے رات کے ڈِنر تک کام کرنے کا خوبصورت اصول بنا لیا۔ صاف ستھرے گھر کو دیکھ کر ہر شخص خوشی کا اظہار کرتا اور زرینہ کی خوبیوں کی تعریف کرتا۔

فہیم جب گھر آیا تو بیحد خوش ہوا، خاص طور سے زرینہ باجی کا اس کی ماں کے ساتھ رویہ دیکھ کر اسے بہت اطمینان حاصل ہوا۔ رشیدہ نے فہیم پر شادی کرنے کا دباؤ ڈالا جیسا کہ ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے کہ کب بہو آئے اور گھر کے آنگن میں پوتے پوتیوں کی دوڑ دھوپ سے گھر کی رونق میں اضافہ ہو۔

فہیم نے اپنی پسند کی لڑکی کا ذکر کیا جو اس کی آفس کی ساتھی تھی۔ لہٰذا عمرانہ سے خوب دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔ رشیدہ کو اطمینان ہو گیا زرینہ اپنے گھر واپس چلی گئی۔ لہٰذا جب گھر کے

کاموں کی ذمہ داری پڑی تو عمرانہ نے کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ فہیم نے اس سے کہا۔

''جب تک ہم یہاں رہیں گے گھر کا کام تو تم کو سنبھالنا ہی پڑے گا''۔

''مگر معاف کرنا میں یہ نہیں کر سکتی''۔ عمرانہ نے صاف جواب دے دیا۔

''کیوں نہیں کر سکتی......؟ یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ اپنا کام ہے اپنے گھر کا کام ہے''۔

''تو بہتر یہ ہے کہ تم کسی ''کام والی'' سے شادی کر لو''۔ عمرانہ نے کہا تو فہیم اور رشیدہ ہکّا بکّا رہ گئے۔ ''اور مجھے آزاد کر دو''۔ لہٰذا عمرانہ کو فہیم نے طلاق دے کر اپنی عمر سے دو برس بڑی خالہ زاد بیوہ بہن زرینہ سے نکاح کر لیا۔ رشیدہ کو اطمینان ہو گیا۔ وہ اپنی بھانجی اور بہو سے بے انتہا خوش تھیں۔ فہیم بھی خود کو بہت ہلکا محسوس کرنے لگا۔ زندگی بڑے مزے سے گزرنے لگی۔

کسی نے کہا کہ فہیم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تین سنتوں پر بیک وقت عمل کیا۔ اوّل حضرت خدیجہؓ کی طرح اپنی عمر سے بڑی لڑکی سے شادی کی جو اُن کی ہی طرح بیوہ تھی اور تیسرے وہ اس وقت یتیم ہوا جب اپنی والدہ رشیدہ بیگم کے شکم میں تھا۔

......☆......

کلر بلائنڈ

سروس کمیشن کا سخت امتحان جمیل نے بہ آسانی پاس کرلیا۔ وہ نہ صرف بہت محنتی تھا بلکہ خدا داد ذہانت کا مالک بھی تھا۔ سب نے اس کو مبارکباد دی مگر ابھی انٹرویو کا مرحلہ باقی تھا جسے اس نے اپنی ذہانت سے تین قابل ترین ممبران پر مشتمل پینل کو ہر سوال کا جواب دیا کہ ممبران اس کی معلوماتِ عامہ پر حیرت زدہ رہ گئے۔ خدا کا شکر کہ انٹرویو کا مرحلہ بھی بڑی خوبی سے گزر گیا۔ تقرری کا آخری مرحلہ ہوتا ہے۔ اُمیدوار کا میڈیکل ٹیسٹ جس کے بارے میں اسے پورا یقین تھا کہ وہ اس آخری مرحلہ سے بھی بخوبی گزر جائے گا، کیونکہ وہ نوجوان تھا اور ہر مرض سے پاک تھا۔ میڈیکل امتحان کے بعد جب وہ تقرری کا پروانہ حاصل کرنے پہنچا تو کامیاب امیدواروں کی لسٹ میں اپنا نام نہ دیکھ کر اس کے پیروں تلے زمین کھسک گئی وہ حواس باختہ دفتر کے بابو سے ملا جو ان تمام مرحلوں کا ذمہ دار تھا۔ بابو نے اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس کی تقرری اس لئے نہیں ہوئی کہ وہ ''کلر بلائنڈ'' ہے یعنی رنگوں کو پہچاننے سے صلاحیت سے قدرتی طور پر محروم ہے۔ جمیل نے معاملہ پر غور کیا اس کی ذہانت کے دروازے کھلے اور چند لمحوں میں سارا ماجرہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ ہوا یوں تھا کہ اس زمانہ میں میڈیکل ٹیسٹ کی فیس ۳۵ روپیہ تھی، یہی بابو سب سے پچاس روپے لے رہا تھا۔ جمیل نے سو روپے کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھایا اور پچاس روپے واپس مانگ لئے جو اس بابو کو بُرا لگا اور اس کی ناراضگی اس کی بھوؤں سے ظاہر ہوگئی تھی، اس کی ناکامی بابو کی ناراضگی کا نتیجہ تھا۔

جس ڈاکٹر نے اس کا میڈیکل ٹیسٹ کیا تھا اس کی ذاتی کلینک بھی تھی جسے وہ اپنے گھر سے چلا رہا تھا۔ کلیم نے وقت نہ ملنے کی وجہ سے اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کو کلین شیو کیا اور دو سو روپے فیس دے کر اس ماہر امراضِ چشم سے ٹیسٹ کرایا اور اس کی بات کی سند حاصل کرلی کہ وہ ''کلر بلائنڈ'' نہیں ہے۔ دفتر کے بابو اور ڈاکٹر نے اپنے دستخط شدہ دو میڈیکل سندیں دیکھیں تو حیرت زدہ رہ

گئے۔ انہوں نے بھی معاملہ کو بھانپ لیا اور اسی وقت اس کو تقرری کا پروانہ تھما دیا گیا۔ مگر جمیل نے عہد کر لیا کہ زندگی میں آئندہ کبھی رشوت نہ دینے کی غلطی نہیں کرے گا۔

جس زمانہ میں جمیل کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا گھوش بابو ریلوے کے ڈرائنگ آفس کے انچارج تھے، ڈرائنگ آفس میں اسٹیشنوں پر لگے سگنل کے نقشے تیار کئے جاتے تھے۔ ان نقشوں میں مجوزہ کام کو لال رنگ سے دکھایا جاتا تھا۔ اسی طرح مستقبل میں لاگو ہونے والے کاموں کو ہرے رنگ سے اور توڑے جانے والے حصّوں کو پیلے رنگ سے دکھایا جاتا تھا۔ ایک اوریجنل ڈرائنگ کی سیکڑوں فیرو پرنٹ مشینوں سے تیار کی جاتی تھیں جنہیں سائٹ پر کام کرنے کے لئے بھیجنے سے قبل ہر کاپی کو کلر پنسل سے کلر کیا جاتا تھا۔ یہ کام دقّت طلب اور خشک نوعیت کا تھا، لہٰذا ڈرائنگ آفس کے ملازمین اس خشک کام کرنے سے کتراتے تھے، مگر دقّت یہ تھی کہ بغیر رنگے نقشوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ان کا رنگنا ضروری تھا۔

گھوش بابو کے ماتحت ایک ملازم جسے عرف عام میں لوگ 'لالا' کے نام سے پکارتے تھے۔ نقشوں کے کلرنگ سے نہ صرف کتراتا بلکہ انکار بھی کر دیا کرتا تھا، مگر جب اس پر دفتری نظام کے تحت لکھ کر دیا گیا تو اس نے ایک ایسا راستہ اختیار کیا کہ دفتر میں سب کے منھ کھلے کے کھلے رہ گئے اور ہاتھ پیر پھول گئے۔

لالا نے ریلوے ڈاکٹر کے ذریعہ جاری کیا ہوا ایک میڈیکل سرٹیفکٹ پیش کیا کہ وہ کلر بلائنڈ ہے، یعنی رنگوں کو پہچاننے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ ڈاکٹر کے ذریعہ دیئے ہوئے سند کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے ریٹائرمنٹ تک نقشوں کو کلر کرنے سے بچ گیا۔ دفتر میں کسی کو یقین نہیں آیا کہ وہ کلر بلائنڈ ہے...... مگر سب مجبور تھے کہ اس سے رنگنے کا کام نہ لیں۔ ایک اسٹاف نے گھوش بابو کے کان میں آہستہ سے کہا کہ صاحب لالا نے ڈاکٹر کو رشوت دے کر کلر بلائنڈ کی سند حاصل کی ہے۔ جمیل کو فیس دے کر اس بات کی سند لینی پڑی تھی کہ وہ کلر بلائنڈ نہیں ہے جبکہ لالا نے ڈاکٹر کو رشوت دے کر سند حاصل کی وہ کلر بلائنڈ ہے۔

جنوبی ہند کا سفرنامہ

ہندوستان کی پہلی مسجد کی تعمیر کی تفصیل کچھ اس طرح محکمہ آثارِ قدیمہ کے ریکارڈ میں باضابطہ درج ہے کہ کیرالا کا شہر کوڈنگلور (Kodungallur) راجہ چیرامن پیرومل کی راجدھانی تھی۔ ایک رات راجہ پیرومل نے ایک غیر معمولی خواب دیکھا کہ چاند دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ اچانک وہ نیند سے بیدار ہو گیا، اس نے چاند کو دو حصوں میں تقسیم ہوتے ایسے دیکھا جیسے انسان اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ راجہ بیحد پریشان ہوا۔ اس کی ساری رت جاگتے ہوئے اور بے چینی کے عالم میں گزری۔ اس نے اپنے درباری نجومیوں کو طلب کیا اور ان سے اپنے خواب کی تعبیر معلوم کرنے کا حکم صادر فرمایا مگر کوئی بھی نجومی تسلی بخش جواب نہیں دے سکا۔ راجہ کی بے چینی بڑھتی گئی، اس کا سکون چھن گیا، اور وہ بیحد اُداس اور پریشان رہنے لگا۔ کچھ دنوں بعد عرب کے کچھ سوداگران، جو سیلون جارہے تھے، راجہ چیرامن پیرومل سے ملاقات کی غرض سے دربار میں حاضر ہوئے۔ راجہ نے ان عرب سوداگران سے اپنے خواب کا ذکر کیا کہ میں نے آسمان میں چاند کے دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ انہوں نے راجہ کی بات کو بغور سنا اور راجہ کو قرآن کی آیت کا حوالہ دے کر 'شق القمر' کی تفصیل بتائی۔ انہوں نے بتایا کہ چاند کا دو ٹکڑے ہونا ہمارے پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ اس طرح فرماتا ہے:

''یہ وہ معجزہ ہے جو اہل مکہ کے مطالبہ پر دِکھایا گیا۔ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے حتیٰ کہ لوگوں نے حراء پہاڑ کو اس کے درمیان دیکھا، یعنی اس کا ایک ٹکڑا پہاڑ کے اس طرف اور اس کا دوسرا ٹکڑہ اس طرف ہو گیا''۔

راجہ چیرامن پیرومل ان کے جواب سے مطمئن ہو گیا، اس نے اس غیر معمولی واقعہ کو اپنی خوش نصیبی تصور کیا اور اپنی سعادت سمجھا۔ لہٰذا اس نے طے کیا کہ وہ اسلام قبول کرے گا۔ اس نے

اپنی ساری جائیداد کو مختلف مقامی تعلقداران کے درمیان تقسیم کردیا اور خفیہ طریقہ سے عرب کے شہر مکّہ مکرّمہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ مکّہ مکرّمہ پہنچ کر سرورِ کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوا اور اپنا اسلامی نام تاج الدین رکھا۔ راجہ پیرومل مکّہ مکرّمہ میں کئی سال رہا، اس نے ایک لمبے عرصہ قیام کے بعد وطن واپسی ارادہ کیا، مگر دورانِ سفر مختصر مدت کے لئے وہ علیل ہوا اور اومان کے شہر دوفار میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ انتقال سے قبل اس نے مالابار کے مقامی تعلقدار کے نام خط لکھ کر اپنے ایک معتبر دوست کے حوالے کر دیا۔ کافی عرصہ بعد مالک بن دینارؒ جب اپنے ساتھیوں کے ساتھ کوڈنگلور وارد ہوئے تو راجہ چیرامن پیرومل کا خط صاحبِ اقتدار تعلقدار کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے راجہ کی خواہش کے مطاق مختلف مقامات پر مساجد بنانے کی اجازت دے دی۔ کوڈنگلور میں تعمیر مسجد کو ہندوستان کی پہلی مسجد کا اعزاز حاصل ہوا۔ جس کے پہلے متوّلی خود حضرت مالک بن دینارؒ مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے اپنے ایک عزیز حبیب بن مالکؒ کو مسجد کا متوّلی مقرر کر کے خود کیرالہ صوبہ کے دورہ کے لئے روانہ ہو گئے اور جگہ جگہ مسجدیں تعمیر کروائیں۔ صوبہ کیرالا میں آج اسلام اور اسلامی تعلیمات کا عظیم الشان نظام نظر آرہا ہے۔ یہ سب ان ہی بزرگانِ دین کی کڑی محنت اور تبلیغ کا نتیجہ ہے۔ ان سب غیر معمولی واقعات نے مجھے جنوبی ہند کے دیگر مقامات کے سفر کی جانب راغب کیا۔

جنوبی ہندوستان کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی میری دل میں خواہش بیدار ہوئی۔ ستّر کی دہائی میں مجھے ریلوے سگنل انجینئرنگ کی ٹریننگ کے لئے جنوبی ہند کے شہر حیدرآباد بھیج دیا گیا۔ حیدرآباد جنوبی ہندوستان کے بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ کبھی نواب عثمان علی خاں کی ریاست ہوا کرتی تھی۔ نواب عثمان علی خاں والئی ریاست حیدرآباد کے وزیراعظم نواب سالارِ جنگ کو نادر اور نایاب اشیاء کو جمع کرنے کا بیحد شوق تھا۔ حیدرآباد شہر میں واقع سالارِ جنگ میوزیم ان کی اپنی ذاتی دلچسپی اور "ون مین کلکشن" کا نتیجہ ہے۔ سالارِ جنگ میوزیم دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کئی منزلہ عمارت میں ہر شعبۂ حیات کی نادر اور نایاب چیزوں کا ذخیرہ رکھا ہوا ہے۔ پینٹنگ کے شعبہ میں

سنگ مرمر کی بنی ایک برہنہ حسینہ کو اپنے پیروں میں چبھے کانٹے کو نکالتے ہوئے دکھایا گیا ہے، ناظرین کو ایسا لگتا ہے گویا وہ کانٹا نکلنے ہی والا ہے۔ غیر ملکی الھڑ حسینہ کی سفید سنگ مرمر کی اس حسینہ کے مجسّمے کو دیکھ کر بہتوں کے دِلوں میں کانٹے چبھنے لگتے ہیں۔ ایک سے ایک نایاب پینٹنگ دیکھ کر انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ گھڑیوں کے شعبہ کے وسیع کمرے میں ایک ایسی بھی گھڑی دیکھی جس کا دروازہ ہر گھنٹہ پر کھلتا، شیروانی ٹوپی میں ملبوس ایک بونا سا آدمی اندر سے نکلتا اور گھنٹہ مار کر واپس گھڑی کے اندر چلا جاتا ہے، دروازہ خود بخود بند ہو جاتا ہے۔ دن کے بارہ بجے وہ کمرہ سیاحوں سے بھر جاتا ہے جب ٹھیک بارہ بجے گھڑی سے نکل کر وہ آدمی بارہ بار گھنٹے پر اپنا بھاری ہتھوڑہ مارتا ہے اور ناظرین محظوظ ہوتے ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی ملک کی بڑی یونیورسٹیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ جو بہت بڑے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک فیکلٹی سے دوسری فیکلٹی جانے کے لئے بسوں کا انتظام ہے۔ حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی بھی قابل دید ہے۔ حیدرآباد کی تیسری بڑی اہم جگہ جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے وہ ہے گول کنڈہ۔ گول گنڈہ کا محل اور اس کی ہزاروں سال پرانی عمارتیں حیدرآباد شہر سے تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہیں۔ زمین سے ہزاروں فٹ اُونچائی پر تعمیر محل قابل دید ہی نہیں بلکہ حیرت میں ڈالنے والی ہے۔ محل کا مرکزی دروازہ جو زمینی سطح پر ہے اس کے سامنے لوہے کا ایک گول چبوترا ہے جس پر کھڑے ہو کر تالی بجانے سے تالی کی آواز میلوں دُور اُونچی پہاڑی پر بنے محل تک صاف سنائی دیتی ہے۔ انسان کو حیرت میں ڈالنے والی بات ہے۔

میرا مقصد جنوبی ہندوستان کے بادشاہوں کے تعمیر کردہ نہ محلوں کو دیکھنا تھا نہ چار مینار، نہ حسین ساگر نہ میوزیم اور نہ شہر کی سب سے بڑی یونیورسٹی کی زیارت کرنا میرا مقصد تھا، بلکہ میں جنوبی ہند میں عربوں کے ذریعہ اسلام کا پھیلنا اور ان کی تعلیمات کا عام ہونا دیکھنے کا خواہش مند تھا، لہٰذا میں نے جنوبی ہند میں واقع کبھی فرینچ کالونی رہی، مرکزی صوبہ 'پانڈیچیری' جانے کا قصد کیا۔ حیدرآباد سے بذریعہ ٹرین مدراس کے چھوٹی لائن کے اسٹیشن اِگمور (IGMORE) سے

رامیشورم ایکسپریس سے پانڈیچیری کے لئے روانہ ہوگیا۔ رامیشورم سے قبل ایک جنکشن پر مجھے پانڈیچیری کے شہر کاریکل (KARAEKAL) کے لئے ٹرین تبدیل کرنی پڑی۔ ستر کی دہائی یعنی جولائی ۱۹۷۵ میں کاریکل شہر پہنچ گیا، جہاں میرے بھانجے جمیل احمد صدیقی آئل اینڈ نیچرل گیس کمیشن یعنی ONGC میں ملازم تھے۔ کاریکل سمندر کے کنارے بسا ہوا بہت ہی خوبصورت شہر ہے۔ کبھی یہ صوبہ "فرنچ کالونی" کہلاتا تھا۔ فرانسیسیوں کا اس پر قبضہ تھا اور پورے پانڈیچیری کی طرز تعمیرات پر فرانس کی چھاپ واضح دکھائی دیتی ہے۔ رُک رُک کر وہاں روز بارش کا معمول ہے، مگر شہر کو فرانسیسیوں نے اس طرح بسایا تھا کہ بارش کے باوجود آپ پورے شہر کا چکّر لگا کر آئیں مگر آپ پر بارش کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ شہر کی بناوٹ کچھ اس طرح کی ہے کہ ہر مکان اور دُکان کے سامنے دس فٹ کا ورانڈا یعنی دالان ہے۔ درمیان میں اگر سڑک گزر رہی ہے تو تیز رفتار سے پار کر کے آپ دوسرے دالان میں داخل ہو کر بارش سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

کریکل شہر کا ریلوے اسٹیشن ٹرمنل اسٹیشن ہے جو سمندر سے بیس پچیّس میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ سمندر اور ریلوے اسٹیشن کے درمیان ایک سڑک ہے جس پر سمندر کی لہروں کو دن میں کئی بار آتی جاتی رہتی ہے۔ اسٹیشن یارڈ میں اور کبھی کبھی اسٹیشن ماسٹر کے کمرہ تک سمندر کی تیز لہریں آجاتی ہیں اور چند لمحوں کے بعد واپس چلی جاتی ہیں۔

سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ کاریکل شہر کی ہر سڑک کے نام فرنچ اور انگریزی میں لکھے ہوئے دیکھے۔ فرانسیسی زبان سے ہر کس و ناکس واقف نظر آیا۔ ملی جلی آبادی پر مشتمل کاریکل میں مذہبی طور پر غیر معمولی رواداری کا مظاہرہ دیکھنے کو ملا۔ ہندو اور مسلمانوں کی زبان ایک، لباس ایک، شکل وصورت سے بھی شناخت مشکل، کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم۔ سب کی شکلیں ایک جیسی اور زبان تیلگو۔ میری آمد سے قبل اس مرکزی صوبہ کے وزیر اعلیٰ جناب ایم۔ ایچ او۔ فاروق رہ چکے تھے۔ دونوں قوموں میں زبردست اتحاد دیکھنے کو ملا۔ کسی طرح کی کوئی تفریق نظر نہیں آئی۔ ہر شخص کھلے دل سے ملاقات کرتا تھا۔ عوام میں جوتا پہننے کا رواج نہیں تھا۔ نوّے فیصد لوگ

بہترین خوبصورت شرٹ اور قیمتی لنگی میں ملبوس ننگے پیر نظر آئے۔ چند لوگوں کو ہوائی چپل پہنے پایا۔ کنواری لڑکیاں بلاؤز اور گھاگھرا پہنے ننگے پیر اسکول جاتی نظر آئیں۔ شادی شدہ عورتیں ساڑی بلاؤز میں دکھائی دیں۔ اسی فرق سے کنواری اور شادی شدہ عورتوں کی پہچان ہوتی ہے۔

فرانسیسیوں کے عہدِ حکومت میں پانڈیچری صوبہ میں شہر قاضی کا نظام نافذ ہوا تھا جو آزادی کے بعد بھی برقرار تھا۔ شہر قاضی کو حکومت کی جانب سے غیر معمولی اختیارات حاصل تھے، جس طرح کسی حکمراں کو حاصل ہوتے ہیں۔ کاریکل شہر کے قاضی ''شیش محل'' میں رہتے تھے۔ شیش محل حقیقتاً ایک محل تھا اور بڑی عالیشان وانتہائی خوبصورت عمارت تھی۔ بہت بڑے رقبہ میں پھیلا ہوا شیش محل فرانسیسیوں کے ملک سے چلے جانے کے بعد آباد تھا جس میں قاضی صاحب اور ان کے خاندان کے افراد کے علاوہ درجنوں ملازمین کا قیام تھا۔ ان کی عزت اور احترام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایک تعلقدار کو جو مراعات حاصل ہوتی ہیں وہ سب ان کو نصیب تھیں۔ شہر قاضی کی ذاتی دعوت پر ہم ان کی قیام گاہ شیش محل گئے۔ قاضی صاحب شریعت کے پابند اور اسلامی امور پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنی زندگی کے حالات اور فرانسیسیوں کے گہرے تعلقات کا ذکر کیا۔ انہوں نے اس بات کا انکشاف کیا کہ فرانسیسیوں نے قاضی صاحب کو کھلی دعوت دی تھی کہ وہ اپنے خاندان، پورے ساز وسامان کے ساتھ فرانس منتقل ہو جائیں، جہاں ان کو وہ سب سہولیات، مراعات دی جائیں گی جو اُن کو یہاں میسّر ہیں۔ دینی اور دُنیاوی نقطۂ نظر سے تمام باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد انہوں نے فرانسیسیوں کی دعوت ٹھکرا دی اور پانڈیچری کے شہر کاریکل میں رہنا پسند کیا۔

شیش محل میں داخل ہونے کے بعد حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ زندگی میں اس سے قبل میں نے کسی اتنی عظیم الشان عمارت کو نہیں دیکھا تھا۔ شیش محل کی تعمیر کچھ اس طرح کی تھی کہ دیواروں کے علاوہ چھتوں پر بھی آئینے کے ٹکڑے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے۔ محل میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ فرش پر اُٹھنا، بیٹھنا اور سونا وہاں کا عام رواج تھا۔ بڑا ہال جسے ہم ڈرائنگ روم کہہ سکتے ہیں، اس میں فرش پر بیٹھ کر ہم محو گفتگو تھے۔ ہر دیوار پر لگے بڑے بڑے آئینہ میں ہم خود

اپنی تصویر دیکھ رہے تھے اور چھت پر لگے سیکڑوں آئینے میں سب کی صاف تصویریں دکھائی دے رہی تھیں۔ بالکل ایسا ہی منظر میں نے فلم ''مغل اعظم'' میں دیکھا تھا جس میں انارکلی، شہزادہ سلیم اور شہنشاہ اکبر کی تصویریں چھت پر لگے آئینے میں دکھائی گئی تھیں۔ بہت ممکن ہے کہ فلم ساز کے آصف نے ''مغل اعظم'' فلم کے اس غیر معمولی منظر کا آئیڈیا شیش محل سے متاثر ہو کر لیا ہو کیونکہ یہ محل فرانسیوں نے سیکڑوں سال قبل تعمیر کیا تھا۔

قاضی صاحب تعلیم کے سلسلہ میں بہت فکر مند نظر آئے۔ ان کے مطابق اُمت صرف تعلیم حاصل کر کے ہی ترقی یافتہ قوم کے زمرے میں شامل ہو سکتی ہے۔ آبادی کے لحاظ سے کاریکل شہر میں اسکول اور کالجوں کی تعداد زیادہ تھی اور ہر شخص کو پڑھنے کا شوق نظر آیا۔ شیش محل میں ہماری دعوت کی خوبی یہ تھی کہ مرغ و ماہی کو صرف چاول کے ساتھ ہی نوش فرمانا پڑا۔ پانڈیچری صوبہ چاول کی پیداوار میں سب سے آگے تھا، ویسے بھی وہاں روٹی کھانے کا تصور نہیں تھا۔ عوام کی محبوب غذا چاول ہے جسے وہ کئی شکل میں استعمال کرتے ہیں۔ سادہ چاول کے علاوہ اڈلی ڈوسہ کھانے کا عام رواج ہے۔ ایک طرح سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ چاول ہی زندگی ہے۔

کاریکل شہر سے تقریباً بیس کلومیٹر دور جنوبی ہند کا بہت ہی مقبول شہر سمندر کے کنارے آباد ہے جسے ناگور کہتے ہیں۔ مذہبی اعتبار سے پانڈیچری صوبہ کا یہ شہر بہت اہمیت کا حامل ہے جہاں عرب سے صحابہ کرامؓ تشریف لائے اور ہمیشہ کے لئے مقیم ہو گئے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کے ناگور شہر میں کئی مزارات ہیں۔ جنوبی ہند اور مرجع خلاق ہونے کے اعتبار سے اسے جنوبی ہند کا اجمیر شریف کہہ سکتے ہیں۔ درگاہ سے متصل سمندر کے ساحل تک آباد و گنجان آبادی میلوں تک پھیلی ہوئی ہے جس کی اکثریت مسلمانوں کی ہے۔

جنوبی ہند کے بہت سے شہر سمندر کے ساحل پر واقع ہیں جہاں عرب کے کپڑوں کے سوداگران پانی کے جہازوں سے آتے تھے اور کپڑے کے تبادلہ میں ہندوستان کے ہر طرح مصالحہ جات لے جاتے تھے۔ ناگور میں واقع عظیم الشان مزار پر میں نے حاضری کا شرف حاصل کیا اور

فاتحہ پڑھا۔ اس عالیشان مزار میں رسول اللہؐ کے ایک صحابی کی قبر ہے جن کی کوششوں سے اس خطہ میں ایمان کی روشنی پھیلی اور اسلام ان کا مذہب قرار پایا۔ معلوم ہوا کہ ان صحابی کے ہاتھوں عوام نے اسلام قبول کر کے بیعت کی۔ اس عالیشان عمارت میں تین مزارات ہیں۔ ایک ان صحابی کی جن کی کوششوں اور تبلیغ سے اسلام کی اشاعت ہوئی۔ دوسری قبر ان کے بیٹے کی اور تیسری ان صحابیؓ کے پوتے کی ہے۔ تین پشتوں کی دینی محنت، تبلیغ اور اشاعت اسلام سے پورا نا گور اسلام کی آغوش میں چلا گیا۔ نا گور کی ان مزارات کو دینی اعتبار سے بڑی قدر و منزلت حاصل ہے۔ شہر کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہوگئی۔ چند مقامی بزرگوں سے گفتگو کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ نا گور شریف کی حیثیت شمالی ہندوستان کے اجمیر شریف کی طرح کی ہے۔ لہٰذا جنوبی ہند کی عوام اجمیر شریف نہ جا کر نا گور شریف جانا زیادہ پسند کرتی ہے۔

......☆......

میرا گاؤں

میرا گاؤں دو گاؤں حسین گنج اور گوپال پور کے درمیان واقع ہے۔ دونوں گاؤں میں شیعہ فرقہ کی اکثریت ہے۔ حسین گنج کئی معنوں میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ لکھوری اینٹوں کا بنا صدیوں قدیم امام باڑہ ہے جہاں ماضی میں لکھنؤ کے معروف مرثیہ گو شاعر میر انیسؔ اور میر دبیرؔ نے اپنا کلام پیش کیا تھا۔ حسین گنج میں امام باڑہ کے علاوہ بینک، اسپتال، پٹرول پمپ کی سہولیات میسّر ہیں وہیں تقریباً سو سالہ کالج بھی ہے جہاں سے تعلیم حاصل کئے ہوئے نوجوان ملک اور بیرونِ ملک میں اعلیٰ اور باعزت عہدوں پر فائز ہیں۔ اپنے وطن سے قلبی لگاؤ کے نتیجے میں دُور دراز علاقوں سے محرّم منانے حسین گنج آتے ہیں۔ گوپال پور اُردو زبان وادب کے لحاظ سے بہت ہی زرخیز خطہ واقع ہوا ہے۔ ہر دور میں یہاں مجتہد پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے عراق تک کا سفر کیا۔ عوام میں شعرو شاعری کا ذوق بدرجہ اتم موجود ہے۔ گوپال پور سرکاری کاغذات میں باقر گنج کے نام سے درج ہے۔

میرے گاؤں ہری ہانس جانے والی حسین گنج کی سڑک پکّی سڑک کہلاتی تھی، کیونکہ اس پر اینٹیں بچھی ہوئی تھیں اور گوپال پور والی سڑک کچّی سڑک کے نام سے مشہور تھی۔ کیونکہ وہ مٹی کی بنی ہوئی تھی۔

"دادا جان- کیا آپ کے گاؤں جانے کے لئے چکنی سڑکیں نہیں تھیں جیسا کہ ہمارے شہروں میں ہیں"۔ عمران نے سوال کیا۔

"نہیں بیٹا- میں ہندوستان کی آزادی سے قبل کا ذکر کر رہا ہوں جب ہم بہت چھوٹے تھے اور کانپور میں پڑھتے تھے"۔

"دادا جان- آپ کانپور میں پڑھتے تھے۔ آپ کے بچپن کے شہر کی کیا خصوصیات تھیں بتائیے"۔ عمران نے پوچھا۔

’’کانپور میں کپڑوں کا مشہور کارخانہ ’’لال املی‘‘ مِل تھی۔ چمڑے کی ٹینریاں تھیں، کانپور کا مشہور پریڈ بازار تھا۔ مسٹن روڑ کی مارکیٹ تھی اور بین الاقوامی کرکٹ میچ کھیلنے کا ’’گرین پارک‘‘ اسٹیڈیم تھا۔ اس کے علاوہ کانپور کا پھول باغ پارک دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا جہاں آزادی سے ایک سال قبل بابائے قوم موہن داس کرم چند گاندھی تشریف لائے تھے۔‘‘ دادا جان نے اپنے پوتے عمران کو تفصیل سے شہر کانپور کا تعارف کرایا۔ عمران بڑے غور سے اپنے دادا کی قیمتی باتوں کو سنتا رہا۔

’’کیا آپ نے مہاتما گاندھی کو دیکھا تھا‘‘؟ عمران نے سوال کیا۔ ہاں میں نے ان کو دیکھا تھا اور ان کی تقریر بھی سنی تھی۔ پبلک کے ساتھ میں نے بھی انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائے تھے جبکہ میں صرف آٹھ نو سال کا تھا۔

’’دادا جان۔ آپ اپنے گاؤں جانے والی کچّی پکّی سڑکوں کے بارے میں بتا رہے تھے‘‘۔ عمران نے یاد دلایا۔

’’ہاں۔ بھئی۔ اس زمانہ میں ریلوے اسٹیشن سے گاؤں جانے کے لئے بیل گاڑی منگوانی ہوتی تھی۔ زمینداری کا زمانہ تھا کارندے بیل گاڑی لے کر اسٹیشن کے باہر ہمارا انتظار کرتے تھے۔ دن کے دو بجے چل کر ہم بیل گاڑی سے اپنے گاؤں شام کے چھ بجے پہنچتے تھے‘‘۔

’’کیا آپ کا گاؤں ریلوے اسٹیشن سے بہت دُور تھا‘‘؟ عمران نے سوال کیا۔

’’نہیں بیٹا۔ اسٹیشن سے محض پانچ میل پر واقع تھا مگر اس زمانہ میں سڑک نہ ہونے کی وجہ سے بیل گاڑی آہستہ آہستہ چلتی تھی اور جب اندھیرا ہو جاتا تو گاڑی بان لالٹین جلا کر گاڑی کے نیچے لٹکا دیتا تھا جس کی روشنی کے سہارے بیل چلتے رہتے تھے۔ اس طرح ہم پانچ میل کا سفر تقریباً چار گھنٹے میں طے کرتے تھے‘‘۔ میں نے بتایا۔

’’اب۔ آپ کیسے جاتے ہیں‘‘؟

’’اب‘‘ دادا جان نے زور دے کر کہا۔ ’’اب شہر سے زیادہ اچھی سڑکیں تو دیہاتوں میں بن گئی ہیں۔ چار گھنٹے کا سفر آدھے گھنٹہ میں طے ہو جاتا ہے۔ پرانے زمانہ میں اسٹیشن کے باہر بیل

گاڑیاں اور یکے کھڑے رہتے تھے، آج وہاں ہر ماڈل کی ٹیکسیاں کھڑی ہیں"۔

"دادا جان- آپ نے کانپور کے پھول باغ میں گاندھی جی کو دیکھا اور ان کی تقریر بھی آپ نے سنی تھی، مگر یہ بتایئے کہ کیا آپ نے ہندوستان کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کو بھی دیکھا تھا۔ عمران نے پوچھا۔ "ہاں۔ میں نے گورکھپور میں جواہر لعل نہرو کو بھی دیکھا تھا"۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ جواہر لعل نہرو دہلی سے نیپال کی راجدھانی کاٹھ منڈو جا رہے تھے۔ ان کا ہوائی جہاز بہت بڑا تھا جو کاٹھ منڈو کے ایئرپورٹ پر اُتر نہیں سکتا تھا، اس لئے چند گھنٹوں کے لئے وہ گورکھپور ایئرپورٹ پر جہاز تبدیل کرنے کے لئے رُکے تھے۔ گورکھپور ایئرپورٹ پر اپنے ملک کے وزیراعظم کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں عوام اکٹھا ہوگئی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سارا شہر وزیراعظم جواہر لعل نہرو کے دیدار کے لئے ایئرپورٹ پر اُمڈ پڑا ہو۔ مقامی لوگوں کے مطابق شہر گورکھپور نے اس سے قبل اتنا بڑا مجمع نہیں دیکھا تھا"۔

"دادا جان- پھر آپ نے ان کو کیسے دیکھا"؟ عمران نے سوال کیا۔

"میں نے دیکھا ایک بہت بڑا ہوائی جہاز گورکھپور ایئرپورٹ پر اُترا۔ مسافروں کے اُترنے والی سیڑھیاں لگائی گئیں۔ جہاز کا دروازہ کھلا اور پنڈت جواہر لعل نہرو سفید شیروانی، سفید ٹوپی، سفید چوڑی دار پاجامہ میں ملبوس برآمد ہوئے۔ ان کی سفید شیروانی کی جیب میں سرخ گلاب کا ایک پھول لگا ہوا تھا۔ ان کو دیکھتے ہی مجمع نے زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ وزیراعظم نہرو بار بار اپنا ہاتھ اُٹھا کر جواب دے رہے تھے۔

جیسے ہی وہ جہاز سے نیچے اُترے شہر کی مشہور و معروف ہستیاں ان کے استقبال کے لئے آگے بڑھیں۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے ایک قطار میں کھڑے لوگوں سے مصافحہ کیا، جس میں سردار سرجیت سنگھ مجیٹھیا کی ہستی قابل ذکر تھی۔ وہ کئی ملوں کے مالک تھے اور شہر میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ میں نے جواہر لعل نہرو کو بہت قریب سے دیکھا، سرخ و سفید شکل و صورت کے مالک کے چہرہ پر پتہ نہیں کیوں پریشانی کی لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ وہ شہر کے معزز ہستیوں سے مصافحہ

کرتے وقت بھی بے چینی سے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھ رہے تھے جیسے ان کو کسی کا انتظار ہو۔ آخرانہوں نے ایک ذمہ دار افسر سے دریافت کیا۔

''دلدار نہیں آئے''؟

''دلدار......!'' اُس افسر نے تعجب سے دُہرایا۔

''ہاں ہاں...... دلدار حسین خاں''۔ جواہر لعل نہرو نے ناراضگی سے کہا اور دیکھتے دیکھتے ہزاروں کی تعداد میں کھڑے مجمع میں ایک تہلکہ سا برپا ہوگیا کہ وزیراعظم جواہر لعل نہرو کسی دلدار حسین خاں کے بارے میں دریافت کررہے ہیں۔ گورکھپور کی انتظامیہ میں کھلبلی مچ گئی اور تھوڑی دیر میں کھدر کی شیروانی اور ٹوپی میں ملبوس دلدار حسین خاں وزیراعظم جواہر لعل نہرو کے سامنے کھڑے تھے۔ نہرو جی نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور ان کو گلے لگالیا۔ کافی دیر تک وہ دلدار حسین خاں سے گفتگو کرتے رہے۔

''داداجان- یہ دلدار حسین خاں کون تھے؟ جن کو جواہر لعل نہرو نے گلے لگالیا''۔

''بیٹا- دلدار حسین خاں گورکھپور شہر کے زمیندار اور بہت بڑے کانگریسی تھے۔ جب اپنا ملک ہندوستان غلام تھا تو کانگریس پارٹی انگریزوں کے خلاف لڑ رہی تھی۔ اس زمانہ میں آزادی کا مطالبہ کرنے والوں کو انگریز جیلوں میں قید کررہے تھے، لہٰذا عوام میں خوف و ہراس تھا۔ کانگریس پارٹی کا نام لینے سے بھی لوگ گریز کرتے تھے کہ پولیس کانگریسی ہونے کے جرم میں کہیں جیل میں نہ ڈال دے۔ کانگریس پارٹی کا چار آنہ کا ممبر شپ قبول کرنے سے بھی عوام گھبراتی تھی۔ ایسے نامساعد حالات میں گورکھپور شہر کے کانگریس پارٹی کے عظیم سپاہی دلدار حسین خاں، نہ صرف اعلانیہ کانگریس پارٹی کو خطیر رقم چندہ کی شکل میں فراہم کرتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی جنگ آزادی میں حصہ لینے کی ترغیب دیتے تھے۔ اسی لئے جواہر لعل نہرو اپنے پُرانے ساتھی دلدار حسین خاں کو بھولے نہیں تھے''۔

''داداجان- ان کو ڈر نہیں لگتا تھا کہ انگریز قید نہ کرلیں''۔ عمران نے پوچھا۔

''نہیں۔ان کوڈر اس لئے نہیں لگتا تھا کہ آزادی حاصل کرنا ان کی زندگی کا واحد مقصد بن گیا تھا۔ آزادی کے متوالے جان کی بازی لگا کر غلامی سے چھٹکارہ حاصل کرنا اپنا فرض تصور کرتے تھے۔ دلدار حسین خاں مجاہدِ آزادی تھے اور جواہر لعل نہرو کے بہت ہی قریبی ساتھی تھے، جب بھی وہ گورکھپور شہر کا دورہ کرتے تھے ان کی کوٹھی ''ضیا منزل'' میں ہی قیام کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا اور جواہر لعل نہرو آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم بنائے گئے۔ اپنے دیرینہ دوست دلدار حسین خاں کو نہیں بھولے۔ اسی لئے گورکھپور ایئرپورٹ پر ان کو غیر حاضر پا کر بے چین ہوگئے۔ بہر حال جنگِ آزادی کے دونوں مجاہد ایک دوسرے کے گلے ملے اور وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نیپال کے دورے کے لئے روانہ ہوگئے۔ نیپال کا یہ دورہ جواہر لعل نہرو کی زندگی کا آخری بیرونی ملک کا دورہ اور اپنے دوست دلدار حسین خاں سے آخری ملاقات ثابت ہوا۔ کچھ مہینہ بعد ان کا ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو دہلی میں انتقال ہوگیا۔

''بڑی اچھی باتیں بتائیں آپ نے دادا جان''۔ عمران نے دادا جان سے مخاطب ہو کر پوچھا ''آپ کے گاؤں میں مال اور سومنگ پول تھا''۔ دادا جان نے جواب میں کہا۔ ''میرے گاؤں میں ہر ہفتہ بازار لگتی تھی جس میں بکرے کا گوشت اور ہر طرح کی سبزیاں ملتی تھی۔ پورے گاؤں کے لوگ ہفتہ بھر کا سامان خرید لیتے تھے۔ بازار میں بڑی رونق رہتی تھی۔ اتنا مجمع ہو جاتا تھا کہ چلنے کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ مجھے اپنے بچپن کے زمانہ کی بات یاد ہے کہ میرے نظام الدین ماموں جب بازار کے لئے گھر سے نکلتے تھے تو ان کے پیچھے پیچھے ان کے سپاہی جگیشر لال ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ یہ ہفتہ وار بازار ''بریٹھا'' نامی ایک مشہور تالاب کے کنارے لگتا تھا۔ اسی تالاب میں گاؤں کے ہر شخص نے تیرنا سیکھا تھا۔ وہی ہمارے گاؤں کا سومنگ پول تھا۔ گاؤں کا شاید ہی کوئی شخص ہو جو تیرنا نہ جانتا ہو۔ تیرنا اور سائیکل چلانا ایک ایسا ہنر ہے جس کو انسان کبھی بھولتا نہیں ہے۔ گاؤں کے ہفتہ وار بازار کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ گاؤں والے اپنے پھٹے پرانے جوتے چپلوں کی مرمّت کے لئے بازار کا ایک ہفتہ انتظار کرتے تھے۔ جہاں موچی اپنے ساز و سامان کے ساتھ مرمّت کی دُکان لگاتے تھے۔ بکرے کا

گوشت فروخت کرنے والے ذبح کیا ہوا تازہ بکرا ایک لاٹھی میں الٹا ٹانگ دیتے تھے اور گاؤں والے خرید لیتے تھے۔ کوری ذات کے کسان اپنے کھیتوں سے تازہ سبزیاں لے کر آتے تھے اور دیکھتے دیکھتے ساری سبزیاں فروخت ہو جاتی تھیں۔ گاؤں کے بازار میں جو لطف تھا آج شہر کے بڑے بڑے مال اور شاپنگ کمپلیکس میں نہیں ہے۔ چوں کہ گاؤں میں کوئی ہیئر کٹنگ سیلون نہیں تھا، اس لئے بریٹھا کے ہفتہ وار بازار میں کئی حجام اپنی دُکانیں سجا لیتے تھے"۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کا گاؤں بہت اچھا تھا"۔ عمران نے اپنے دادا سے کہا۔

"ہاں ہمارے بچپن میں گاؤں میں بڑی رونق ہوا کرتی تھی۔ محرّم کے مہینہ میں گھر گھر کھچڑا پکتا تھا اور ہر گھر بھیجا جاتا تھا۔ تعزیہ بنتی تھی۔ سات فٹ کے شرف الدین جن کو گاؤں والے شرفو کہتے تھے ان کی تعزیہ سب سے اُونچی ہوتی تھی۔ امام باڑہ پر شربت اور تن چولی رکھی جاتی تھی۔ امام حسینؓ کی شہادت کا دلدوز واقعہ بیان کیا جاتا تھا۔ مرثیہ کے ساتھ ماتم کیا جاتا تھا۔ ہم سب سنّی مسلمان تھے مگر شیعہ سنّی میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ خاندان کے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو عید اور بقرعید میں پردیس سے گاؤں نہیں آتے تھے مگر محرّم منانے دس دن کے لئے ضرور آتے تھے۔ محرّم کی بڑی اہمیت تھی ہمارے بچپن میں۔ رات میں جب علم نکلتا تو میں بہت چھوٹا تھا، ایک مہندر نامی اسامی کے کندھے پر بیٹھ کر محرّم کا جلوس دیکھتا تھا۔ کوئی تلوار چلانے کا تماشہ دکھاتا تھا تو کوئی لاٹھی کی آپس میں مار کرنے کا کرتب پیش کرتا تھا اور ہم بچّوں کو بڑا لطف آتا تھا"۔ دادا جان نے اپنے گاؤں کی تفصیل بتائی۔

"آپ نے تو اپنے بچپن میں بہت کچھ دیکھا اپنے گاؤں میں کیوں دادا جان"۔ عمران نے کہا۔

"ہاں بھئی۔ ہمارے بچپن میں ہر تہوار پر بڑی رونق رہتی تھی۔ شب برات میں ہر گھر میں طرح طرح کا حلوہ بنتا تھا، مجھے تو صرف چنے کا حلوہ بہت پسند تھا، مگر میری امّاں فاتحہ ہونے سے پہلے کسی کو چھونے تک کی اجازت نہیں دیتی تھیں"۔ میں نے کہا۔

"داداجان اور کیا ہوتا تھا۔ بتایئے بڑا لطف آ رہا ہے"۔ عمران نے کہا۔

"رمضان کے مہینہ میں ایک دوسرے کے گھر افطاری بھیجی جاتی تھی۔ غریبوں کو خاص طور سے افطار اور کھانا جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے غریب گھر کے بچّے ہمارے دروازہ پر آواز لگاتے تھے کہ افطاری دو۔ گھوگھنی یعنی تلے ہوئے چنے ہر امیر غریب کے گھر پورے رمضان بنتا تھا۔ کہتے تھے کہ بغیر چنے کے روزہ کیسا۔ رمضان میں ایک خاص بات یہ تھی کہ ہر شخص اپنی افطاری لے کر بنگلہ پر جمع ہوتا تھا۔ ہمارے بڑے بھائی سیّد احمد سب کی افطاری کو کچھ اس طرح ملاتے تھے کہ ہر شخص کے حصّے میں دوسروں کی لائی ہوئی افطاری بھی اس میں شامل ہو جاتی تھی۔ بنگلہ پر اذان ہوتی تھی اور بنگلہ ہی پر مغرب کی نماز پڑھی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ رمضان میں مسجدیں بھی بھری رہتی تھیں اور عشاء بعد تراویح پڑھی جاتی تھی۔ ہمارے بچپن میں ایک نئی بات یہ تھی جو اَب نہیں ہے۔ اتنا کہہ کر داداجان رُک گئے۔

"وہ کیا داداجان۔؟ عمران نے تجسّس سے پوچھا۔

"ہمارے بچپن میں رمضان میں شبینہ کا بڑا رواج تھا۔ یعنی ایک رات میں کئی حافظ باری باری پوری قرآن ختم کرتے تھے۔ اب یہ سلسلہ بند ہو گیا" داداجان نے کہا۔

"اور عید بقر عید کیسے منائی جاتی تھی"۔ عمران نے پھر سوال کیا۔

"عید میں نئے نئے کپڑے پہن کر سب بنگلہ نامی مخصوص جگہ پر جمع ہوتے تھے۔ گاؤں کے ڈوم ذات کا ایک شخص بڑی پیاری دُھن میں شہنائی بجاتا تھا جس کی میٹھی آواز سن کر ہر گھر سے لوگ نکل کر بنگلہ پر اکٹھا ہونا شروع ہو جاتے تھے۔ عیدگاہ تک ہم سب ساتھ جاتے تھے۔ نئے نئے کپڑوں میں لڑکے اور لڑکیاں خوب خوشیاں مناتی تھیں"۔ میں نے عمران کو سمجھایا۔

"اور بقر عید میں دادا"۔؟ عمران نے پھر سوال کیا۔

"ارے بھائی۔ بقر عید میں تین دن تک قربانی ہوتی تھی۔ گھر کے پلے ہوئے تندرست بکروں کو نہلا دُھلا کر اُس کے گلے میں ہار ڈالا جاتا تھا اور جب اس کی قربانی ہوتی تھی تو ہم سب

بچے خوب روتے تھے۔ قربانی کا گوشت رشتہ داروں اور غریبوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ بڑا اچھا لگتا تھا۔

''مگر داداجان- یہ بتایئے کہ کیا آپ کے پاس گاؤں میں کھیت اور باغ بھی تھے''۔ عمران نے سوال کیا۔

''ہاں بیٹے- میرے گاؤں میں میرے پاس کھیت بھی تھے اور باغ بھی۔ مگر'' داداجان اتنا کہہ کر رُک گئے۔

''مگر کیا داداجان-؟ عمران نے سوال کیا۔

''مگر یہ کہ کھیت تو گاؤں میں سب کے پاس ہوتا ہے مگر باغ سب کے پاس نہیں ہوتا۔ میرے والد کا آباد کیا ہوا جیسا باغ دس بیس ضلعوں میں نہیں تھا۔ عام طور سے باغ کا مطلب ہوتا ہے آم کا باغ جو سال میں ایک بار پھل دیتا ہے مگر میرے والد بہت شوقین اور اعلیٰ ذوق کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنے باغ میں انگور، اَنار، ناشپاتی، آڑو (جسے ہم بھائی بہن سخت آلو کہتے تھے)، امرود، نیبو کا ایک غیر معمولی پیڑ تھا جس کا ہر نیبو پانچ اور دس کلو وزن کا ہوتا تھا اور اسے گھاگھل نیبو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ کٹھل کا ایک درخت تھا جس کے بارے میں شاید ہی کسی نے کہیں پڑھا یا اپنے بزرگوں سے سنا ہو۔ کٹھل کی وہ ایک ایسی نسل کا پیڑ تھا جس کے کٹھل پیڑ پر نہیں پھلتے تھے بلکہ پیڑ کی جڑ کے پاس کی زمین خود بخود پھٹ جاتی تھی تو سمجھ لیا جاتا تھا کہ یہاں کٹھل پک گیا ہے، اسی لئے زمین پھٹ گئی ہے، لہٰذا زمین کھود کر پکا ہوا کٹھل نکال لیا جاتا تھا''۔ داداجان تھوڑی دیر رُک گئے۔

''داداجان- یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے کہ کٹھل زمین کے اندر سے نکلتا تھا''۔ عمران نے کہا۔

''عمران بیٹے- کٹھل کی ایک ایسی نسل کا وہ پیڑ تھا جو نایاب تھا۔ پیڑ پر نہ پھل کر زمین کے اندر پک کر تیار ہوتا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے بچپن میں دیکھا اور حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں''۔ داداجان نے عمران کو سمجھایا۔

''پھر۔ پھر اس باغ کا کیا ہوا؟ دادا جان'' عمران نے پھر سوال کیا۔

''بھئی۔ میرے اس باغ میں سال کے ہر مہینہ کسی نہ کسی پھل کا موسم آتا تھا لہٰذا سال بھر اس کی حفاظت نہیں ہو سکی۔ ہماری والدہ نے اسے کٹوا دیا۔

''اچھا۔'' عمران نے لمبی سانس لی اور بولا'' اب تو آپ کے گاؤں میں پکّی سڑکیں بن گئی ہوں گی اور بیل گاڑی بھی نہیں چلتی ہوگی، پھر آپ اپنے گاؤں کیوں نہیں جاتے''۔

''ہاں پکّی سڑکیں ہی نہیں بلکہ پکّے مکانات بھی بن گئے ہیں۔ گاؤں میں خوشحالی آ گئی ہے۔ ہمارے زمانے میں چند لوگوں کے پاس پیسہ تھا مگر اب ہر شخص دولت مند ہو گیا ہے۔ گاؤں کی مسجدیں پکّی اور دو منزلہ تعمیر ہو گئی ہیں۔ بڑے بڑے دارالعلوم قائم ہو گئے ہیں۔ گاؤں کے ہر گھر کا ایک فرد عرب ممالک میں ملازمت کر رہا ہے۔ اچھی تنخواہیں مل رہی ہیں، لہٰذا ہر خاندان کی مالی حالت میں زبردست تبدیلی آ گئی ہے۔ پہلے غربت تھی اب تن آسانی ہے۔ پہلے مفلسی تھی اب لوگ صاحب حیثیت ہیں۔ جو لوگ رمضان کے مہینہ میں زکوٰۃ کھاتے تھے اب اللہ کا شکر ہے کہ وہ خود زکوٰۃ ادا کر رہے ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ عرب ممالک میں روزگار سے عوام کی مالی حالات میں بڑا تغیر آیا۔

''بیٹا عمران۔ ہم گاؤں میں چار توضیع کے زمیندار تھے۔ ہمارے اسامی سالانہ لگان جسے مالگذاری بھی کہا جاتا تھا، ادا کرنے دروازہ پر آتے تھے۔ بڑا اچھا زمانہ تھا جو گذر گیا۔ تب گاؤں میں غربت تھی مگر اب خوشحالی آ گئی۔ شکر کا مقام ہے مگر......'' اتنا کہہ کر دادا جان رُک گئے۔

''مگر کیا؟ دادا جان'' عمران نے پوچھا۔

گاؤں والوں میں اخلاص اور مروّت میں کمی آ گئی ہے۔ خوش حالی کئی طرح کی بُرائیاں لے کر آئی ہے۔ اخلاقی قدروں کا فقدان ہے جس کی وجہ سے لوگ کھلے دل و دماغ سے نہیں ملتے۔ گاؤں کے باشندوں میں آپسی بھائی چارہ ناپید ہو گیا ہے، جو بھی گاؤں کا طرۂ امتیاز ہوا کرتا تھا۔ گاؤں میں محبت کی خوشبو تقریباً ختم ہو گئی ہے۔ پہلے گاؤں کے کسی ایک شخص پر کوئی ناگہانی آفت

آجاتی تھی تو پورا گاؤں اس سے متاثر ہوتا تھا، لگتا تھا کہ گویا یہ آفت گاؤں کے ہر فرد پر آئی ہے۔ سب مل کر اجتماعی طور پر اس پریشانی کا مقابلہ کرتے تھے، مروّجہ، آپسی بھائی چارہ اور یکجہتی کا مظاہرہ ہوتا تھا مگر آج جب کہ گھر گھر میں بجلی پانی کی سہولت ہوگئی ہے، ہر شخص کے ہاتھ میں ایک موبائل آگیا ہے، گاؤں میں پٹرول پمپ کھل گیا ہے، کیونکہ ہر گھر میں ایک موٹر سائیکل رکھنا لازمی ہوگیا ہے۔ مگر آج جب کھپریل کے مکانات پختہ مکانوں میں تبدیل ہو گئے ہیں تو اخلاقی طور پر گراوٹ آگئی ہے۔ ہر شخص دولت کے نشے میں چور ہے، لہٰذا چھوٹے بڑے کا لحاظ ختم ہوگیا ہے''۔

''دادا جان- کیا آپ کا گاؤں بدل گیا ہے، ویسا نہیں رہا جیسا آپ کے بچپن میں تھا''؟

عمران نے اپنے دادا سے پوچھا۔

''ہاں بیٹا- گاؤں کی خوبصورتی تھی کچّی سڑکیں، جگہ جگہ تالاب، آم کے باغات، مٹّی کے بنے کچّے مکان کے دالانوں کو پیلی مٹّی سے لیپا جاتا تھا، لوگ تالاب میں نہاتے تھے اور تیرنا سیکھتے تھے، سوئمنگ پول کی ضرورت نہیں تھی، کچّی سڑکوں پر ہلکی ہلکی بارش کی پھوار سے سوندھی سوندھی خوشبو نکلتی تھی وہ دل ودماغ کو معطّر کردیتی تھی۔ آم کے باغات میں جھولا ڈال کر گاؤں کی کنواری لڑکیاں لمبی لمبی پینگیں مارتی اور خوشی کے گیت گاتی تھیں، کنویں سے پانی بھرا جاتا تھا اور کھیتوں کی سینچائی ہوتی تھی۔ گاؤں کی جو قدرتی خوبی اور خوبصورتی تھی اسے نئے زمانہ کی ترقی نے تباہ و برباد کردیا۔ اپنی انفرادیت کھودیا گویا گاؤں جب شہر بن گیا تو پھر گاؤں جا کر کیا کروں''؟ میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا تھا کہ یارب مجھے وہ دن نہ دکھانا جب گاؤں میں بھی شہر کا نقشہ دکھائی دے۔

......☆......
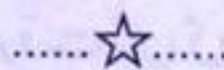
مضامین

امینؔ سلونوی

عظیم صحافی، مجاہدِ آزادی، مفکّر اور مشہور ادیب

سو سال قبل اودھ کی راجدھانی لکھنؤ میں اُردو زبان و ادب کے دلدادہ تین نوجوان اپنے شاندار مستقبل کی تلاش میں وارد ہوئے، جن کی آنکھوں میں سنہرے مستقبل کے چراغ روشن تھے۔ وہ تین ہستیاں تھیں حضرت امینؔ سلونوی، حضرت نسیمؔ انہونوی اور جناب شوکتؔ تھانوی۔ بیکاری کے دنوں میں یہ تینوں حضرات امین آباد کے جھنڈے والے پارک میں بیٹھے مستقبل کے تانے بانے بُنتے رہتے تھے۔ مگر طبیعتاً تینوں مختلف خیالات کے حامل تھے۔ امین سلونوی صاحب صحافت اور شاعری کے علاوہ جنگِ آزادی میں حصّہ لینے کا جذبہ رکھتے تھے۔ نسیم انہونوی صاحب جن کے اباء واجداد ضلع اُناؤ کے ایسے قصبہ سے تعلق رکھتے تھے جہاں پیری مریدی کا سلسلہ جاری تھا، لہٰذا ان کے والد نے آبائی وطن ترک کر کے انہونہ کو وطن ثانی بنالیا۔ نسیم انہونوی وہیں پیدا ہوئے جو ادبی مزاج کے علاوہ تجارتی ذہن بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے لاٹوش روڈ پر "نسیم بک ڈپو" قائم کیا۔ خواتین کا ماہنامہ "حریم" نکالا اور خود اپنی اسّی ناولوں کے علاوہ تقریباً آٹھ سو کتابیں شائع کیں۔ نسیم بک ڈپو ہندوستان کا واحد ادارہ تھا جہاں ہر مکتبہ خیال کی کتابیں دستیاب تھیں۔ شوکت تھانوی اُردو ادب میں طنز و مزاح کو فروغ دینے میں دلچسپی رکھتے تھے، مگر ۱۹۴۷ء سے قبل ایک فلم کمپنی کی ملازمت کے سلسلہ میں لکھنؤ سے لاہور منتقل ہو گئے۔ اُن کا مزاحیہ اور طنزیہ افسانہ "سودیشی ریل" کافی مقبول ہوا تھا۔

مجھے ۱۹۵۸ء میں امین سلونوی صاحب سے پہلی ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، لکھنؤ میں امین آباد کے علاقہ کے ایک حصّہ کا نام نیا گاؤں (پچھمی) ہے، جہاں ان کا دو منزلہ مکان ہے۔ مکان کے نچلے حصّہ میں ڈرائنگ روم کے علاوہ ایک چھوٹا سا بیٹھکا تھا جس کو انہوں نے اپنا آفس بنا

رکھا تھا۔ میں نے دیکھا امین سلونوی صاحب اپنے اسی چھوٹے سے دفتر میں بیٹھے اُردو ٹائپ رائٹر پر خبریں ٹائپ کررہے تھے۔ شیروانی ٹوپی میں ملبوس امین سلونوی صاحب اُردو صحافت کے عظیم ستون کی حیثیت رکھتے تھے، مگر مکان کے نچلے حصّہ میں واقع دفتر کی حالت کسی صوفی کے کمرہ جیسی تھی۔ اخبارات اور رسائل بے ترتیب رکھے ہوئے تھے۔ فرنیچر کے نام پر ایک میز تھی جس پر ٹائپ رائٹر رکھا ہوا تھا اور دو چار کرسیاں مہمانوں کے بیٹھنے کے لئے پڑی ہوئی تھیں۔ طبیعتاً انتہائی سادگی، خلوص ومحبت کے پیکر تھے۔ امین سلونوی صاحب میں کوئی تصنّع اور بناوٹ نہیں تھی۔ شائستگی سے گفتگو کرنے کے عادی تھے۔ غیر ادبی اندازِ گفتگو کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ سلیقہ مندی اور شائستگی اُن کا شعار تھا۔

امین سلونوی صاحب کا قصبہ سلون ضلع رائے بریلی میں واقع ہے، جہاں اُن کی ۱۹۰۱ء میں پیدائش ہوئی۔ تعلیم کے سلسلہ میں لکھنؤ آئے اور لکھنؤ ہی کے ہوکر رہ گئے۔ ابتدائی مرحلے میں لکھنؤ کی عدالت میں عارضی ملازمت کی مگر گھر کا ماحول ادبی اور شعروشاعری کا تھا، لہٰذا خود بھی شعر کہنے لگے۔ حضرت مولانا عبدالباری آسیؒ (مشہور شاعر والی آسی مرحوم کے والد) کے حلقہ تلامذہ میں جلد ہی داخل ہوگئے۔ شاعری کے علاوہ وہ ادبی اور علمی مضامین اور مزاحیہ فیچر بھی لکھنے لگے جو ملک کے معروف جرائد مثلاً عالمگیر لاہور، نیرنگِ خیال لاہور، ساقی دہلی وغیرہ معیاری رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ انہوں نے اپنے مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ بعنوان ''دُنیا میں جہنم'' شائع کیا تھا جس کے سارے مضامین بیوی کے لیکچر پر مبنی تھے، جسے زندگی میں ہر شوہر بڑی ہمّت اور دلجمعی سے برداشت کرتا ہے۔ اس زمانہ میں اُردو کے مشہور صحافی سیّد جالبؔ دہلوی لکھنؤ سے ایک اخبار ''ہمدم'' نکالتے تھے۔ انہوں نے امین سلونوی صاحب سے فرمایا کہ میرے اخبار کے لئے خبریں فراہم کردیا کریں۔ امین سلونوی صاحب نے ''ہمدم'' کے لئے لکھنؤ کی ہر طرح کی خبریں بھیجنی شروع کیں۔ خصوصاً لکھنؤ کی ادبی سرگرمیوں کی تفصیل بہت اہمیت کی حامل ہوا کرتی تھی۔ لکھنؤ کا وہ دور اُردو زبان وادب کا سنہرہ ترین دور تھا۔ مولانا نیاز فتح پوری، مولانا عبدالباری آسی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالقوی دریابادی اور فرنگی محل کے متعدد بزرگانِ دین حیات تھے، جن

کی ذات خود ایک انجمن کی حیثیت رکھتی تھی۔ تقریباً سبھی سے امین سلونوی صاحب کے ذاتی تعلقات تھے، فرنگی محل میں امین صاحب کی کافی عزت و منزلت تھی، ہر شخص ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے معاملہ کرتا تھا۔

۱۹۲۴ء کی بات ہے جب امین سلونوی صاحب کم عمری میں اُردو زبان و ادب میں اچھی خاصی جگہ بنا چکے تھے۔ ان کے معیاری مضامین اور شاعری نے لکھنؤ کے اُردو داں طبقہ میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ وہ شہر لکھنؤ کی مختلف موضوعات پر مشتمل خبریں جن میں ادبی نشستوں، مشاعروں کے علاوہ شہر کے جرائم کی بھی خبریں ہوا کرتی تھیں، اخباروں کو بھیجنے لگے جس میں ''ہمدم'' سرفہرست تھا۔ موصوف میں صحافت کے جراثیم بدرجہ اتم موجود تھے۔ لہٰذا انہوں نے ۱۹۳۰ء میں ایک خبر رساں ایجنسی ''انڈین نیوز سروس'' قائم کی جو ا۔ن۔س۔ کے مخفف نام سے ملک میں مقبول ہوئی۔ اس وقت تک اُردو زبان کی کوئی دوسری خبر رساں ایجنسی پورے ملک میں نہیں تھی۔ ساری خبریں پی ٹی آئی اور یو این آئی کے توسط سے انگریزی میں موصول ہوتی تھیں جن کا اُردو زبا میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔ کسی بھی صحافی کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنا اس کی قابلیت کی دلیل ہوا کرتی تھی۔ انڈی پنڈنٹ نیوز سروس اُردو ٹائپ رائٹر کے ذریعہ ٹائپ کر کے ان کی کاپیاں اُردو میں شائع ہونے والے اخباروں کو ارسال کرتی تھی۔ اُردو کی یہ ایجنسی لکھنؤ کے علاوہ دہلی، کلکتہ اور بمبئی سے شائع ہونے والے اُردو اخبارات مثلاً تیج، پرتاپ، جنگ، انجام، خلافت اور انقلاب وغیرہ کو خبریں مہیا کرتی تھی۔ اس زمانہ میں انگریزی کے کچھ اخبارات لکھنؤ سے شائع ہوتے تھے جو بیحد مقبول تھے اور پورے ملک میں پڑھے جاتے تھے۔ مثلاً کانگریس پارٹی کا نقیب نیشنل ہیرالڈ، مشہور اخبار تھا۔ اس کے علاوہ اخبار پانیر اور دوسرے شہروں سے انڈین ایکسپریس، امرت بازار پتریکا، لیڈر اور ہندی کا نوجیون، سوتنتر بھارت، آج، جاگرن کو بھی خبریں بھیجی جاتی تھیں جسے وہ ہر خبر کے آخر میں ان کا حوالہ دینا اپنا فرض تصور کرتے تھے۔ جس طرح پی ٹی آئی اور یو این آئی کو درجہ حاصل تھا۔

امینؔ سلونوی صاحب مذہباً کٹر مسلمان اور طبیعتاً پکے کانگریسی تھے۔ ان کے زمانہ میں

ہندوستان کا مسلمان دو حصے میں بٹ گیا تھا۔ ایک دھڑا کانگریس کا حمایتی تھا تو دوسرا کٹر مسلم لیگی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک خاندان کے ایک بھائی کانگریس کو شدت سے حمایت کرتے تھے تو دوسرے بھائی مسلم لیگ کے جاں نثار تھے۔ امین سلونوی صاحب کے عزیز دوست کانگریس پارٹی کے بہت بڑے مجاہد آزادی قاضی محمد عدیل عباسی بستی (یوپی) کے معروف و مشہور وکیل تھے۔ عدیل عباسی صاحب کے بڑے بھائی قاضی محمد شکیل عباسی کا تعلق مسلم لیگ سے تھا۔ نظریاتی طور پر اختلافات ضرور تھے مگر خاندانی وقار کے تحت چھوٹے بڑے کا بیحد لحاظ تھا۔ امین سلونوی صاحب کانگریس کی ہر چھوٹی بڑی خبر اپنی ایجنسی ا۔ن۔س۔ کے ذریعہ تفصیل سے بھیجتے تھے۔ انگریزوں کا زمانہ تھا، امین سلونوی صاحب کی خبروں پر مقامی ایڈمنسٹریشن کی گہری نظر رہتی تھی۔ حکومت کے خلاف زبان کھولنا قابل گرفت تھا۔ لہٰذا اُن کو بھی انگریز ایڈمنسٹریشن کے عتاب کا سامنا کرنا پڑا۔ چوں کہ وہ کٹر کانگریسی تھے، لہٰذا حب الوطنی کے جذبے کو مجروح ہونے نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی ایجنسی کی مشغولیت کے باوجود پنڈت نول کشور کے "اودھ اخبار" کے اداریہ لکھنے کی ذمہ داری بھی قبول کرلی تھی۔ صحافت کی ذمہ داریوں سے انہوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اور کانگریس کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ جنگ آزادی کے مجاہد امین سلونوی صاحب نے صحافت اور کانگریس پارٹی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا۔ وہ سچے محبّ وطن تھے۔ ان کی حب الوطنی پر اُنگلی نہیں اٹھائی جاسکتی تھی۔

امین سلونوی صاحب کی زندگی کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ان کی ابتدائی زندگی جدوجہد سے بھرپور تھی۔ قصبہ سلون سے لکھنؤ آکر عزیزوں کے یہاں قیام کرنا، مختلف اداروں میں عارضی خدمات انجام دینا۔ معاشی زندگی کے حصول کی وجدوجہد کے علاوہ کانگریس پارٹی کے سرگرم کارکن کی حیثیت سے جنگ آزادی میں ادب اور قلم سے حصہ لینا۔ آزادی کے پہلے کا دور مصائب اور جدوجہد سے بھرپور تھا۔ کانگریسی قائد ہونے کی وجہ سے آزادی کے تمام سورماؤں سے بیحد قریب ہوچکے تھے۔ مثلاً پنڈت جواہر لعل نہرو، پنڈت گووند بلبھ پنت، سروجنی نائڈو، محمد رفیع قدوائی حافظ محمد ابراہیم، چندر بھان گپتا، آنند نرائن ملاّ، بابو گوپی ناتھ سریواستو اور بابو موہن لعل سریواستو وغیرہ

کی قربت حاصل تھی۔

انڈین نیشنل کانگریس کا ۴۹واں اجلاس امین سلونوی صاحب کی سیاسی سرگرمیوں کی زندہ جاوید مثال ہے جو ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ہوا تھا۔ اس اجلاس کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ کانگریس کی جانب سے منعقد ایک قومی مشاعرہ بھی ہوا تھا۔ جس میں شرکت کرنے والوں میں اصغر گونڈوی، جوش ملیح آبادی، سیماب اکبرآبادی، ساغر نظامی، شوکت تھانوی، بسمل الٰہ آبادی، جمیل مظہری، وصل بلگرامی، رحم علی ہاشمی، عمر انصاری وغیرہ کے علاوہ خود امین سلونوی اور پنڈت آنند نرائن ملاّ شامل تھے۔ جنہوں نے قومی موضوعات پر کلام پیش کیا تھا۔ اس مشاعرہ کی ایک یادگار اور اہم بات یہ بھی تھی کہ اس میں مسلم لیگ کے عظیم رہنما چودھری خلیق الزماں کی اہلیہ زاہدہ خلیق الزماں نے شرکت کی تھی اور اپنا کلام پیش کیا تھا۔ خلیق الزماں صاحب تقسیم ہند کے بعد لکھنؤ سے ترکِ وطن کر کے پاکستان چلے گئے تھے۔ اس قومی مشاعرہ کمیٹی کے سکریٹری امین سلونوی صاحب نے تمام شعراء حضرات کا کلام ''جواہرات'' کے عنوان سے شائع کیا جس کے بعد میں کئی ایڈیشن شائع کیے گئے۔

مذہبی اور سماجی طور پر امین سلونوی صاحب نے سب سے بڑا کارنامہ لکھنؤ میں قائم کی ہوئی ''انجمن فردوسِ ادب'' کی جانب سے امین آباد کے جھنڈے والے پارک میں ہر سال بڑے تزک و اہتمام سے عید میلادالنبی کا پروگرام منعقد کرنا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں مرد و خواتین میلادالنبی میں تقاریر سننے کے لئے جمع ہوتے تھے۔ خواتین کے بیٹھنے کا انتظام علاحدہ تھا جو ایک خوبصورت چلمن سے مرکزی ہال سے علاحدہ کرتا تھا۔ صبح ولادت کی تقریر ہاشم میاں فرنگی کرتے تھے جس کو سننے کے لئے پورا لکھنؤ ٹوٹ پڑتا تھا۔ جبکہ شہر میں بیشتر جگہوں پر عید میلادالنبی کے جلسے ہوتے رہتے تھے مگر ان کی لاجواب تقریر سننا بڑے فخر کی بات تھی۔

امین سلونوی صاحب میرے لئے والد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے بیٹے لکھنؤ کے آج کے ممتاز صحافی حسین امین میرے دوست اور بھائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن سے میرے ۱۹۵۸ء سے تعلقات قائم ہیں، اسی تعلق سے ہم امین سلونوی صاحب کو ہمیشہ ''ابا'' سے مخاطب کرتے تھے

اور وہ بھی ہمیں ہمیشہ ایک شفیق باپ کا پیار دیتے تھے۔ ایک دن جیسے ہی میں نے حسین امین کو بلانے کے لئے آواز دی، امین سلونوی صاحب نے اپنے دفتر سے مجھ کو پکارا:

''ارے بھائی...... مشکور میاں''۔

''جی...... ابا'' کہہ کر میں دوڑ کر ان کے قریب پہنچ گیا۔

''آپ کا ایک خط میرے پتے پر آیا ہے''۔ انہوں نے ایک پوسٹ کارڈ دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔ میں نے وہیں اس پوسٹ کارڈ کو پڑھا جو اُردو زبان میں ٹائپ کیا ہوا تھا اور انڈی پینڈنٹ نیوز سروس کے پتہ پر دہلی سے آیا تھا۔ میں نے ابا سے کہا۔

''ابا...... دہلی سے ایک میگزین ''ہما ڈائجسٹ'' نکلتا ہے جس کے ایڈیٹر عبدالوحید صدیقی صاحب ہیں۔ میں نے اشاعت کے لئے ایک مضمون بھیجا تھا جس کو شائع کرنے کی انہوں نے اطلاع دی ہے''۔

''اچھا...... اچھا......'' ابا نے کہا''۔ میں عبدالوحید صدیقی سے بخوبی واقف ہوں۔ غازیپور کے رہنے والے ہیں۔ جمعیۃ العلماء کو چھوڑ کر اب اپنا رسالہ شائع کر رہے ہیں۔ میرا سلام لکھ دینا''۔

امین سلونوی کی نیوز سروس بڑی خوبی سے کام کر رہی تھی۔ امین سلونوی صاحب نیوز خود ٹائپ کر کے اپنے معتمد خاص عثمان کے ذریعہ دفتر قومی آواز اور دیگر اخبارات کو بھیج دیتے تھے۔ ان کے خدمت گار عثمان صاحب بہت محنتی اور ایماندار شخص تھے۔ امین سلونوی صاحب مع اہلیہ جب حج بیت اللہ کے لئے گئے تو عثمان صاحب کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ پانی کے جہاز سے پندرہ دن کے سفر حج میں انہوں نے امین صاحب اور ان کی اہلیہ کی بڑی خدمت کی تھی۔ عثمان صاحب نے لکھنؤ کے محلہ کھدرا میں اپنا ذاتی مکان بنالیا تھا، جہاں چند سال قبل ان کا انتقال ہوگیا۔

اِنڈی پینڈنٹ نیوز سروس آہستہ آہستہ دیگر خبروں کے علاوہ کرائم رپورٹنگ تک محدود ہوگئی۔ لکھنؤ کے تقریباً ہر تھانہ سے سروس کا براہِ راست تعلق قائم ہوگیا۔ شہر میں آدھی رات کو بھی کوئی

غیر معمولی واقعہ ہو جاتا تو سب سے پہلے ان کو بذریعہ فون مطلع کیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ بعض خبروں میں پی ٹی آئی اور یو این آئی پیچھے رہ گئی اور ہر اخبار میں ا۔ن۔س۔ کے حوالے سے شاہ سرخیوں میں خبر شائع ہوئی۔ جرائم کی رپورٹنگ کی وجہ سے لکھنؤ کی پولیس کے اعلیٰ حکام بھی امین سلونوی کے رابطے میں رہنے لگے۔ ڈاکوؤں اور قاتلوں کی کامیاب گرفتاریوں پر ایجنسی جن پولیس اہلکاروں کے حوالے سے خبریں دیتی تھی ان کو اکثر و بیشتر محکمہ پولیس نے ترقی دے کر انعام واکرام سے نوازا تھا۔ جس سے پولیس کے محکمہ کی نظر میں امین سلونوی صاحب کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا اور لکھنؤ کی عوام اپنی چھوٹی پریشانیوں کو لے کر ا۔ن۔س۔ کے دفتر آنے لگے۔ معمولی جرم کے کیس امین سلونوی صاحب کے ایک ٹیلیفون کرنے سے ختم کر دیئے جاتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ لکھنؤ شہر کا ریڈ لائٹ ایریا یعنی چوک کی طوائفوں کا ایک جم غفیر ایک دن امین سلونوی صاحب کے دفتر کے سامنے چھوٹے سے میدان میں جمع ہو کر حکومت مخالف نعرہ بازی کر رہی تھیں کیونکہ حکومت نے جسم فروشی مخالف قانون نافذ کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کی روزی روٹی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ حکومت سے متبادل ذریعہ معاش کی مانگ کر رہی تھیں۔ وہ منظر بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہر طوائف اس پابندی سے خفا تھی اور امین سلونوی صاحب کے توسط سے حکومت سے مدد چاہتی تھی۔

بیچارے امین سلونوی صاحب سب کو تسلی دے رہے تھے اور ان کی مانگوں کو حکومت تک پہنچانے کا یقین دلا رہے تھے۔

میرے ''ابا'' امین سلونوی کا ۳۰ رجون ۱۹۸۳ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ چار ماہ قبل اہلیہ کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ افسوس کہ اس دُنیا سے ایک مردِ مجاہد چلا گیا۔

......☆......

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

ماہر تعلیم، مجاہد آزادی، ادیب، مفکر اور تبصرہ نگار

ہندوپاک کا شاید ہی کوئی ایسا صاحب علم ہو جو عالمی شہرت یافتہ عالم دین، مفسر قرآن، لاثانی طرزِ انشاء کے مالک جلیل القدر ادیب، صف اوّل کے ممتاز و معروف صحافی حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے اسم گرامی سے ناواقف ہو۔ حضرت مولانا دریاباد، ضلع بارہ بنکی (یوپی) کے باشندے تھے۔ ان کی چار بیٹیاں تھیں جو چار حقیقی بھائیوں سے منسوب ہوئیں۔ سب سے بڑی صاحبزادی رفعت النساء مولانا عبدالقوی دریابادی سے، دوسری ہمیرہ خاتون جناب حبیب احمد قدوائی سے، تیسری زہیرا خاتون ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی سے اور چوتھی بیٹی زاہدہ خاتون عبدالعلیم قدوائی سے بیاہی گئیں۔

میں یہاں حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے تیسرے داماد ماہر تعلیم، مجاہد آزادی، ادیب، مفکر اور معروف تبصرہ نگار ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کا ذکر کروں گا جو مارچ ۱۹۲۱ء میں اسی نامور قدوائی خاندان میں پیدا ہوئے۔ بارہ بنکی ضلع کا یہ خاندان بہت ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور آزادی کی جنگ میں نمایاں حصہ لینے کے پاداش میں انڈمان نکوبار میں کئی برس کی سزا سے گزر چکا تھا۔ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے دادا مولوی عبدالقادر نامی گرامی سرکاری افسر تھے اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر لکھیم پور، فیض آباد، گورکھپور، بستی اور سیتاپور میں مامور ہر دلعزیز حاکم رہ چکے تھے۔ حاجت مندوں کی ہمیشہ مدد فرماتے تھے، باعزت طور پر ریٹائر ہوئے۔ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے والد ماجد عبدالمجید صاحب بھی ترقی پا کر ڈپٹی کلکٹر ہوئے، اپنے والد کی طرح بہت مخیر، نیک، مخلص اور لائق سرکاری عہدہ دار تھے جو ضرورت مندوں کے علاوہ اپنے خاندان کے عزیزوں کی ہر طرح سے مدد فرماتے تھے۔ پرتاپ

گڑھ، گونڈہ، بستی، سہارنپور، سیتاپور، اُناؤاور بہرائچ میں تعینات رہ کر ریٹائر ہوئے۔ گویا کہ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے دادا اور والد ماجد کا حکومت وقت پر گہرا اثر تھا۔ تعلیمی لیاقت نے ان حضرات کو اس زمانہ کے اعلیٰ عہدوں سے نوازا تھا۔

ایسے اعلیٰ اور علمی گھرانہ میں محمد ہاشم قدوائی نے آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا جہاں سے انہوں نے بی اے۔ ایم اے اور پولیٹکل سائنس میں پی ایچ ڈی کیا۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرر ملازمت اختیار کر لی جہاں اپنی زندگی کے ۳۴ سال گزارے۔ ۱۹۸۲ء میں مسلم یونیورسٹی سے ریڈر کی حیثیت سے باعزت ریٹائر ہو گئے۔ انہوں نے اپنے زمانہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کئی وائس چانسلر دیکھے مگر چار وی سی کے کاموں سے بہت متاثر ہوئے، وہ تھے کرنل بشیر حسین زیدی، بدرالدین طیب جی، نواب علی یاور جنگ اور پروفیسر علی محمد خسرو۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کی زندگی کے کئے پہلو بہت اہم اور تاریخی ہیں۔ سیاست میں دلچسپی ان کے ضمیر میں شامل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بچپن میں اپنے گھر میں مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی کے علاوہ جمعیۃ العلماء کے بزرگوں کو قریب سے دیکھا اور ان کی صحبت سے فائدہ اٹھایا۔ ان کا گھر ''خاتون منزل'' علماء کرام اور بزرگانِ دین کی آماجگاہ تھی جہاں کبھی علامہ شبلیؒ کا قیام رہا۔ جب تک لکھنؤ کے ندوۃ العلماء یعنی ندوہ کی پختہ عمارت تعمیر نہیں ہوگئی تھی درس وتدریس کا سارا انظام ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے مکان ''خاتون منزل'' سے چل رہا تھا۔ علامہ شبلیؒ کا قیام اسی منزل کے کوٹھے پر تھا۔

کانگریس پارٹی سے ان کا تعلق بہت قدیم ہے۔ جنگ آزادی کے سلسلہ میں جب ۱۹۳۱ء میں مشہور انقلابی لیڈر بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو پھانسی دی گئی تو ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے اسکول اور سہارنپور شہر میں ہڑتال ہوگئی۔ پندرہ طالب علموں کو اسٹرائک کرنے کے پاداش میں فیل کر دیا گیا جس میں ہاشم قدوائی بھی شامل تھے۔ ملک کی آزادی میں ان کی یہ پہلی قربانی تھی۔

کانگریس پارٹی نے ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کو ۱۹۸۴ء سے ۱۹۹۰ء تک راجیہ سبھا کا ممبر نامزد کیا تھا۔ پارلیامنٹ کے ممبر کی حیثیت سے انہوں نے راجیہ سبھا میں اُردو زبان اور ملک میں مسلمانوں کے اہم مسائل پر خاصی توجہ دی اور سوالات کیے۔ انہوں نے بحثیت ایم پی (راجیہ سبھا) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی اور مسلم مخالف فسادات پر نکیل کسنے کے مسائل کو زور وشور سے اٹھایا اور حکومت کو متوجہ کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کو جب مرکزی یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا تو ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی نے حکومت کی توجہ دلا کر اسے اقلیتی کردار دلایا۔ سیاسی زندگی میں ان کے زیادہ تر روابط مجاہد آزادی رفیع احمد قدوائی، لال بہادر شاستری، اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، ڈاکٹر سیّد محمود کے علاوہ مولانا حفظ الرحمٰن سے رہے۔ محترمہ اندرا گاندھی کے متابلہ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی راجیو گاندھی سے زیادہ قریب رہے۔ مثلاً شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کا فیصلہ شریعت اسلامی میں مداخلت کے مترادف تھا۔ مسلم ممبران پارلیامنٹ، مسلم پرسنل لا بورڈ کے وفد میں شامل ہو کر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی قیادت میں ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی نے وزیراعظم راجیو گاندھی سے ملاقات کی اور اس بات کا مطالبہ کیا کہ وہ شریعت میں دیئے گئے متعلقہ خواتین کے حقوق کی پامالی سے بچانے کے لئے پارلیامنٹ سے قانون پاس کرائیں۔ راجیو گاندھی سے ان کے قریبی تعلقات کی وجہ ان کا اپنی ماں محترمہ اندرا گاندھی کے مقابلہ راجیو گاندھی کو نرم دل اور دُور اندیش تصور کرتے تھے۔ مگر وہ بابری مسجد کے معاملہ میں ۱۹۸۶ء میں ارون نہرو اور ویر بہادر سنگھ کی سازش کے شکار ہو گئے اور بابری مسجد کا تالا پوجا کے لئے کھول دیا گیا۔ اپنی اس غلطی کو محسوس کرنے کے بعد وزیراعظم راجیو گاندھی نے ارون نہرو کو وزارت سے اور ویر بہادر سنگھ کو اُتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کے عہدہ سے دستبردار کر دیا۔ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی نے وزیراعظم راجیو گاندھی سے ملاقات کر کے کچھ نام نہاد ترقی پسند مسلم قائدین سے محتاط رہنے کا مشورہ دیا جو مسلم خواتین بل میں رکاوٹ بن رہے تھے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے اُردو زبان وادب کے بارے میں خیالات ہیں کہ اُردو زبان ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی ضمانت ہے، مگر افسوس کہ اسے سرکاری سرپرستی سے محروم رکھا گیا۔

چند صوبائی حکومتوں نے اُردو کو صوبہ کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا جو قابل تعریف اور قابل تقلید بھی ہے۔ ایسے صوبوں میں سرکاری کاموں میں اُردو زبان کا استعمال ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود اُردو کے زوال کی ساری ذمہ داری ہم حکومت پر ڈال کر بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے بقول اُردو کا دم بھرنے والے حضرات اپنے بچوں کو اُردو سے دور رکھ کر انگریزی ذریعہ تعلیم کو فوقیت دیتے ہیں۔ ایسے حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم جس طرح اپنے بچوں کو قرآنِ پاک کی تعلیم کا انتظام کرتے ہیں بالکل اسی طرز پر بچوں کو گھر پر اُردو پڑھنے اور لکھنے کی تعلیم کا انتظام کریں تاکہ وہ اپنی مادری زبان میں اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کر سکیں۔ آج ملک میں اُردو زبان کو ہمارے مدارس ذمہ داری اٹھائے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صاحب نے غالب اکاڈمی نظام الدین دہلی کے آڈیٹوریم میں ہندوستان کے عظیم مجاہد آزادی قاضی محمد عدیل عباسیؒ کی کتاب کی رسم اجراء کے موقع پر قاضی صاحب کے ذریعہ قائم دینی تعلیمی کونسل کا ذکر کیا جنہوں نے اتر پردیش میں ہزاروں کی تعداد میں مکاتب قائم کیے ہیں جو الحمد للہ بخوبی دینی اور اُردو زبان کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اتر پردیش دینی تعلیمی کونسل کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی ان مدارس کی ذمہ داری بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کی تربیت میں ان کے چچا اور خسر حضرت مولانا عبد الماجد دریابادی کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔ انہوں نے ان کی اعلیٰ کردار سازی اور زندگی کے ہر شعبہ میں نہ صرف رہنمائی کی بلکہ اعلیٰ ذہن سازی بھی کی، اسی کا نتیجہ ہے کہ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی نے اپنی ۳۴ سالہ درس و تدریس کے دور میں متعدد قابل اور ذہین طالب علم پیدا کیے جنہوں نے مستقبل میں پوری دُنیا میں اپنے استادِ محترم کا نام روشن کیا۔ ان کے ایک لائق شاگرد عابد اللہ غازی نے امریکہ کے شہر شکاگو میں ۱۹۸۳ء میں ''اقراء انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن'' قائم کیا ہے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یونین کے صدر رہ چکے ہیں، انہوں نے ہارورڈ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی اور دارالعلوم دیوبند سے بھی فارغ التحصیل ہوئے۔ عابد اللہ غازی نے اب تک دو سو کتابوں پر مشتمل انگریزی میں دینی نصابی کتابیں

شائع کی ہیں جو تقریباً چالیس ملکوں میں رائج ہیں۔ راقم السطور نے اپنے امریکہ کے سفرنامہ بعنوان ''امریکن مسلم'' تحریر کی تھی جو ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی۔ امریکہ کے شہر کے مشاہدات پر مبنی راقم السطور کی کتاب پر ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی نے دہلی سے شائع ہونے والے مشہور و معروف ادبی سہ ماہی رسالہ ''اُردو بک ریویو'' مدیر محمد عارف اقبال نے تحریر فرمایا ہے کہ کتاب ''امریکن مسلم'' کتاب کیا ہے؟ امریکن مسلمانوں کی دینی سرگرمیوں کا مرقع ہے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے ادبی ذوق اور اُردو زبان سے لگاؤ کا اندازہ اس بات سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اب تک سیکڑوں کتابوں پر پُر مغز تبصرہ کرچکے ہیں۔ ان کے تبصرہ کی خوبی یہ ہے کہ سبھی تبصرے معیاری، جاندار، پُر مغز اور معلوماتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ موصوف ہر موضوع کی کتب پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں خواہ کتاب دینی ہو یا انتہائی خشک موضوع پر مشتمل ہو۔ ہر موضوع پر ان کو دسترس حاصل ہے۔ دہلی سے محمد عارف اقبال کی ادارت میں سہ ماہی رسالہ ''اُردو بک ریویو'' شائع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی نے ہر طرح کی کتابوں پر اس رسالہ کے لئے تبصرے لکھے جسے مدیر رسالہ نے مرتب کرکے ''ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے تبصرے'' کے عنوان سے ایک 264 صفحات پر مشتمل کتاب شائع کی ہے۔ سب ہی تبصرے معیاری اور قابل مطالعہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صاحب مسلم مجاہد آزادی کے کارناموں پر لکھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ مجاہدین آزادی کی قربانیوں کا ذکر بہت سرسری طور پر کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کی ہمت اور استقلال و قربانیوں پر کتابیں تحریر کی جائیں تاکہ ہماری آئندہ نسلیں اپنے اسلاف کے کارہائے نمایاں سے بخوبی واقف ہوسکیں۔ فروری ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ میں خلافت کمیٹی کا سالانہ اجلاس رفاہِ عام کلب کے وسیع میدان میں منعقد ہوا تھا جس میں مولانا محمد علی جوہر تشریف لائے تھے ڈاکٹر صاحب کی یادداشت ماشاء اللہ بہت اچھی ہے اور صحت مند بھی ہیں۔ لہٰذا بغیر چھڑی کے چلنے کے عادی ہیں۔ ۹۵ سال کی عمر میں بھی اُردو زبان و ادب سے والہانہ لگاؤ ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اپنے مراسلات کے توسط سے معاشرے

کو درست کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ اکثر و بیشتر ان کے مراسلے اخباروں کی زینت بنتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی جب اپنے ریٹائرڈ بیٹے پروفیسر ڈاکٹر سلیم قدوائی کے فلیٹ میں رہتے ہیں تو راقم السطور کو ان کے نیاز کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ ایک دن محترم قدوائی صاحب سے کافی دیر تک گفتگو ہوئی۔ اور بر سبیل تذکرہ انہوں نے ایک بہت پُرانا واقعہ سنایا کہ معروف شاعر اور مشہور جج جناب اکبرالہ آبادی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے بیحد معتقد تھے۔ جب بھی دہلی تشریف لاتے اپنے عزیز دوست خواجہ حسن نظامیؒ کے ہمراہ روضہ پر حاضری ضرور دیتے اور بڑی عقیدت سے فاتحہ پڑھ کر ان کے حق میں بخشش کی دُعا کرتے۔ ایک دن خواجہ حسن نظامیؒ نے اکبرالہ آبادی سے کہا کہ حضرت قریب ہی مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی مزار ہے، آپ اس پر بھی فاتحہ پڑھ لیں۔ جواب میں اکبرالہ آبادی نے کہا کہ جس شاعر نے اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی جنت کے بارے میں یہ شعر کہا ہو:

ع ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کو بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

میں ایسے شاعر کے لئے دُعا نہیں کر سکتا۔

......☆......

محمد مسلم

ایک درویش صفت صحافی

ہندوستان میں چند ایسی بزرگ ہستیاں گزری ہیں جن کا نام کسی نہ کسی ادارہ سے جُڑا ہوا ہے کہ وہ لازم وملزوم بن گئے ہیں۔ مثلاً اگر آپ علی گڑھ مسلم نیورسٹی کا ذکر کریں تو بے ساختہ سر سیّد احمد خاں کا نام زبان پر آجاتا ہے۔ صحافت کی دُنیا میں لکھنؤ سے شائع ہونے والے اُردو روزنامہ ''قومی آواز'' کا نام زبان پر آتے ہی اس کے مدیر حیات اللہ انصاری کی شخصیت سامنے آجاتی ہے۔ ''صدقِ جدید'' مولانا عبدالماجد دریابادی کے ذاتِ گرامی کے بغیر نامکمل ہے۔ دینی نقطہ نظر سے اگر آپ جائزہ لیں تو قرآن کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' کا ذکر آتے ہی حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا خیال آتا ہے۔ گذشتہ اسّی سال کے طویل عرصہ سے شائع ہونے والا ماہناہ ''الفرقان'' حضرت مولانا منظور نعمانیؒ کے نام کے ساتھ منسوب ہے۔

میں ایک ایسی عظیم شخصیت کا ذکر خیر کرنا چاہتا ہوں جن کو ہندو پاک کا ہر تعلیم یافتہ فرد ان کے نام کے ساتھ ان کے تعلق سے بھی واقف ہے اور وہ عظیم شخصیت ہے جناب محمد مسلم صاحب کی، جن کا نام زبان پر آتے ہی جماعت اسلامی ہند کے روزنامہ ''دعوت'' کا خیال آتا ہے۔ گویا کہ مسلم صاحب اور دعوت اخبار لازم وملزوم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ روزنامہ یا سہ روزہ ''دعوت'' مسلم صاحب کے بغیر ادھوری تصور کی جائے گی۔ محمد مسلم صاحب کی زندگی کو سمجھنے کے لئے ان کی زندگی کے ہر پہلو پر گہری نظر ڈالنی پڑے گی جو نہ صرف قابل رشک ہے بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔ مسلم صاحب نے جس طرح مومنانہ زندگی گزاری ہے وہ غیر معمولی ہے۔ ان کی زندگی تقویٰ، خود اعتمادگی، قناعت، اللہ پر بھروسہ اور خدمت خلق کے جذبے کا مرکب ہے۔ درویش صفت محمد مسلم صاحب نے ظاہری نشو

دنیا کو کبھی اہمیت نہیں دی اور اللہ کی کی خوشنودی کے لئے پاکیزہ زندگی گزاری۔

محمد مسلم صاحب کی پیدائش ۲۰ ستمبر ۱۹۲۰ء کو بھوپال میں ہوئی تھی۔ بچپن ہی میں وہ یتیم ہو گئے تھے۔ والد سے قبل والدہ کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ اپنی نانہال میں رہنے لگے۔ نانا اور نانی کی سرپرستی میں انہوں نے عربی، فارسی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور ۱۹۳۵ء میں انہوں نے ہائی اسکول پاس کرلیا۔ انہیں اپنی کم مائیگی کا احساس تھا اور اعلیٰ تعلیم کے راستے مسدود ہونے کا بھی خیال تھا۔ اس کمی کو دُور کرنے کے لئے انہوں نے اپنے ذاتی مطالعہ کا سہارا لیا۔ صحافتی مزاج کے حامل تھے، لہٰذا ہمیشہ صحافتی زندگی کی تعمیر اور ترقی کے سلسلہ میں کوشش کرتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی معاشی بدحالی کی بھی فکر تھی۔ ان کی مفلوک الحالی نے ان کو کسی مستقل روزگار کی فکر میں مبتلا کیا لہٰذا ۱۹۳۸ء میں انہوں نے اخبار ''ندیم'' میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دینے کی ابتداء کی۔

جماعت اسلامی ہند کا ایک ہفت روزہ ''الانصاف'' الٰہ آباد سے شائع ہو رہا تھا۔ جو دہلی منتقل ہو گیا اور ''دعوت'' کے نئے نام سے نکلنے لگا۔ محمد مسلم صاحب بھوپال کے اخبار ''ندیم'' کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل کر کے روزنامہ ''دعوت'' دہلی کے مدیر معاون کے فرائض انجام دینے لگے۔ روزنامہ ''دعوت'' اپنے وقت کا بہت ہی مقبول اخبار تھا اور تعلیم یافتہ طبقے میں بہت دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ سیاسی خبروں کے علاوہ اخبار اسلامی ذہن سازی کا بھرپور مواد شائع کرتا تھا۔ لہٰذا اُردو داں طبقے کے اسلامی ذہن کے قاری کی پہلی پسند روزنامہ ''دعوت'' ہوا کرتا تھا۔

محمد مسلم صاحب غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ قناعت کا مادّہ ان کی خصلت کا ایک حصہ تھا۔ اپنی کوتاہ دامنی کی پرواہ کئے بغیر غیروں کی ایسی بے مثال خدمات انجام دی ہیں جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ محمد مسلم صاحب اپنے زمانہ کے درویش صفت قلندر انسان تھے، اللہ پر بھرپور ایمان اور یقین کا وہ نمونہ تھے۔ ان کے بارے میں یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی نئے جوتے نہیں خریدے۔ موچی کے ذریعہ مرمت شدہ پُرانے جوتے نصف قیمت کے خرید کر بقیہ رقم دین کے کاموں میں صرف کیا کرتے تھے۔

محمد مسلم صاحب کی زندگی کا ہر شعبہ سادگی، انکساری، عاجزی اور غریب پروری کی زندہ مثال تھی۔ کثیر الاولاد ہونے کے باوجود زندگی میں تنگی کا ذکر تک زبان پر نہیں لاتے تھے۔ لڑکوں کو تاکید تھی کہ اپنے خالی اوقات میں چھوٹے موٹے شریفانہ محنت کے کام کرنے سے گریز نہ کریں۔ پُرانی دہلی کے بازاروں میں بچوں نے کام کئے اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی اپنے اندر ہمت اور استقلال پیدا کیا۔ ایک بار مسلم صاحب نے پٹنہ کے قیام کے دوران اپنے میزبان کو حیرت میں ڈال دیا، جب ان کی چپل ٹوٹ گئی اور وہ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر اپنی چپل کی مرمت کراتے رہے اور موچی کے معاشی حالات کی جانکاری بھی لیتے رہے۔ پٹنہ کے صاحب حیثیت میزبان جو مسلم صاحب کے قدردان اور روزنامہ ''دعوت'' کے مستقل قاری تھے، جب ان کی نظر مسلم صاحب کی شیروانی پر پڑی تو ان کا سر چکرانے لگا کہ اتنی بڑی شخصیت ٹوٹی ہوئی چپل اور پھٹی ہوئی شیروانی میں ملبوس ہے۔ وہ سادگی کا ایسا ہی زندہ جاوید نمونہ تھے۔ محمد مسلم صاحب نے اسی سادگی کی راہ پر چل کر زندگی گزاری اور اپنے اہل وعیال کی کفالت کی۔ بچوں کی والدہ کا ان کی سادی زندگی کی ساتھی، قناعت پسندی ان کے مزاج کا حصہ بن چکا تھا۔ زندگی میں کبھی اُونچے لوگوں کو نہیں دیکھا بلکہ سماج میں کمزور طبقہ کی مدد کرنا اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا۔ جس رکشہ پر سفر کرتے اس کو اُجرت کے علاوہ سموسے اور جلیبی بھی سوغات میں دیتے۔ خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھانا کھلانا نیکی اور سخاوت کے زمرے میں شامل ہے۔ جس پر چل کر محمد مسلم صاحب پوری زندگی عمل پیرا رہے۔ ان کی مثالی زندگی کا ہر پہلو شاندار اور قابل تعریف تھا۔ درویش صفت شخصیت کے مسلم صاحب کی زندگی کا ہر عمل قابل تقلید تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کو خدمت خلق کے جذبے سے سرشار کر دیا تھا۔

محمد مسلم صاحب اس زمانہ کے صحافی تھے جب صحافت کی دُنیا خطرات سے گھری ہوئی تھی۔ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد حکومت کی کسی بھی پالیسی پر زبان کھولنا خطرہ کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لہٰذا محمد مسلم صاحب کو کئی بار جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ حقیقت پسند انسان تھے۔ حکومت کی ان کے ہر مضمون یا اداریہ پر نظر رہتی تھی۔

محمد مسلم صاحب کے دل میں قوم کا درد تھا اور ان کی دلی خواہش تھی کہ ہر مکتبۂ خیال کے سیاست داں، علماء اور دانشور ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہوں اور قوم کی فلاح کے لئے کوئی راہِ عمل ترتیب دیں جو قوم کے حق میں ہو۔ ان کی خاموش کوششوں سے ۸ راگست ۱۹۶۴ء کو لکھنؤ میں ایک کل ہند مسلم مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا۔ اس یادگار اجلاس میں ملک کے دانشور طبقہ نے شرکت کی جس میں ڈاکٹر سیّد محمود، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ (علی میاں)، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ، ملا جان محمد، حاجی محمد اسماعیل سلیمان سیٹھ کے علاوہ لکھنؤ کے مشہور و معروف معالج ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی جیسی دردمند شخصیتیں شامل تھیں۔ مسلم مجلس مشاورت نے قوم کی بہتری اور ترقی کے لئے متعدد لائحۂ عمل بنائے اور ان پر عمل بھی ہوا، مگر ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی صاحب نے جب مشاورت کے ایک حصہ کو سیاسی پارٹی ''مسلم مجلس'' میں تبدیل کیا تو حضرت مولانا علی میاںؒ، حضرت مولانا منظور نعمانیؒ اور ڈاکٹر سیّد محمود وغیرہ نے اس سے برائت کا اعلان کر دیا اور علاحدہ ہو گئے۔

محمد مسلم صاحب کی یہ بڑی خوبی تھی کہ حالات چاہے جتنے خراب ہوں، سارے راستے مسدود ہو چکے ہوں نکلنے کی کوئی سبیل نظر نہ آ رہی ہو پھر بھی وہ جوانمردی سے حالات سے مقابلہ کرتے تھے۔ سیاسی طور پر حق کے اظہار سے کبھی انہوں نے سمجھوتہ نہیں کیا۔ حاکم وقت کی خوشنودی کا کبھی رویہ نہیں اپنایا۔ بلکہ حق بات کہنے اور لکھنے سے گریز نہیں کیا۔ جس کے پاداش ان کو جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

خاکساری کا جو ریکارڈ قائم کیا اس کو توڑنا اب کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ بڑی بیٹی کی شادی کی دعوت اس طرح دی کہ اگر آپ بھوپال میں ہوں تو نکاح میں شامل ہو کر ممنون فرمائیں۔ لہٰذا جو بھی ملاقاتی دعوت ملنے پر آیا اسے گھر لے گئے اور جو بھی گھر میں پکا تھا پیش کر دیا۔ ایک بار ایسا بھی ہوا ہے کہ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کو گھر لے گئے اور کھانے پر سوکھی روٹی پیش کی۔ دو چار لقمے کے بعد ہی ڈاکٹر فریدی نے ہتھیار ڈال دیئے اور فرمایا کہ ''مسلم صاحب معاف کیجئے گا، میں نہیں کھا سکتا''۔

محمد مسلم صاحب آزادی سے قبل خاکسار پارٹی سے بھی منسلک تھے جو آزادی کی جدوجہد میں عمل پیرا تھی۔ انہوں نے آزادی کے لئے ہر طرح کی صعوبتیں اور تکالیف برداشت کیں، گویا مجاہد آزادی میں محمد مسلم صاحب کا نام فخر سے لیا جائے گا۔ آزادی کے لئے انہوں نے جیل کی مصیبتیں برداشت کیں۔ پولیس کے ڈنڈے کھائے، مگر اپنے موقف پر قائم رہے۔ قید کے دوران مسلم صاحب کے ایک ہمدرد نے ان کے خاندان کی مالی مدد کی پیشکش کی، جسے ان کے بچوں نے یہ کہہ کر ٹھکرادیا کہ ان کا حکم ہے کہ کسی سے مالی مدد نہ لینا۔

آزادی سے قبل جماعت اسلامی کے بانی حضرت مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تصانیف کے مطالعہ سے جماعت کے ہم خیال ہوئے اور باقاعدہ رُکنیت اختیار کرلی۔ مرکزی مجلس شوریٰ کے ایک زمانہ تک ممبر رہے۔ محمد مسلم صاحب کے تمام سیاسی قائدین سے قریبی تعلقات تھے۔ جواہر لعل نہرو، ڈاکٹر سیّد محمود، اندر کمار گجرال سے خصوصی تعلقات تھی۔ مشہور کالم نویس اور متعدد ملکوں میں ہندوستان کی نمائندگی کرنے والے کلدیپ نیّر مسلم صاحب سے بیحد قریب تھے۔ محمد مسلم صاحب نے اپنے عزیز ترین دوست کلدیپ نیّر کو کسی کے ذریعہ یہ پیغام بھی بھجوایا تھا کہ اسلام قبول کرلو تاکہ ہم تم جنت میں بھی ساتھ رہیں۔

اندر کمار گجرال صاحب جب ملک کے وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز ہوئے تو مولانا محمد مسلم صاحب نے اُردو صحافت کے ذمہ داران کی بے جا پریشانیوں کا ذکر کیا۔ انہوں نے عدلیہ پر بھی اُنگلی اُٹھائی کہ اُردو زبان سے ناواقف جج صاحبان بھی خبروں کے غلط ترجمے کی بنیاد پر فیصلے کرکے پریشانیوں میں مبتلا کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک بار وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ایک وفد کے ساتھ ملاقات کرکے گوش گزار کیا کہ انتظامیہ فرقہ پرستی اور نفرت کی بنیاد پر کارروائی کرتی ہے جو مناسب نہیں ہے۔ اس کی زندہ مثال اس زمانہ کا مشہور رسالہ ''بیسویں صدی'' کے مدیر خوشتر گرامی کی ہے جن کا طنزیہ کالم ''تیرونشتر'' عوام میں بیحد مقبول تھا مگر انتظامیہ اس کو فرقہ پرستی کی نظر سے دیکھتی تھی، کیونکہ اس کو اس حقیقت کا علم نہیں تھا کہ خوشتر گرامی ہندو ہیں اور ان کا نام لبھو رام ہے۔ محمد مسلم

صاحب کی کاوشوں سے صحافت پر انتظامیہ کی گرفت نرم پڑی اور لکھنے کی آزادی نصیب ہوئی۔

ہندوستان میں آج سے قبل ایسا دور کبھی نہیں گزرا ہے جب مسلمانوں کو دوسرے درجہ کا شہری کے طور پر دیکھا جاتا رہا ہو۔ مولانا محمد مسلم صاحب کے ہم عصر مدیر الجمعیۃ مولانا عثمان فارقلید، ’صدق جدید‘ کے مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ نے آریہ سماجی نظریات کے خلاف خوب خوب لکھا جس کے نتیجہ میں عوام میں پھیلے خوف و ہراس میں قدرے کمی واقع ہوئی۔ دہلی سے شائع ہونے والے ریڈینس کے مولانا فارقلید اور مولانا محمد مسلم صاحب کی سادی مثالی زندگی تھی۔ محمد مسلم صاحب کے خدمت خلق کا عالم یہ تھا دہلی میں ایک بار ایسا ہیضہ پھیلا کہ ہر گھر میں لاشیں پڑی سڑ رہی تھیں۔ مسلم صاحب نے اپنے خاکسار ساتھیوں کے ہمراہ ایسی خستہ لاشوں کو غسل دے کر اُن کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور قبرستان میں دفن کیا۔ محمد مسلم صاحب کی پوری زندگی دوسروں کے لئے وقف تھی۔ ’’دعوت‘‘ اخبار سے ان کی وابستگی عمر کے آخری دنوں تک رہی۔ دعوت میں ان کا ایک کالم ’’کچھ یادیں کچھ باتیں‘‘ بیحد مقبول ہوا تھا۔ اس عنوان کے تحت مولانا مسلم حالاتِ حاضرہ پر سیر حاصل گفتگو کرتے تھے جو راہِ عمل کی تصدیق اور عملی زندگی کی دعوت دیتا تھا۔ ہر موضوع پر انہوں نے قلم اٹھایا اور بے لاگ تبصرہ کیا جو مستقبل میں مشعل راہ بن گیا۔

مسز اندرا گاندھی وزیر اعظم حکومت ہند کے دورِ حکومت میں ۱۹۷۵ء میں پورے ملک میں ایمرجنسی لاگو کردی گئی۔ اخبارات اور ریڈیو پر پابندی عائد ہوگئی۔ جماعت اسلامی اور آر ایس ایس کو غیر قانونی جماعت قرار دے کر ان کے رہنماؤں کو جیل میں قید کردیا گیا۔ محمد مسلم صاحب انبالہ کی سینٹرل جیل میں قید کئے گئے، جس میں آر ایس ایس کے لیڈران بھی قید تھے۔ دو مختلف خیالات کے رہنماؤں کا جب اختلاط ہوا تو ایک دوسرے کو سمجھنے میں بھی آسانی ہوئی۔ آر ایس ایس کے لوگوں نے محمد مسلم صاحب سے اسلام کے بارے میں ان تمام شبہات جو اُن کے ذہن میں تھے جاننے کی کوشش کی، جسے مسلم صاحب نے دُور کر کے اسلام کی صحیح تصویر اور پیغام کو سمجھایا۔ محمد مسلم صاحب نے اپنی سادگی اور بردباری سے ان تمام حضرات کی غلط فہمیوں کو نہ صرف دُور کیا بلکہ وہ اسلام کی

خوبیوں کے قائل ہوئے اور اس بات کا اعتراف کیا کہ ہم ابھی تک غفلت میں تھے، اب ہم اسلام کی صحیح تعلیم کو سمجھ سکے ہیں۔ محمد مسلم صاحب کا جیل میں رہ کر اسلام کی تبلیغ کرنا بھی ایک کارنامہ تھا۔

مولانا محمد مسلم صاحب کی قابل تقلید زندگی اور صحافتی کارناموں کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

۱۹۴۷ء کے فساد زدہ ماحول میں اخبار کے لئے دہلی کا ٹرین سے سفر کرنا جہاں پولیس ہر کمپارٹمنٹ میں دریافت کر رہی ہو کہ اگر کوئی اس ڈبہ میں مسلمان ہو تو اُتر جائے، اسے ہم محفوظ ڈبہ میں منتقل کردیں گے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے جسے فراموش کردیا جائے۔ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اخبار کے لئے کاغذ فساد زدہ علاقہ دہلی سے خریدنے جانا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا جبکہ چہرہ پر خشخشی داڑھی بھی تھی اور ٹوپی سے بہ آسانی شناخت واضح تھی۔ ہندوستان میں ایسے صحافی کم گزرے ہیں کہ سڑکوں پر لاشیں پڑی ہوں اور صحافی اپنے اخبار کے لئے کاغذ کے لئے جان کو خطرہ میں ڈال کر اپنے مقصد کو پورا کرے۔ یہ خوبی صرف محمد مسلم صاحب میں تھی۔ جنہوں نے ایسے خطرناک اور نامساعد حالات میں اخبار کے لئے کام کیا۔ کام کو وہ عبادت تصور کرتے تھے۔ کولر کی ٹھنڈی ہواؤں میں بیٹھ کر اداریہ لکھنے والے تو بہت صحافی گزرے ہیں، مگر سخت گرمی میں بغیر پنکھے کے ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر اپنے اخبار کے لئے مضامین لکھنا محمد مسلم صاحب کا ہی کارنامہ تھا جو آج یادگار بن گیا۔ ان کی غربت میں گزری ہوئی زندگی آج کے خوشحال مسلمانوں ے لئے مشعل راہ ہے اور ان کی صحافتی زندگی ان نوجوانوں کے لئے قابل تقلید ہے جو صحافت کے میدان میں کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ روزنامہ "دعوت" کے ذریعہ جو پیغام تقریباً چالیس سال قبل دیا گیا، وہ پیغام آج بھی مشعل راہ ہے۔ اخبار "دعوت" کے ذریعہ ایک مشن کا پیغام پہنچانا بھی ایک مقصد تھا جس میں محمد مسلم صاحب کامیابی کی منزل تک پہنچے۔ انہوں نے اپنے پیغام کو ہندو پاک کے لاکھوں قاری تک پہنچا کر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی۔

مولانا محمد مسلم صاحب نے اپنے روزنامہ "دعوت" میں لکھنؤ کی دو بہت اہم ہستیوں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اور کانگریس قدر آور لیڈر سی بی گپتا کا ذکر کیا ہے۔ ان دونوں حضرات میں نظریاتی اختلافات تھے۔ ڈاکٹر فریدی کانگریس مخالف ذہنیت کے حامل تھے جبکہ سی بی گپتا اُتر پردیش کے

بڑے کانگریسی لیڈروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ انتخابی تقریروں میں اکثر سنجیدہ نمائندے بھی غیر سنجیدگی کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ سی بی گپتا کے ساتھ ہوا جب انہوں نے ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کے لئے کہہ دیا کہ وہ انہیں پاکستان بھجوادیں گے۔ جوابی حملہ میں ڈاکٹر فریدی نے کہا کہ آپ مجھے پاکستان تو نہیں بھجوا سکتے مگر میں بحیثیت ایک ڈاکٹر کے آپ کو پاگل خانہ بھجوا سکتا ہوں۔ یہ اس دور کی بات ہے کہ جب زبانی جنگ، ذاتی تعلقات پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ اعلیٰ ظرفی کا ثبوت یہ تھا کہ الیکشن کے بعد ایک ہی ٹیبل پر گفتگو بھی ہوتی تھی اور خورد و نوش بھی۔ اس کی زندہ مثال یہ ہے کہ ایک ہی ٹرین اور ایک ہی کمپارٹمنٹ میں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اور سی بی گپتا لکھنؤ سے دہلی جا رہے تھے۔ سفر کے دوران سی بی گپتا پر دل کا دورہ پڑا، حالت نازک ہوگئی، جیسے ان کا آخری وقت آ گیا ہو۔ ڈاکٹر فریدی نے فوراً اپنا میڈیکل بکس نکالا اور گپتا جی کو لگاتار کئی انجکشن دیئے جس سے ان کی بگڑتی حالت میں سدھار آنے لگا۔ غازی آباد میں ڈاکٹروں کی ٹیم بلوائی گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ گپتا جی کی جان بچ گئی۔ وہ زندگی بھر ڈاکٹر فریدی کے احسان مند رہے۔ اور ۱۹۷۴ء میں جب ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کا انتقال ہوا تو تعزیت کرنے والوں میں سی بی گپتا سرِفہرست تھے۔

محمد مسلم کے ایک غیر مسلم دوست جو آر ایس ایس کے سنچالک بھی تھے، سخت بیمار پڑے اور اسپتال میں ہی چل بسے۔ بھوپال میں ان کا کوئی نہیں تھا اور آر ایس ایس کے تمام سنچالک ناگپور کی کسی بڑی کانفرنس میں شرکت کرنے گئے ہوئے تھے۔ لہٰذا مسلم صاحب نے اپنے آدمیوں کا انتظام کیا۔ اتفاق سے جمعہ کا دِن تھا۔ اس نامعلوم آر ایس ایس کارکن کی ارتھی ایسے شان سے اُٹھی کہ لوگ دیکھتے رہ گئے۔ مسلمان دوکانداروں نے اپنی اپنی دکانیں بند کردیں اور آر ایس ایس کے سنچالک کے جنازہ میں صرف سفید کرتا پاجامہ اور ٹوپی ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ ہندو رسم و رواج کے مطابق لاش کو نذرِ آتش کردیا گیا۔ اس واقعہ کے چندروز بعد دو سنچالک نے مسلم صاحب سے مل کر کچھ رقم پیش کی جسے انہوں نے یہ کہہ کر واپس کردیا کہ سردیوں کا زمانہ ہے، اس رقم سے غریبوں میں کمبل تقسیم کردیجئے۔ دونوں سنچالک پھر محمد مسلم صاحب سے ملنے آئے کہ ہمیں مسلمانوں کے

بارے میں بہت غلط باتیں بتائی گئی تھیں، مگر آپ لوگوں کا رویہ دیکھ کر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم آر ایس ایس سے استعفیٰ دے رہے ہیں، اس کی کاپی دکھانے آئے ہیں۔

میں نے مولانا محمد مسلم صاحب کو درلیش صفت صحافی اس لئے کہا ہے کہ جب وہ دہلی کی سینے کو شل کر دینے والی سردیوں کے دِنوں میں ننگے بدن گھر میں داخل ہوئے تو سب کو حیرت ہوئی کہ آخر ماجرہ کیا ہے۔ ان کی بیگم نے وجہ دریافت کی تو مسلم صاحب نے فرمایا کہ سڑک پر ایک شخص ننگے بدن ٹھنڈک سے ٹھٹھر رہا تھا۔ میں نے اپنی قمیص اُتاری اور اس کو پہنادی۔ مسلم صاحب کی زندگی میں ایسے واقعات بہت آئے ہیں۔ کیونکہ خدمت خلق اُن کی خصلت میں شامل تھا کہ مجبور کی مدد کرو، اللہ تمہارا مددگار ہوگا۔ پوری زندگی ایک چھوٹے سے مکان میں گیارہ افراد کے ساتھ بمشکل گزر بسر کی، مگر کسی کے آگے دست دراز نہیں کیا۔ کرائے کے مکان میں گزر بسر کی۔ اپنی آبائی زمین کو بھی ایک ضرورت مند کو دے دی۔ انہوں نے کبھی اپنے بارے میں نہیں سوچا بلکہ ہمیشہ دوسروں کے لئے ہر قدم پر کھڑے نظر آئے۔ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی انسان سے اپنی پریشانیوں کا ذکر تک نہیں کیا۔ قناعت پسندی کے وہ زندہ مثال تھے۔

۳/جولائی ۱۹۸۶ء کو جب ان کا انتقال ہوا تو گھر کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ لہٰذا اُن کی تجہیز و تکفین کے لئے ان کے بچوں کو انتظام کرنا پڑا۔ پُرانی دہلی میں واقع قبرستان مہدیاں میں سپردِ خاک ہوئے۔ یہ قبرستان درگاہ شاہ ولی اللہؒ کے تحت آتا ہے۔ مولانا محمد مسلم صاحب کا آخری وقت تمام مسلمان بھائیوں کے لئے سبق آموز ہے۔ جس جائے نماز پر فجر کی نماز ادا کی اسی پر آخری سانس لی۔ ان کے انتقال کی خبر ریڈیو اور ٹی وی پر نشر ہوئی۔ بلٹز اُردو نے اپنے اخبار میں اداریہ لکھا

ع "زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے"۔

......☆......

سیّد سبطِ رضی

ہندوستان کی معروف سیاسی وسماجی شخصیت

دُنیا میں ایسے عظیم انسانوں کا وجود قائم ہے جو زمین سے اُٹھے اور فلک پر ستارہ بن کر ساری کائنات میں چھا گئے۔ ایسے لوگوں کے اندر اللہ تعالیٰ محبت، اخوت، کنبہ پروری، حقوق العباد کا احساس اور اس کی ادائیگی کے انمول جذبہ سے ان کے دلوں کو سرشار کر دیتا ہے جو خدا کی مخلوق سے والہانہ پیار کرتے ہیں۔ ایسے نیک بندے اپنے چھوٹوں سے پیار اور بزرگوں کی دل کی گہرائیوں سے قدر کرتے ہیں۔ یہی ان کی متاعِ زندگی قرار دی جاتی ہے۔ دُنیا ایسے انسانوں سے بھی خالی نہیں ہے جن سے مل کر دلی سکون حاصل ہوتا ہے اور مکرر ملاقات کی تمنا باقی رہتی ہے۔

ہندوستانی سیاست کے عظیم سپاہی کل ہند کانگریس پارٹی کے رُکن اور صوبہ جھارکھنڈ اور اُڑیسہ کے سابق گورنر عزت مآب سیّد سبط رضی کی شخصیت ان تمام خوبیوں سے مزین ہے۔ اعلیٰ اخلاق کا نمونہ سیّد سبط رضی صاحب سے ملاقات کرنے والا ہر شخص ان کی محبت وخلوص کا قائل ہو جاتا ہے۔ سبط رضی صاحب کی شخصیت میں ایسی جاذبیت ہے کہ ہر شخص کو یہ گمان گزرتا ہے گویا وہ ان سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ ہر شخص سے اس طرح ملتے ہیں کہ گویا وہ سب سے زیادہ آپ کو جانتے ہیں۔ سبط رضی صاحب بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ان کا اعلیٰ اخلاق ہونا ان کے ضمیر میں شامل ہے۔

سیّد سبط رضی صاحب کی پیدائش ۷؍مارچ ۱۹۳۹ء کو قصبہ جائس، ضلع رائے بریلی (یوپی) میں والد سیّد وراثت حسین اور والدہ رضیہ بیگم کے گھر میں ہوئی تھی۔ حسین آباد لکھنؤ سے ہائر سکنڈری اسکول، شیعہ کالج اور لکھنؤ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی، جہاں انہوں نے بی کام اور ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ کورٹ میں وکالت کی ابتداء کی مگر طبیعت میں کچھ کرنے کا جوش اور

ولولہ تھا جو انہیں سیاست کے میدان میں اتفاقیہ لے آیا۔

سیّد سبط رضی صاحب ایک اچھے مقرر اور اعلیٰ تنظیمی صلاحیت کے مالک ہیں۔ حالاتِ حاضرہ پر ان کی گہری نظر رہتی ہے۔ ان ہی صلاحیتوں کی بنیاد پر رضی صاحب نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز لکھنؤ اسمبلی کے ایک الیکشن سے کیا جو ڈائر میکن (موجودہ موہن میکن) کمپنی کے مالک وی، آر، موہن اور کانگریس پارٹی کے نمائندہ اور اُردو کے مشہور و معروف شاعر پنڈت آنند نرائن ملاّ کے درمیان ہونے والا تھا۔ سیّد سبط رضی صاحب نے اپنی اُردو دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے کانگریس پارٹی کے پنڈت آنند نرائن ملاّ کی حمایت میں ایک اعلیٰ مقرر کے وہ جوہر دکھائے جسے لکھنؤ کی عوام فراموش نہیں کر سکی ہے۔ اس انتخابی مہم نے سبط رضی صاحب کی زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز کیا، جہاں ان کی بے پناہ صلاحیتیں اُبھر کر سطح پر آ گئیں۔ کانگریس پارٹی ہائی کمانڈ کی نظریں سبط رضی صاحب پر مرکوز ہو گئیں اور وہ ہندوستان کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے قریب آ گئے۔ وزیر اعظم مسز گاندھی نے سیّد سبط رضی صاحب پر اعتماد کیا جس کے نتیجہ میں رضی صاحب وزیر اعظم کے بڑے بیٹے راجیو گاندھی سے بیحد قریب ہو گئے۔ وزیر اعظم کی حیثیت سے راجیو گاندھی نے سیّد سبط رضی صاحب کی عزت افزائی کی اور ان کو بیشتر سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کی ذمہ داری سونپی۔

سیاسی طور پر سیّد سبط رضی صاحب نے بڑا لمبا سفر طے کیا ہے۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۵ء تک راجیہ سبھا کے رُکن رہے۔ اس کے بعد انہوں نے کانگریس پارٹی کے جنرل سکریٹری کا عہدہ سنبھالا وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی قیادت میں دہلی میں ہوئی نویں ناوابستہ ملکوں کی کانفرنس میں بحیثیت ممبر ۱۹۸۳ء میں شریک ہوئے۔ اُتر پردیش کے وزیر تعلیم واوقاف کی ذمہ داری بخوبی نبھائی اور صوبہ کے تعلیمی نظام میں غیر معمولی ترقیاتی کام انجام دیئے جسے صوبہ کی عوام کبھی فراموش نہیں کر سکتی ہے۔

۱۹۹۵ء اور ۱۹۹۶ء میں سیّد سبط رضی مرکزی حکومت میں بحیثیت اسٹیٹ وزیر داخلہ کی ذمہ داریاں بخوبی انجام دیں۔ اسی زمانہ میں اُڑیسہ کے پورولیا علاقہ میں فضا سے کثیر تعداد میں گمنام طاقتوں نے بے شمار خطرناک ہتھیار زمین پر گرائے تھے جس کی انکوائری کے لئے آپ گورکھپور

ہوتے ہوئے پورولیا تشریف لے گئے تھے۔ سبط رضی صاحب نے ایک کامیاب وزیر داخلہ کا کردار ادا کیا جو تاریخ میں درج ہے۔

۱۹۵۶ء میں لکھنؤ کے ایک ادبی اور سماجی شخصیت جناب ابصار عبد العلی نے ''انجمن اطفالِ ادب'' کی بنیاد ڈالی۔ بچوں کی ذہنی نشو و نما اور ادبی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا انجمن کا نصب العین تھا جس میں ابصار عبد العلی صاحب بہت حد تک کامیاب رہے، مگر ترکِ وطن کر کے وہ کراچی پاکستان چلے گئے۔ انجمن کے قیام میں ابصار صاحب کے ہمنوا بچوں کے ادب سے دلچسپی رکھنے والی شخصیت جناب سعد الدین احمد عندلیب کی تھی۔ ابصار عبد العلی کی غیر موجودگی میں سعد الدین عندلیب نے انجمن کو ایک بالکل نیا آیام دیا اور ان کی مردم شناس نگاہوں نے سیّد سبط رضی صاحب کو انجمن کی صدارت کی ذمہ داری سونپی جو ہنوز قائم ہے۔ سیّد سبط رضی صاحب کی سیاسی زندگی سے قبل انجمن ادبِ اطفال کے توسط سے صوبہ اُتر پردیش میں خصوصاً اور پورے ملک میں عموماً شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ انجمن ادبِ اطفال کے سرپرستوں میں مرکزی وزیر جناب چندر جیت یادو اور ڈائر میکن کے وی. آر. موہن شامل تھے۔ لکھنؤ کے قلب امین آباد میں چودھری حیدر حسین صاحب کی کوٹھی کے ایک کمرے میں انجمن کا دفتر اور بچوں کی ''چاچا نہرو لائبریری'' قائم ہوئی۔ سبط رضی صاحب نے اٹھارہ ممبران پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جن کو انجمن کی ادبی اور ثقافتی ذمہ داری سونپی گئی۔ مسز اختر محسن یزدانی کو نائب صدر، سعد الدین عندلیب کو جنرل سکریٹری، راقم السطور کو ادبی سکریٹری اور معظم جعفری کو لائبریرین کا ذمہ دار بنایا گیا۔ ہر اتوار کی شام کو بچوں کی ادبی نشست ہوتی جس میں بچے اور بڑے اپنی نگارشات پڑھ کر سناتے اور اس پر سیر حاصل تبصرہ ہوتا تھا۔

سیّد سبط رضی صاحب انجمن ادبِ اطفال کا ہر سال ایک ہالی ڈے ہوم کا پندرہ دنوں کا کیمپ نینی تال کے ایار پاٹا علاقہ میں منعقد کرتے تھے، جس میں لکھنؤ اور قرب و جوار کے پچاس بچے حصہ لیتے تھے۔ پندرہ دنوں تک بچے اپنا بینک، اپنا پوسٹ آفس اور دیگر ثقافتی ذمہ داریاں سنبھالتے تھے جس کے ذریعہ بچوں کو خود اعتمادگی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا اور مستقبل میں ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت

سے اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوتے تھے۔

انجمن ادبِ اطفال لکھنؤ کے تعلق سے خاکسار ۱۹۵۸ء سے جڑا ہوا ہے۔ انجمن نے سیّد سبط رضی صاحب کی سرپرستی میں ایک خاندان کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس کا ہر رُکن خاندان کے ایک فرد کی حیثیت رکھتا ہے۔ موصوف سے میرے گذشتہ پچپن سال سے خوشگوار تعلقات ہیں۔ میں بذاتِ خود سیّد سبط رضی صاحب کی بارات لے کر لکھنؤ سے ۱۹۷۳ء میں علی گڑھ گیا تھا جہاں نواب چھتاری صاحب کے خاندان سے تعلق رکھنے والی محترمہ چاند فرحانہ سے رضی صاحب کا نکاح ہوا تھا۔ دیرینہ تعلقات کی بنیاد پر خاکسار نے سیّد سبط رضی صاحب کے بڑے بیٹے سیّد محمد رضی کی بارات دہلی سے علی گڑھ میں شرکت کی تھی اور محمد رضی کا دعوتِ ولیمہ جھارکھنڈ کی راجدھانی رانچی کے راج بھون میں ہوا تھا۔ انجمن ادبِ اطفال کے سارے ممبران اس شاہانہ تقریب میں مدعو تھے اور سب کا قیام گورنر ہاؤس میں تھا۔ عزت مآب سیّد سبط رضی صاحب نے موجودہ اور سابق وزیر اعلیٰ اور ان کے رفقاء کو مدعو کیا تھا۔ صوبہ کے تمام اعلیٰ حکام اور سیاست دانوں نے اس یادگار تقریب میں شرکت کی تھی۔ انتظامی اُمور کے ماہر سیّد سبط رضی صاحب نے اپنے تمام قریبی دوستوں کے لئے راج بھون کے کمروں میں ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا اور ہر کمرہ کا کوئی نہ کوئی نام تھا۔ مجھے جس کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا اس کا نام ''سرسوتی'' تھا۔ اسی طرح ہر کمرہ اپنا ادبی اور تاریخی پس منظر بیان کرتا تھا۔

اپنے دیرینہ تعلقات کی بنیاد پر میں اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہوں کہ سیّد سبط رضی میرے بھائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے تمام ملاقاتیوں سے تعلقات نبھانے کا ہنر جانتے ہیں۔ ہر شخص، جو ایک بار بھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل کر چکا ہے وہ ان کے خلوص ومحبت کو فراموش نہیں کر پاتا ہے اور مزید ملاقات کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اپنے اخلاق اور اعلیٰ ظرفی سے سیّد سبط رضی صاحب ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ انجمن ادبِ اطفال کے تمام ممبران قدیم تعلقات کی بنا پر اُن کی بیحد عزت کرتے ہیں اور اپنا سرپرست تصور کرتے ہیں۔ میری نظر میں کوئی ایسی شخصیت نہیں گزری ہے جو سیّد سبط رضی سے اختلاف رکھتی ہو۔ وہ ایک اچھے انسان ہی

نہیں بلکہ انسان دوست بھی ہیں۔ اچھے مقرر کے علاوہ وہ ایک اچھے مرثیہ خواں بھی ہیں جن کے پروگرام دُوردَرشن پر نشر کیے جاتے ہیں۔

سابق گورنر جھارکھنڈ واڑیسہ سیّد سبط رضی نے پہلا بیرونی ملک کا دورہ صوفیہ (بلغاریہ) کا اس وقت کیا تھا جب وہ انجمن ادبِ اطفال لکھنؤ کے صدر تھے اور انہوں نے بین الاقوامی یوتھ فیسٹول میں ہندوستان کی نمائندگی کی تھی۔ اپنی سیاسی زندگی میں انہوں نے بیشتر ملکوں کا دورہ کیا جس میں امریکہ، روس، ایران، ترکی، فلی پینس، مصر، سنگاپور، گریس، ہانگ کانگ، کنیڈا، سوئزرلینڈ، فرانس، جرمنی، افغانستان، نامبیا، پرتگال، انگلینڈ، ملیشا اور یونائیٹڈ عرب امارات شامل ہیں۔ سیّد سبط رضی کی شخصیت اُردو زبان وادب سے گہرے لگاؤ کی ترجمانی کرتی ہے۔ انہوں نے کانگریس پارٹی کے ایسوسیٹیٹ جرنل لمیٹڈ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے اُردو روزنامہ ''قومی آواز'' ہندی روزنامہ ''نوجیون'' اور انگریزی ڈیلی ''نیشنل ہیرالڈ'' کی سرپرستی کی۔ یہ اخبارات اپنے وقت کے تینوں زبانوں کے بہت ہی معیاری اخبار تصور کیے جاتے تھے۔ آزادی کے بعد ملک کی ترقی اور نشو ونما میں ان اخبارات کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ سیّد سبط رضی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل نہیں کی مگر ۲۰۰۰ء تک سابق گورنر رضی صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر رہے۔

سیّد سبط رضی صاحب زمینی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی زندگی کا ابتدائی دور جدوجہد کا دور رہا ہے۔ جسے انہوں نے مشقت سے نبھایا ہے۔ اپنے پیروں پر خود کھڑے ہوئے اور اپنی بڑی اور چھوٹی بہن کے لئے خوشیاں تلاش کرتے رہے۔ تعلیمی دور میں لکھنؤ کے چند پرائیویٹ اداروں میں پارٹ ٹائم خدمات انجام دیں جو ان کی کفالت کا ذریعہ بنا۔ اپنا ذاتی مکان نہیں تھا، کرائے کے مکان سے اپنی زندگی کی ابتداء کی اور ذاتی اخراجات کے لئے لکھنؤ کے حضرت گنج میں واقع کوزی کارنر اور ہوٹل کرشنا کے اکاؤنٹ کی ذمہ داری لی اور مقامی بزنس مین پریم نرائن ٹنڈن کی ایما پر اپنی خدمات پیش کیں جس کے عوض انہیں ایک سو روپیہ محنتانہ ملتا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ قابل تحریر ہے کہ سیّد سبط رضی صاحب جب اتر پردیش کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے دہلی سے لکھنؤ تشریف لائے تو کرشنا ہوٹل کے مالکان نے آپ سے گزارش کی کہ ہم آپ کی خدمت

میں سو روپیہ ماہوار پیش کرنا چاہتے ہیں جسے رضی صاحب کی اعلیٰ ظرفی نے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے قبول فرمالیا اور اس طرح انہیں سو روپیہ ماہوار کا تحفہ ملتا رہا۔

سیّد سبط رضی صاحب کی شخصیت میں اتنی جاذبیت ہے کہ جو بھی ان کے حلقہ میں آیا ان کا معتقد ہوگیا۔ اعلیٰ اخلاق کے نمونہ والی شخصیت کے حامل ہیں۔ لہٰذا ہر محفل میں ان کی انتہائی قدر و منزلت ہے۔ ان کی شرکت کسی بھی ادبی یا مذہبی محفل کی کامیابی کی ضمانت تصور کی جاتی ہے۔ دُنیا کے ہر موضوع پر گفتگو کرنے کے عادی ہیں۔ وسیع معلومات کی بنیاد پر ان کی تقاریر بہت ہی اعلیٰ پائے کی اور معیاری ہوتی ہیں جو سامعین کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔ خاکسار کو یہ شرف حاصل ہے کہ گذشتہ پچپن سالوں سے سیّد سبط رضی صاحب سے تعلقات قائم ہیں۔ وہ ایک ایسی مقناطیسی شخصیت کے مالک ہیں جنہیں کوئی فراموش نہیں کرسکتا۔ اعلیٰ ظرفی کا نمونہ رضی صاحب نے ہر شخص پر اپنی محبت و خلوص کا سکّہ بیٹھا دیا ہے۔ ایسی پُرکشش شخصیت سے قریب ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کی کمی نہیں ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ سیّد سبط رضی صاحب سے سب سے زیادہ قربت کا دعویٰ کرنے والی صرف ایک شخصیت تھی جو اب اس دُنیا میں نہیں رہی اور وہ تھے انجمن ادبِ اطفال لکھنؤ کے جنرل سکریٹری جناب سعد الدین احمد عندلیب۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ ان کے انتقال پُرملال کی افسوسناک خبر سن کر سبط رضی صاحب، بیگم چاند فرحانہ اور خاکسار دہلی سے لکھنؤ بذریعہ طیارہ پہنچے تھے اور اُن کے تجہیز و تکفین میں شریک ہوئے تھے۔

سیّد سبط رضی صاحب کے بارے میں مرحوم سعد الدین عندلیب کا ایک مختصر نوٹ ملا ہے جس میں وہ رقمطراز ہیں کہ ”عالمی شہرت کے حامل عالموں اور باکمال ہستیوں کے خاندان میں ۷/مارچ ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ سیّد سبط رضی کا آبائی وطن جائس اور علمی وطن لکھنؤ ہے۔ یہیں ان کی نشو و نما ہوئی، یہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اگر وہ سیاست میں نہ آئے ہوتے تو ایک کامیاب وکیل یا چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ ہوتے“۔

حُسین اَمین

اُردو کے مشہور و معروف ادیب اور ممتاز صحافی

اُردو دُنیا کے مشہور و معروف ادیب اور ممتاز صحافی حسین اَمین کی پیدائش ۸؍جولائی ۱۹۳۷ء کو لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ اودھ کی راجدھانی لکھنؤ کو عام طور سے پوری دُنیا میں تہذیب وتمدن اور نوابوں کے شہر سے جانا جاتا ہے۔ بلاشبہ لکھنوی تہذیب کا کوئی جواب نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ تو در کنار، جُہلا میں جو شرافت، نفاست اور نرم گوئی کا رواج عام ہے وہ بہت سے شہروں کے تعلیم یافتہ حضرات میں ناپید ہے۔ حتیٰ کہ جب لکھنؤ کی نزاکت اور شرافت کی بات ہوتی ہے تو لکھنؤ کے تانگے والوں کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ لکھنؤ کے قدیم باشندے تانگے والے آج کی تہذیب اور تمدن کی نمائندگی کرتے ہیں، اگر سواری نے کم پیسوں کی بات کی تو تانگے والے برجستہ کہتے ہیں حضور ذرا آہستہ بولئے، میرے گھوڑے نے سن لیا تو ناراض ہو جائے گا۔ لکھنؤ کا ذکر ہو اور لکھنؤ کے نوابوں کا تذکرہ نہ ہو یہ ناممکن ہے۔ آج بھی جبکہ نوابین کا عہد ختم ہو چکا ہے، خاندانی نوابوں کی نشست و برخاست میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ وثیقہ دار نوابوں کے محل نما مکانوں میں ان کے آباء واجداد کی قد آدم تصویریں جو آئیل پینٹ سے بنی ہوئی ہیں دیواروں کی زینت ہیں۔ بیگمات کے ناز و نخروں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ لکھنؤ وہ شہر ہے جو یہاں آیا یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ بڑی کشش اور جاذبیت ہے جو کسی دوسرے شہر کو نصیب نہیں۔

لکھنؤ شہر کو ان خوبیوں کے علاوہ اُردو ادب کے حوالے سے بھی جانا جاتا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ اُردو بان وادب کے مراکز رہے ہیں۔ اُردو، فارسی اور عربی زبان وادب کی ترقی میں لکھنؤ کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ اُردو زبان کی پرورش اور پروان میں لکھنؤ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں

کے علاوہ لکھنؤ کے غیر مسلم اُردو نوازوں نے اس پیاری زبان کی ترقی میں عظیم خدمات انجام دی ہیں وہ اُردو ادب کی تاریخ میں درج ہیں اور ان کی خدمات کے ذکر کے بغیر اُردو زبان و ادب کی تاریخ نامکمل تصور کی جائے گی۔ پنڈت برج نرائن چکبست، پنڈت آنند نرائن ملاّ، رام لعل، کرشن بہاری نور لکھنوی، بشیشر پردیپ اردو ادب کی وراثت ہیں۔

ایک سو اسّی سال قبل یعنی ۱۸۸۵ء میں لکھنؤ شہر میں ۲۲ سال کی عمر میں منشی نول کشور نے 'نول کشور' پریس قائم کیا تھا۔ اُردو اور فارسی کی بیشتر کتابیں نول کشور پریس کی شائع شدہ ہیں۔ قرآنِ مجید کے علاوہ حدیث کی سبھی کتابیں اس پریس سے شائع ہوئیں۔ میں نے اپنے والد مرحوم کی ذاتی لائبریری میں ڈیڑھ سو سال قدیم مشکوٰۃ شریف دیکھی جس کا عربی متن ہرے رنگ میں ہے اور اس کا ترجمہ سفید چھپا ہے۔ آج پوری دُنیا میں دین پر ریسرچ کرنے والے پنڈت نول کشور کی شائع عربی اور فارسی کتب سے استفادہ اٹھا رہے ہیں۔ پنڈت جی قرآن کی طباعت کو اپنی خاص نگرانی میں کراتے تھے۔ ان کے پریس کے کسی بھی ملازم کو بلا وضو پریس کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر وضو ٹوٹ گیا تو اس کو پریس کے اندر وضو کر کے ہی جانے کی اجازت ملتی تھی۔ پنڈت نول کشور کا قرآن اور احادیث کے تئیں عقیدت، عزت اور احترام قابلِ تحسین ہے۔

۱۸۵۸ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان تقریباً چھ ہزار عربی، اُردو، سنسکرت، ہندی اور پشتو زبان کی کتابیں بوسیدہ ہو کر برباد ہو گئیں۔ کتابوں کی اشاعت کے بادشاہ منشی نول کشور نے اپنے دیرینہ دوست مصطفےٰ خاں صاحب آف کانپور کے توسط سے رسالہ ''اودھ'' کا اجراء کیا جو کچھ دنوں کے بعد بند ہو گیا۔ ہندو ہونے کے باوجود پنڈت نول کشور نے بے انتہا دینی کتب کی اشاعت کی جو آج دُنیا کی ہر نیشنل لائبریری کی زینت ہیں۔ شاید ہی کوئی اعلیٰ پیمانے کی لائبریری ہو جہاں نول کشور پریس کی شائع شدہ کتب نہ ہوں۔ پنڈت جی کا اُردو، فارسی، عربی، ہندی اور سنسکرت کی کتب کی اشاعت کا کارنامہ قیامت تک یاد کیا جائے گا۔ ان کی اس بیش بہا خدمت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ لکھنؤ کے حضرت گنج کے قریب ان کے نام سے منسوب ''نول کشور روڈ'' ہے۔ پنڈت نول کشور کی ادبی

خدمات کو فراموش کرنا ناممکن ہے۔ جنہوں نے بڑے تزک واہتمام سے ''دیوان غالب'' وغیرہ کو اپنے پریس سے شائع کیا ہے۔ دینی نقطۂ نظر سے بھی ان کی خدمات قابل فخر ہیں جنہوں نے قرآن اور احادیث کی اشاعت میں بہت ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔

صحافت کی دُنیا میں لکھنؤ کا نام ہمیشہ سے صفِ اوّل پر رہا ہے۔ منشی سجاد حسین کاکوروی نے لکھنؤ سے طنز ومزاح پر مشتمل رسالہ ''ماہنامہ اودھ پنچ'' کی اشاعت کی، جو تاریخ بن گئی۔ منشی جی کا لکھنؤ میں انتقال ہوا مگر کاکوری میں تدفین ہوئی۔ اُردو ادب میں طنز ومزاح کی صنف ''اودھ پنچ'' کے بغیر نامکمل تصور کی جائے گی۔ اس کی اشاعت کے بند ہونے کے کافی عرصہ بعد لکھنؤ کے طنز و مزاح کے مشہور ومعروف ادیب احمد جمال پاشا نے ۱۹۶۸ء میں ''اودھ پنچ'' کا اجراء کیا جو چند شماروں کے بعد بند ہوگیا۔

لکھنؤ کی صحافت کی دُنیا کبھی بھی خالی نہیں رہی۔ ۱۹۵۸ء میں میرے عزیز دوست حسین اَمین نے ہفت روزہ ''دُنیا'' کا اجراء کیا۔ لکھنؤ کے مقبول ترین ہفت روزہ ''دُنیا'' کا شمار ہوتا تھا، جو بلاناغہ ۱۹۶۵ء تک شان سے شائع ہوا۔ میری تصنیفی ابتداء اسی ہفت روزہ سے ۱۹۵۸ء سے ہوئی۔ حسین اَمین لکھنؤ کے مشہور مجاہد آزادی اور اعلیٰ پائے کے صحافی حضرت امین سلونوی کے صاحبزادے ہیں۔ حسین اَمین اپنی والدہ سے دو بھائی تھے، ان سے چھوٹے بھائی ڈاکٹر عرفان امین کنگ جارج میڈیکل کالج سے فارغ ہو کر سعودی عرب چلے گئے تھے اور وہاں سے امریکہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ امین سلونوی صاحب کی پہلی بیوی سے سب سے بڑے بیٹے قاسم متین احمد تھے جو صحافی تھے اور اسی پیشہ میں ۱۹۵۸ء میں پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔

لکھنؤ اپنے اُردو اخبارات اور صحافیوں کی وجہ سے بھی جانا جاتا ہے۔ مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی نے 'صدقِ جدید' کا اجراء کیا جو لکھنؤ کا مشہور ومقبول دینی اور سیاسی رسالہ تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے انتقال کے بعد حکیم عبدالقوی نے ''صدق'' کے عنوان سے رسالہ جاری کیا تھا۔ اسی زمانہ میں ماہنامہ ''فروغِ اُردو'' پروفیسر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب کی ادارت میں شائع ہوا

جس کا سالانہ زرتعاون صرف ایک روپیہ تھا۔ راقم السطور اس کا سالانہ خریدار تھا۔

لکھنؤ کے اس وقت کے ممتاز صحافی حسین امین اپنا ہفت روزہ رسالہ ''دُنیا'' کو بند کرنے کے بعد اُتر پردیش اور خصوصاً لکھنؤ کے سب سے مشہور روزنامہ ''قومی آواز'' میں بطورِ معاون ایڈیٹر کی خدمات انجام دینے لگے۔ روزنامہ ''قومی آواز'' کانگریس پارٹی کا ترجمان اخبار تھا اور اس کے ایڈیٹر اس زمانہ کے سب سے مشہور و معروف صحافی حیات اللہ انصاری تھے۔ کانگریس پارٹی اُردو میں قومی آواز کے علاوہ انگریزی میں نیشنل ہیرالڈ اور ہندی میں ''نوجیون'' بھی شائع کرتی تھی۔ حسین امین نے جس زمانہ میں اس مشہور اخبار میں اخبار نویسی کی ابتداء کی لکھنؤ کے صحافیوں کی خاصی تعداد اخبار سے منسلک تھی، جن میں عشرت علی صدیقی، عثمان غنی، احمد ابراہیم علوی، رشید حسین قریشی، مزاح نگار مجیب سہالوی، شاکر جرولی، احمد جمال پاشا، منظر سلیم، محمد حسن قدوائی اور مسعود الحسن رضوی وغیرہ روزنامہ سے منسلک تھے۔

کسی بھی دور میں لکھنؤ کی سرزمین اُردو ادب کی نمائندگی سے محروم نہیں رہی۔ عالم اسلام کی مشہور شخصیت حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کا ماہنامہ ''الفرقان'' گذشتہ اسّی سالوں سے بلاناغہ شائع ہو رہا ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے عربی شعبہ کے پروفیسر ڈاکٹر رضوان علی کا ماہنامہ ''تنویر'' عبدالروف عباسی کا ماہنامہ ''حق'' جالب رضوی کا روزنامہ ''ہمدم'' انیس احمد عباسی کا روزنامہ ''حقیقت'' کے علاوہ جمیل مہدی کا ماہنامہ ''ندائے ملت'' اور ''عزائم'' اپنے دور کے پائے کے رسالے تھے۔ حسین امین نے روزنامہ ''قومی آواز'' میں ۱۹۷۰ء تک اپنی خدمات انجام دیں۔

لکھنؤ کے ممتاز صحافی حسین امین نے ۱۹۸۳ء میں عراق کے صدر صدام حسین کی دعوت پر اُردو، ہندی اور بنگالی صحافیوں کے ایک وفد کے ساتھ عراق کا دورہ کیا۔ ان کے ساتھ دہلی سے شاہد صدیقی اور رویوار (ہندی) کے مدیر ادیان شرما مرحوم تھے۔ واپسی پر حسین امین نے اپنے اس خاص سفر کی روداد ایک سفر نامہ بعنوان ''دجلہ سے فرات تک'' تحریر کیا جو بہت معرکہ کی تصنیف ہے۔ عراق کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے حسین امین کا سفرنامہ ''دجلہ سے فرات تک'' کا مطالعہ ضروری ہے۔

حسین امین نے بڑوں کے علاوہ بچوں کے لئے بھی خوب لکھا ہے۔ مشہور انگریزی ناول اگاتھا کرسٹی کی بین الاقوامی شہرت یافتہ ناول ''مرڈر اِن دی ائر'' کا ۱۹۵۸ء میں اُردو میں ''فضائی قتل'' کے عنوان سے ایک ضخیم ناول تحریر کیا تھا۔ ایک اور انگریزی ناول کا اُردو ترجمہ ''بند کتاب'' کے عنوان سے روزنامہ قومی آواز میں قسط وار شائع ہوا، مگر ناول کی شکل میں منظر عام پر نہیں آسکی۔ اورنگ آباد کے تاریخی مقامات اجنتا اور ایلورا پر کتاب زیر تحریر ہے۔ بچوں کی جاسوسی ناول ''عجیب سازش'' بچوں اور بڑوں میں بیحد مقبول ہوئی تھی۔ جرم اور سزا پر حسین امین نے بہت سی دلچسپ کہانیاں لکھیں جو اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئیں۔

حسین امین لکھنؤ کے مشہور و معروف ادیب، دانشور اور ممتاز صحافی ہیں۔ روزنامہ ''قومی آواز'' کے بعد آپ نے لکھنؤ کی مشہور شخصیت ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کے روزنامہ ''قائد'' میں اپنی خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر فریدی نے اپنی قائم کردہ سیاسی پارٹی مسلم مجلس کے نمائندہ اخبار کے طور پر ''قائد'' کا اجراء کیا تھا اور بھوپال سے کہنہ مشق صحافی اشتیاق عارف کو قائد کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے متعین کیا تھا۔ حسین امین فی الوقت فری لانس جرنلسٹ کی حیثیت سے لکھنؤ کے ادبی اور سیاسی طبقے میں مصروف ہیں۔ پچیّس سالہ ماہنامہ ''لاریب'' مدیر رشید قریشی کی مجلس مشاورت میں شامل ہیں اور ہر ماہ اپنے رسالہ کے لئے مضمون تحریر کرتے ہیں۔ حسین امین کے والد امین سلونوی مرحوم قوم پرست کانگریسی تھے۔ جو ۱۹۳۶ء سے لکھنؤ میں مشاعروں کے منتظم تھے جو آزادی تحریک کی نمائندہ تقریب کے طور پر اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ آزادی کے بعد بھی امین صاحب مرحوم نے بحیثیت کنوینز مشاعرہ کا اہتمام پندرہ اگست اور ۲۶/ جنوری کو انجام دیا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد حکومت کی جانب سے ان کے صحافی بیٹے حسین امین کو دونوں مشاعروں کی ذمہ داری دے دی گئی جو لکھنؤ کے ضلع مجسٹریٹ کی سرکاری رہنمائی میں منعقد ہوتے ہیں۔ مشاعروں کا سلسلہ آج بھی قائم ہے جس کے کنوینز حسین امین ہیں۔ یومِ آزادی اور ۲۶/ جنوری کے مشاعرے بڑی اہمیت کے حامل ہیں، جسے حسین امین کے زیر اہتمام منعقد کیے جاتے ہیں۔

اودھ کی راجدھانی لکھنؤ کی سرزمین کبھی صحافیوں، ادیبوں، دانشوروں اور شعراء سے خالی نہیں رہی۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ التحصیل بچوں کو دیگر یونیورسٹیوں میں گریجویشن میں داخلہ ہورہا ہے اور بہتیرے طالب علم اس وقت دہلی یونیورسٹی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں ریسرچ کررہے ہیں۔ حسین امین کی کوششوں سے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں صحافت کے کورس کی ابتداء ہوچکی ہے جو خود ان کی نگرانی میں رواں دواں ہے۔ صحافت کا کلاس خود حسین امین لیتے ہیں۔

لکھنؤ سے درجنوں روزنامے اور رسالے جاری ہوتے ہیں جن میں ''سہارا، انقلاب'' امن عباس کا ''صحافت''، وقار رضوی کا روزنامہ ''اودھ نامہ''۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے صاحبزادے حفیظ نعمانی ''اپنا اخبار'' اُردو اور دیوناگری میں شائع کرتے ہیں۔ حسین امین کے ہمعصر احمد ابراہیم علوی کا روزنامہ ''آگ'' لکھنؤ کا مقبول ترین اخباروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ لکھنؤ کے مشہور عطر ساز کمپنی اصغر علی محمد علی کے مالک اصطفیٰ خاں کا ''ترچھی نظر'' بھی کافی مشہور ہوا تھا۔ لکھنؤ کے مشہور و معروف ادیب اور دانشور عابد سہیل کا ماہنامہ ''کتاب'' کے ذکر کے بغیر فہرست نامکمل سمجھی جائے گی۔

حکومت اتر پردیش کا سرکاری ماہنامہ ''نیا دور'' گذشتہ ستّر سالوں سے مسلسل شائع ہورہا ہے جس کے اس وقت کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی ہیں۔ ان سے قبل خورشید صاحب بھی مدیر رہ چکے ہیں۔ ''نیا دور'' کے کئی خصوصی نمبر اُردو ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خصوصاً لکھنؤ کے معروف شاعر حضرت والی آسی مرحوم کا خاص نمبر قابل تعریف اور قابل مطالعہ ہے۔ حضرت والی آسیؒ کی حیات اور شاعری کو سمجھنے کے لئے ''نیا دور'' کا مندرجہ بالا خاص نمبر بہت معاون ثابت ہوگا۔

احمد جمال پاشا

طنز و مزاح کے مشہور و معروف نمائندہ ادیب

اُردو ادب میں طنز و مزاح کی تاریخ بہت پُرانی ہے۔ ہر دور میں اس صنف کے شاعر اور ادیبوں نے اُردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ظرافت ایک بہت ہی دلچسپ اور انتہائی مشکل ادبی صنف ہے۔ اسد اللہ خاں غالب کے خطوط ظرافت کے اعلیٰ نمونہ کی صنف میں شمار کیئے جاتے ہیں۔ بعد کے دور میں عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، پروفیسر خورشید جہاں، شفیق الرحمٰن سے لے کر مشتاق یوسفی، راجہ مہدی علی خاں، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، کنہیا لعل کپور، غلام احمد فرقت کاکوروی، ساغر خیامی، اور عادل لکھنوی وغیرہ نے اپنی مزاحیہ تخلیقات سے اُردو ادب میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔

مزاحیہ ادب کی اس طویل فہرست میں لکھنؤ کے مشہور و معروف طنز و مزاح کے ادیب احمد جمال پاشا کا نام بھی فخریہ لیا جائے گا جن کی ذات سے لکھنؤ کی ادبی محفلوں میں رونق تھی جو اپنی زندہ دلی اور برجستگی کے لئے ادبی حلقوں میں ہر دلعزیز تھے۔ ایک زمانہ تھا جب لکھنؤ کی ادبی محفلیں ان کی ظرافت اور خوش مزاجی سے بارونق ہوا کرتی تھیں۔ لکھنؤ کی ہر ادبی محفل میں احمد جمال پاشا کی شرکت یقینی تھی اور بعض حلقوں کی وہ جان ہوا کرتے تھے۔ ''اودھ پنچ'' کے مدیر منشی سجاد حسین کا اُردو ادب میں طنز و مزاح کی عظیم ہستی میں شمار ہوتا ہے۔ اودھ کی مایہ ناز ہستی اور اُردو عربی اور فارسی زبان کی معیاری ادبی اور مذہبی کتابوں کے بین الاقوامی شہرت یافتہ پنڈت نول کشور کا کانپور سے شائع ہونے والا روزنامہ ''اودھ'' کی اشاعت کافی عرصہ قبل بند ہو چکی تھی۔ طنز و مزاح کا نمائندہ اخبار ''اودھ پنچ'' اُردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا جس کے تذکرہ کے بغیر طنز و مزاح کی

تاریخ نامکمل تصور کی جائے گی۔ اس تاریخی اخبار ''اودھ پنچ'' کو احمد جمال پاشا نے ۱۹۶۹ء میں اپنی رہائش گاہ سروری منزل، کچا احاطہ امین آباد لکھنؤ سے دوبارہ بڑے آب و تاب سے شائع کیا، مگر وسائل کی کمی رسالہ کی اشاعت میں حائل ہوتی رہی جس کی وجہ سے رسالہ اپنے مقررہ وقت پر سپردِ ڈاک ہونے سے معذور تھا، جس کی شکایت محکمہ ڈاک کے علاوہ قاری حضرات بھی کرتے تھے۔ احمد جمال پاشا نے ''اودھ پنچ'' کے ایک شمارہ کے اداریہ میں اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں اس تاخیر سے اشاعت کی تاویل پیش کی کہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ اس حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود کہ ''اودھ پنچ'' ایک مزاحیہ رسالہ ہے اور ایک مزاحیہ رسالہ سے آپ سنجیدگی سے وقت پر شائع ہونے کی کیسے اُمید کر سکتے ہیں؟ ماہنامہ ''اودھ پنچ'' کو احمد جمال پاشا نے مجبوراً بند کر دیا۔

۱۹۶۱ء میں احمد جمال پاشا نے حیات اللہ انصاری کی ادارت میں شائع ہونے والے روزنامہ ''قومی آواز'' میں بطورِ معاون ایڈیٹر خدمات انجام دیں۔ لکھنؤ سے شائع ہونے والے کانگریس پارٹی کے اس ترجمان اُردو کے کثیر الاشاعت روزنامہ سے اُردو کے مشہور صحافی عثمان غنی، عشرت علی صدیقی، احمد ابراہیم علوی، عابد سہیل اور حسین امین وغیرہ وابستہ رہ چکے ہیں۔

احمد جمال پاشا کی پہلی شادی لکھنؤ کی ڈاکٹر نکہت مہتاب سے ہوئی تھی جو ڈاکٹر جگدیش گاندھی کے سٹی مانٹیسری اسکول کی ڈائریکٹر تھیں مگر یہ شادی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی اور طلاق ہوگئی۔ ان کی دوسری شادی ۱۹۶۶ء میں بہار کے شہر سیوان کے ایک تعلقدار خاندان میں ہوئی۔ ان کے سسر جناب محمد داؤد کا شمار شہر کے بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا جن کی بیٹی سرور جمال سے احمد جمال پاشا کی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد لکھنؤ زبان وادب کے نمائندہ احمد جمال پاشا بہار کے بھوجپوری زبان ولہجہ کے لئے دُنیا بھر میں مشہور سیوان میں واقع اپنی سسرال کی عالیشان حویلی نما کوٹھی ''نشاط افزا'' میں منتقل ہوگئے۔ سیوان کے اسلامیہ کالج کے شعبۂ اُردو میں لیکچرر مقرر ہوئے اور اس طرح طنز ومزاح کے ہندو پاک کے مقبول ادیب درس وتدریس کے باعزت اور سنجیدہ پیشے سے وابستہ ہوگئے۔

لکھنؤ سے احمد جمال پاشا کی آمد سے قبل سیوان شہر میں ادبی سرگرمیاں برائے نام تھیں مگر ان کی قد آور ادبی شخصیت نے بہار کے اُردوداں طبقہ کو بہت جلد اپنی جانب متوجہ کیا اور بہت کم وقت میں سیوان اور اس کے قرب وجوار کے ادب کے زرخیز مواضعات ہری ہانس، گوپال پور، حسن پورہ، بھیک پور اور حسین گنج کے ادیب اور شاعر احمد جمال پاشا کی سرپرستی میں ہونے والی ادبی نشستوں میں شرکت کا شرف حاصل کرنے لگے۔ سیوان ضلع کا یہ خطہ علم وادب کا صدیوں سے گہوارہ رہا ہے جہاں کے علماء اور مجتہد حضرات کی ذات سے لکھنؤ اور دہلی کی ادبی محفلیں اور مذہبی مجلسیں آج بھی منور ہیں۔ موضع حسین گنج کے سیکڑوں سال پرانے امام باڑہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اسے لکھنؤ کے عظیم مرثیہ گو شاعر میر دبیر نے رونق بخشی تھی۔ علمائے دین اور مجتہدین نے مذہب کو فروغ دے کر اہلیان حسین گنج وگوپال پور وغیرہ کو مکمل مومن بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

سیوان میں احمد جمال پاشا کی ذات سے ایک خوشگوار ادبی ماحول ظہور پذیر ہوا مگر افسوس کہ ۲۸ رستمبر ۱۹۸۷ء کو ریڈیو اسٹیشن کے ایک پروگرام میں شرکت کرنے پٹنہ تشریف لے گئے جہاں ان کو دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ وہیں جاں بحق ہوگئے۔ ان کی تجہیز وتدفین سیوان میں واقع ان کی سسرال کے خاندانی قبرستان میں عمل میں آئی۔

احمد جمال پاشا کی اہلیہ سرور جمال صاحبہ نے سیوان میں واقع اپنی کوٹھی ''نشاط افزا'' کے احاطہ میں اپنے والد مرحوم کی یاد میں لڑکیوں کا ایک اسکول ''داؤد میموریل اُردو گرلس اسکول'' قائم کیا جو رفتہ رفتہ ہائی اسکول تک حکومت بہار کے ایجوکیشن بورڈ سے منظور شدہ اسکول ہوگیا۔ یہ اسکول بہار کے معیاری اُردو میڈیم اسکولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

احمد جمال پاشا کے سسر محمد داؤد صاحب کے صرف دو لڑکیاں سرور جہاں اور بلقیس جہاں تھیں، کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی، لہٰذا دونوں بہنوں نے وراثت میں ملی بے انتہا جائیداد اور دولت کو قوم کے لئے وقف کرنے کا عزم کیا۔ علم وادب کے اعلیٰ ذوق اور دینی ومذہبی مزاج کی حامل دونوں بہنوں نے سیوان شہر میں قابل قدر کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ۲۱ رمئی ۲۰۱۱ء کو داؤد میموریل اُردو

گرلس اسکول کی صدر بلقیس جہاں کی فراہم کردہ زمین پر ''احمد جمال پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'' کی عمارت کا افتتاح بہار شریف کے امیر شریعت حضرت مولانا سیّد نظام الدین کے مبارک ہاتھوں سے عمل میں آیا۔

احمد جمال پاشا کی غیر مطبوعہ تصانیف کے علاوہ شائع شدہ تصانیف ''اندیشۂ شہر، ستم ایجاد، ظرافت اور تنقید، فن لطیفہ گوئی، لذتِ آزاد اور شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ احمد جمال پاشا نے بے شمار مزاحیہ مضامین تحریر کیے ہیں جو ہندو پاک کے تمام معیاری رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ ان کے مضامین میں ظرافت کے ساتھ بے ساختگی، لکھنوی نفاست کی جھلک کے علاوہ شائستگی پائی جاتی ہے۔ بڑوں کے علاوہ انہوں نے بچوں کے ادب کے لئے بھی بہت لکھا۔ لکھنؤ سے شائع ہونے والے بچوں کے رسالہ ماہنامہ ''ٹافی'' کے لئے بچوں کی کہانیاں لکھیں جس میں ۱۹۶۸ء کے شمارہ میں ان کا مزاحیہ مضمون ''شوکت تھانوی کے قہقہے'' شائع ہوا تھا۔

احمد جمال پاشا کی تخلیقات پر تحقیق کی ضرورت ہے اور اسی ضرورت کے تحت سیوان بہار میں ''احمد جمال پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'' کا قیام عمل میں آچکا ہے جو ہندو پاک کے مشہور و مقبول طنز و مزاح کے نمائندہ ادیب احمد جمال پاشا کی زندگی اور تصانیف پر تحقیق کرے گا۔

......☆......

سعد الدین احمد عندلیبؔ

لکھنوی تہذیب کی نمائندہ شخصیت

۱۹۵۷ء میں سعد الدین احمد عندلیبؔ سے میری پہلی ملاقات میرے بھانجے تحفظ حسین صدیقی کے معرفت ہوئی تھی جو لکھنؤ کے گورنمنٹ آرٹ کالج میں زیرِ تعلیم تھے اور ان کا قیام محلّہ مولوی گنج کے ایک کمرہ میں تھا۔ سعد الدین احمد مولوی گنج کے اصطبل چار باغ کے باشندہ تھے۔ پہلی ملاقات ہی میں مَیں اُن کی پُرکشش شخصیت سے متاثر ہوگیا۔ لکھنوی وضع داری، نفاست اور تہذیب، شائستگی اور نازک مزاجی کے وہ جیتے جاگتے نمونہ تھے۔ خاموش طبیعت کم گو سعد الدین میں انکساری کا بیحد مادّہ تھا۔ اُونچی آواز میں گفتگو کو وہ خلافِ آداب تصور کرتے تھے۔ کئی ملاقاتوں کے بعد ہم دونوں رفتہ رفتہ دوستی کی طرف گامزن ہوئے اور ۱۹۵۸ء میں انہوں نے مجھے لکھنؤ کے بچوں کی مقبول انجمن ادبِ اطفال کا باقاعدہ ممبر بنا دیا۔ جس کا دفتر امین آباد میں واقع چودھری حیدر حسین کی کوٹھی میں تھا۔ یہ کوٹھی جھنڈے والے پارک امین آباد کے قریب گھڑی والی کوٹھی کے نام سے بھی مشہور ہے۔ چودھری اختر حسین صاحب نے اپنی کوٹھی کے نچلے حصے کے کمرہ کو ہمیشہ کے لئے انجمن ادبِ اطفال کے دفتر اور لائبریری کے لئے مرحمت فرما دیا تھا۔ کوٹھی ہی میں میری چودھری اختر حسین صاحب سے بارہا ملاقاتیں ہوئیں۔ بہت ہی نیک خصلت اور مخلص انسان تھے۔

انجمن ادبِ اطفال لکھنؤ کے بانی صدر ابصار عبد العلی سماجی اور ادبی پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کا ذہن بچوں کی ادبی اور سماجی نشو و نما پر بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ لکھنؤ جو تہذیب کا شہر ہے، بچوں کی ایک ایسی انجمن ہو جو بچوں میں ادبی ذوق پیدا کرے۔ اسی نصب العین کے تحت انہوں نے لکھنؤ میں ''انجمن ادبِ اطفال'' کی داغ بیل ڈالی

جو الحمدللہ آج تک قائم ہے۔ ابصار عبد العلی صاحب کے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد انجمن کی ساری ذمہ داریوں کا بوجھ انجمن کے جنرل سکریٹری سعد الدین عندلیب کے کندھوں پر آ گئی۔ سعد الدین عندلیب کو انجمن سے والہانہ لگاؤ تھا۔ انہوں نے ابصار عبد العلی کی غیر موجودگی میں انجمن کے کاموں پر اپنی ساری توجہ مرکوز کردی۔ انہوں نے کبھی کوئی باقاعدہ نوکری نہیں کی۔ زندگی بھر نجی طور پر لائف انشورنس کے نمائندہ کے طور پر خدمات انجام دیں اور کمپنی کو کرڑوں کا فائدہ پہنچایا۔

ابصار عبد العلی بانی صدر انجمن ادبِ اطفال لکھنؤ کے متعلق ان کی ذات کا تعارف کرانا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ ۱۹۵۹ء میں جب وہ پاکستان سے ملاقات کی غرض سے لکھنؤ تشریف لائے تھے تو خاکسار سے ملاقات ہوئی تھی اور ہم تینوں نے امین آباد میں واقع ایک فوٹو اسٹوڈیو میں تصویر کھنچوائی تھی جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ اس وقت ہماری عمریں بیس بائیس سال کے درمیان تھیں۔ ابصار عبد العلی کے والد عبد العلی صاحب لکھنؤ کے مشہور و معروف معالج ڈاکٹر حکیم سیّد عبد العلی حسنی صاحب کے معاون تھے۔ گویا ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر ہم نام تھے اور امین آباد کے گوئن روڈ پر مطب کرتے تھے۔ ڈاکٹر حکیم عبد العلی حسنی صاحب، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ (علی میاں) کے سوتیلے بھائی تھے۔ قابل تحریر بات یہ ہے کہ لکھنؤ کے کنگ جارج میڈیکل کالج کے پہلے بیچ سے ڈاکٹر عبد العلی فارغ التحصیل تھے۔ میڈیکل کی تعلیم کے بعد انہوں نے لکھنؤ ہی کے یونانی میڈیکل کالج سے طب کی بھی اعلیٰ ڈگری حاصل کی تھی۔ اسی تناسب سے انہیں ڈاکٹر حکیم سیّد عبد العلی حسنی لکھا جاتا تھا۔

میرے عزیز دوست انجمن ادبِ اطفال کے جنرل سکریٹری سعد الدین عندلیب کا آبائی وطن سندیلہ تھا جو ضلع ہردوئی میں واقع ہے۔ اور اپنی بے نظیر خوبیوں کی وجہ سے علاقہ میں منفرد حیثیت کا حامل تھا۔ یہ خطّہ اپنی ادبی علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کی وجہ سے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

سعد الدین عندلیب کے والد معین الدین احمد صاحب نے ہردوئی میں ۱۹۴۳ء میں معین ہومیو پیتھک کالج قائم کیا تھا جو ان کے پاکستان ہجرت کرنے کے وقت تک قائم رہا۔ ان کی ہومیو پیتھک طریقۂ علاج پر بہت سی کتابیں ہیں مگر سب سے زیادہ ان کی کتاب ''معین العلاج'' کو شہرت حاصل ہوئی۔

اس غیر معمولی کتاب کو پڑھ کر کوئی بھی تھوڑی سی دلچسپی لے کر ہومیو پیتھک دواؤں پر دسترس حاصل کرسکتا ہے اور پریکٹس کرسکتا ہے۔ میں ان خوش نصیبوں میں سے ہوں کہ گذشتہ پچاس سال سے معین العلاج میرے پاس محفوظ ہے۔

انجمن ادب اطفال سے سعدالدین کو والہانہ لگاؤ تھا۔ انجمن ہی ان کا اوڑھنا بچھونا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ انجمن سے وہ جذباتی طور سے جڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے انجمن کے صدر کے لئے ابصار عبدالعلی کے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد لکھنؤ کے سیّد سبط رضی کو مقابلہ کے لئے کھڑا کیا اور الحمدللہ سیّد سبط رضی کامیاب ہوئے۔ اس زمانہ میں سیّد سبط رضی چارٹیڈ اکاؤنٹینٹ کی تیاری کرر ہے تھے۔ وکالت پاس کر چکے تھے۔ لہٰذا کبھی کبھی انجمن کے دفتر واقع چودھری حیدر حسین کالے کوٹ میں ملبوس سائیکل پر تشریف لاتے تھے۔ سیّد سبط رضی میں کسی بھی چیز کو منظّم طریقہ سے پیش کرنے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ وہ ایک ایک غیر معمولی منتظم کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ انہوں نے انجمن کی اٹھارہ خصوصی ممبران کی ایک ٹیم کی تشکیل کی جس میں سعدالدین احمد جنزل سکریٹری، اختر محسن یزداں نائب صدر، احمد مشکور ادبی سکریٹری (ڈاکٹر شفاعت علی صدیقی کے سنبھل چلے جانے کے بعد)، معظم جعفری لائبریرین۔ خصوصی ممبران میں عبدالمجیب، محمود عسکری، محمد رفیع خاں، حسین امین، نسرین رخسی، مہہ جبیں زیدی، زرینہ۔ سردار سریندر سنگھ، محمد انصاف، عبدالرؤف خاں خلیل، مہہ جبیں عائشہ اور افروز جہاں کے اسم گرامی شامل ہیں۔ سبط رضی صاحب زبردست تنظیمی صلاحیت کے مالک ہیں۔ ان کی کوششوں سے انجمن نے لکھنؤ میں بہت سے تاریخی پروگرام کئے جو بچوں کے ادب میں سنہری حروف میں لکھے جائیں گے۔

سعدالدین احمد بہت مردم شناس شخصیت کے مالک تھے۔ دوسروں کی خوبیوں اور اپنی کمزوریوں سے وہ بہ خوبی واقف تھے۔ انجمن ادب اطفال کے سرپرست جناب چندر جیت یادو مرکزی حکومت کے وزیر تھے۔ ان کے دورانِ وزارت ایک بین الاقوامی یوتھ فیسٹول منعقد ہونا تھا۔ وزیر محترم نے اپنی انجمن کے ایک فرد سیّد سبط رضی کو یوتھ فیسٹول میں بھیجنے کا حکم صادر کیا۔ سیّد سبط

رضی کے بیرونی سفر کے متعلق ایک ہنگامی اجلاس انجمن کے دفتر میں منعقد ہوا۔ جس میں اس خاکسار نے بھی شرکت کی تھی، اس وقت میں مہیلا کالج کے پیچھے محلّہ ہاتھ خانہ میں رہتا تھا۔ سیّد سبط رضی بہت اچھے مقرر تھے۔ سیاسی اور سماجی معاملات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ لہٰذا وہ ہندوستانی وفد کے رُکن کی حیثیت سے پہلی بار بیرونی سفر پر صوفیا (بلغاریہ) تشریف لے گئے۔ اور کامیابی کا جھنڈا گاڑ کر ہندوستان واپس آئے۔ بین الاقوامی یوتھ فیسٹول میں شرکت سبط رضی کی زندگی کا ایک اہم موڑ تھا۔ اس کے بعد ترقی کے دروازے کھل گئے۔ سبط رضی کانگریس پارٹی کی جانب سے ممبر آف پارلیامنٹ (راجیہ سبھا) بنے۔ اتر پردیش کے وزیر تعلیم ہوئے اور مرکز میں نائب وزیر داخلہ ہوئے۔ صوبہ جھارکھنڈ کے گورنر مقرر ہوئے اور آسام کے گورنر کی حیثیت سے سبکدوش ہو گئے۔

جیسا کہ میں نے کہا کہ سعدالدین احمد بہت مردم شناس تھے۔ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۷ء کے تحریر شدہ میرے افسانوں کے مطالعہ کے بعد ۱۹۵۸ء میں مجھ کو لکھنؤ کے اس وقت کے مقبول صحافی امین سلونوی کے صاحبزادے حسین امین سے ملوانے لے گئے۔ اس وقت حسین امین ہفت روزہ "دُنیا" شائع کرتے تھے۔ سعدالدین نے مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں ہر ہفتہ دُنیا کے لئے ایک مضمون یا افسانہ لکھوں۔ لہٰذا میں نے "حاجی صاحب کی ڈائری" کے عنوان سے دو سال تک بلاناغہ لکھا جو طنز و مزاح پر مبنی تھا۔ حسین امین صاحب پیدائشی صحافی ہیں، صحافت ان کے خون میں دوڑ رہی ہے۔ انہوں نے اپنے ہفت روزہ اخبار کے علاوہ روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ میں بحیثیت سب ایڈیٹر اپنی خدمات انجام دیں۔ ماہنامہ "لاریب" لکھنؤ کی مجلس مشاورت میں شامل ہیں اور آج بھی فعل ہیں۔ کسی نہ کسی موضوع پر لکھتے رہتے ہیں۔ لکھنؤ کی عظیم دینی درسگاہ ندوۃ العلماء میں ان کی کوششوں سے صحافت کے کورس کی ابتداء ہوئی اور آپ وہاں صحافت کے کلاس لیتے ہیں۔ آپ کے مضامین مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آج حسین امین لکھنؤ کے ممتاز صحافیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

سعدالدین عندلیب نے باقاعدہ نہ شاعری کی نہ مضامین لکھے، مگر مزاج میں ادب نوازی

بدرجہ اتم موجود تھی، باذوق شخصیت کے مالک تھے۔ اُردو زبان و ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ اچھی اور معیاری تصنیف پر داد دیتے تھے۔ اچھے اشعار سے محظوظ ہوتے تھے۔ لکھنؤ کے ادبی حلقہ میں بھی ان کی بہت پذیرائی تھی۔ ہر ادبی محفل یا مشاعرہ میں ان کی شرکت یقینی تھی۔ مطالعہ ان کا شوق تھا۔ لٰہذا انجمن کی لائبریری کے علاوہ اُن کی ذاتی لائبریری بھی معیاری کتب سے مزین تھی۔ مشاعروں میں غالب اور اقبال پر جان دیتے تھے۔ افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، رام لعل، بشیشر پردیپ ان کے پسندیدہ مصنف تھے۔ بشیشر پردیپ سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ ویکلی بلٹز، بمبئی کے لکھنؤ نمائندہ بشن کپور سے خصوصی ملاقات تھی۔ بشن کپور کے دونوں بیٹے سعدالدین کے ساتھ انجمن کے ہالی ڈے ہوم میں نینی تال جا چکے تھے۔ سعدالدین ہر سال انجمن ادب اطفال کی جانب سے پچاس بچوں کا ایک ہالی ڈے ہوم ٹور نینی تال کے ایار پاٹا مقام پر منعقد کرتے تھے۔ اس کے لئے ان کو سوشل ویلفیئر بورڈ سے مالی تعاون حاصل ہوتا تھا۔

سعدالدین عندلیب کی قائم کردہ ''چاچا نہرو لائبریری''، انجمن ادبِ اطفال کی ہی نہیں بلکہ صوبہ اتر پردیش کے بچوں کی سب سے بڑی لائبریری تھی، جس میں تقریباً پچیّس ہزار کتابیں تھیں۔ انجمن کی اس لائبریری کے لئے حکومت یو پی کے سوشل ویلفیئر محکمہ سے ہر سال گرانٹ ملتی تھی جسے وہ صد فیصد کتابوں کی خریداری پر خرچ کر دیتے تھے۔ لائبریری میں جگہ کی قلّت کی بنا پر ایک مشورہ ان کو دیا گیا کہ لکھنؤ کی سرکاری امیر الدولہ لائبریری کو اس شرط پر دے دی جائے کہ انجمن ادبِ اطفال کی ''چاچا نہرو لائبریری'' کا ایک گوشہ قائم کر دیں۔ ایسے کئی گوشے اس لائبریری میں قائم ہیں، مگر سعدالدین عندلیب اس بات پر راضی نہیں ہوئے۔ دراصل وہ اپنی لائبریری کی کتابوں کو خود سے جدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کتابیں ان کو اپنے بچوں کی طرح عزیز تھیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ خون پسینہ ایک کر کے میں نے اس لائبریری کو قائم کیا ہے، یہ مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ انجمن ادبِ اطفال کی لائبریری میں نادر اور نایاب کتب کا ذخیرہ تھا۔ ریسرچ اسکالرس بھی ان کتابوں سے استفادہ حاصل کرتے تھے۔

۲۳ ستمبر ۲۰۱۱ء کو لکھنؤ سے سعد الدین عندلیب سے تقریباً آدھا گھنٹہ میری گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کا موضوع انجمن ادبِ اطفال کی ''چاچا نہرو لائبریری'' کے متعلق تھی۔ سعد الدین احمد اپنے مخصوص اندازِ گفتگو کی بجائے افسردگی اور انتہائی مایوسی کے لہجے میں لائبریری کے بند ہوجانے پر طویل گفتگو کررہے تھے۔ میں نے ان کو اتنا مایوس کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کی شخصیت کی خوبی ہی یہی تھی کہ وہ ہر مشکل مرحلہ کو مسکرا کر ٹال جانے کے عادی تھے۔ زندگی میں خراب سے خراب حالات کا انہوں نے جواں مردی سے مقابلہ کیا تھا۔ دوسروں کو بھی ہمت سے کام لینے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے فون پر نہایت پژمردگی کے عالم میں فرمایا کہ پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا جب میں نے انجمن ادبِ اطفال کی اس لائبریری کو قائم کیا تھا اور رفتہ رفتہ تقریباً پچّیس ہزار نادر و نایاب کتابوں کا بیش قیمت ذخیرہ جمع ہوگیا تھا۔ میں نے ان کتابوں کو اپنی اولاد کی طرح پالا اور پرورش کی اور اس مقام پر پہنچایا کہ اس معیار کی بچوں کی لائبریری پورے صوبہ اتر پردیش میں ملنی مشکل ہے۔ مگر افسوس کہ وہ لائبریری نہیں رہی۔ میں دہلی میں تھا اور میں نے ان کے اس کرب کو محسوس کیا۔ میں نے ان کو دلاسہ دیا کہ پریشان نہ ہوں، بہت جلد کوئی دوسری متبادل جگہ تلاش کرلی جائے گی، مگر انہوں نے میری باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا اور مسلسل اس بات پر زور دیتے رہے کہ مشکور تم میری دلی کیفیت کو سمجھ نہیں سکتے کہ میں کس کربناک حالات سے گزر رہا ہوں۔

اس طویل گفتگو کے تیسرے دن یعنی ۲۵ ستمبر ۲۰۱۱ء کی صبح دہلی کے ذاکر نگر میں مقیم ان کے چھوٹے بھائی نظام الدین احمد کا روح فرسا فون موصول ہوا جسے سن کر کلیجہ منھ کو آگیا۔ ''مشکور بھائی سعد الدین اس دُنیا میں نہیں رہے۔ ان کا آج صبح پانچ بجے انتقال ہوگیا''۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جس شخص سے دو روز قبل آدھے گھنٹے تک گفتگو ہوئی وہ آج اس دُنیا سے رخصت ہوگیا۔ میں نے دہلی کے شاہجہاں آباد اپارٹمنٹ میں مقیم سیّد سبط رضی کو فون پر اس منحوس خبر کی اطلاع دی تو ان کو یقین نہیں آیا۔ لہٰذا انہوں نے لکھنؤ کی مہہ جبیں زیدی سے اس خبر کی تصدیق کی۔ خاموش طبیعت کے مالک سعد الدین عندلیب اتنی خاموشی سے اس دُنیا سے رخصت ہوئے کہ لکھنؤ

شہر میں دوستوں تک کو خبر نہیں ہوئی۔ میں نے جب حسین امین کو اطلاع دی تو وہ ہکا بکا رہ گئے۔ یہی کیفیت انجمن کی نائب صدر مسز اختر محسن یزداں کی ہوئی۔ لکھنؤ کے مقبول روزنامہ "آگ" کے ایڈیٹر احمد ابراہیم علوی کو ان کے صاحبزادے کے ذریعہ مطلع کر دیا کہ آپ کے اخبار کے چاہنے والے سعد الدین عندلیب اب دُنیا میں نہیں رہے، جن کو مرحوم لکھتے ہوئے ہاتھ کانپ رہا ہے۔ گذشتہ پچپن سالوں سے میری دوستی قائم تھی، میری حیثیت ان کے حقیقی بھائی جیسی تھی۔ ان کی والدہ جنہیں ہم سب 'آپا' کہتے تھے، اپنے بیٹوں میں اس ناچیز کو بھی شامل کر کے چھ بیٹیوں کا ذکر کرتی تھیں۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔

زیست کا اعتبار کیا ہے امیؔر
آدمی بلبلا ہے پانی کا

سعد الدین عندلیب لکھنوی تہذیب کی نمائندہ شخصیت کے مالک تھے۔ مخصوص انداز میں گفتگو کرنا ان کی عادت میں شمار تھا۔ نشست و برخاست پر خصوصی طور پر دھیان دینا، نفیس ترین لباس زیب تن کرنا ان کی عادت کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ کالی شیروانی، سفید چوڑی دار پاجامہ اور کالے چشمہ میں ان کی شخصیت بہت ہی جاذب دکھائی دیتی تھی اور جب بہترین سوٹ اور ٹائی میں ملبوس کسی محفل میں جلوہ گر ہوتے تو ہر شخص کی نگاہیں ان کی پر کشش شخصیت پر مرکوز ہو جاتی تھیں۔ مہذب اطوار پسند کرتے تھے اور غیر مہذب کلمات سے ہمیشہ پرہیز کرتے تھے۔ مرحوم سعد الدین صوم وصلوٰۃ کے سختی سے پابند تھے۔ پانچوں وقت کی نمازیں رمضان شریف کے تیسوں روزے اور باقاعدگی سے تراویح کا اہتمام کرتے تھے۔ الحمدللہ! انتقال سے دس ماہ قبل حج بیت اللہ کی سعادت سے بھی سرفراز ہو چکے تھے۔ ان کی زندگی کی ہم سفر مسز مہ جبیں عائشہ بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ مسز مہ جبیں عائشہ لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی و عرب کلچر کی پروفیسر کی حیثیت سے ۲۰۱۰ء میں سبکدوش ہوئیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈبل ایم اے کیا تھا۔ ان کے دو بلند اقبال بیٹے امان احمد اور ندیم احمد ہیں۔ پانچ بھائیوں میں سعد الدین، تیسرے نمبر پر تھے۔ اور اکلوتی بہن مشہد معین ہیں۔

سعدالدین عندلیب کی زندگی وضعداری اور شرافت کی آئینہ دارتھی۔ طالب علمی کے دور میں لکھنؤ یونیورسٹی کے عالمی شہرت یافتہ اساتذہ پروفیسر نورالحسن ہاشمی، پروفیسر عبدالاحد خاں خلیل، ڈاکٹر مصطفیٰ علوی، ڈاکٹر رضوان علوی وغیرہ کے علاوہ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ان کو عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ممتاز ہائی اسکول باغ گونگے نواب میں سعدالدین عندلیب، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کے لائق شاگرد رہ چکے تھے۔

انجمن ادبِ اطفال کے توسط سے سعدالدین عندلیب نے غیر معمولی یادگار پروگرام منعقد کئے اور بچوں کے لئے نمایاں کارنامے انجام دیئے تھے۔ مثلاً پروگرام ''اپنا شہر پہچانو، کہانیوں کی شام'' ہر ہفتہ انجمن کے دفتر میں ادبی نشستوں کا انعقاد اور ہر سال پچاس بچوں کو پندرہ دنوں کے لئے نینی تال لے جانا۔ عام طور پر یہ ادبی اور ثقافتی کیمپ نینی تال میں لگتے تھے جہاں بچوں کا بینک، پوسٹ آفس وغیرہ قائم کر کے بچوں کو مستقبل کا ایک ذمہ دار شہری کا کردار ادا کرنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ پندرہ دنوں تک کی سیر و تفریح کے علاوہ بہت سے ادبی اور کلچرل پروگرام کئے جاتے تھے۔ ان پروگراموں میں ماضی کی انفارمیشن منسٹر اندرا گاندھی اور وزیر داخلہ وائی بی چوان شرکت کر چکے تھے۔ انجمن کے سرپرست کیپٹن وی آر موہن اور سینئر کانگریسی لیڈر جناب چندر جیت یادو انجمن کی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ سعدالدین نے اپنے جنرل سکریٹری شپ کے دور میں انجمن ادبِ اطفال کے بچوں میں تعلیمی، ثقافتی، اور ادبی جذبہ پیدا کیا۔ بلا تفریق مذہب وملت قومی یکجہتی اور کھلے ذہن کے نظریہ کی داغ بیل ڈالی اور اعلیٰ ظرفی کے نظریہ سے جینے کا سلیقہ سکھایا۔ بچوں کی ایک ایسی نسل کو پروان چڑھایا جو تعلیم کے حصول کے بعد ایک ذمہ دار اور ایماندار شہری اور قومی یکجہتی کا سفیر بن کر اُبھرے اور فخریہ اعلان کرے کہ ہماری ترقی میں انجمن ادبِ اطفال کا اہم حصہ ہے۔

......☆......

صلاح الدین صدیقی

ماہرِ تعلیم اور منفرد سیاسی شخصیت

۲۰۰۶ء میں رمضان المبارک کے مہینہ میں الحاج صلاح الدین صدیقی نے بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے چیئر مین کا عہدہ سنبھالا تو بورڈ کے حالات اچھے نہیں تھے۔ بورڈ میں پھیلی بدعنوانی کی شکایتیں تھیں۔ ان کو بتایا گیا کہ صوبہ کے دُور دراز علاقہ سے اساتذہ حضرات پٹنہ آتے ہیں، دن بھر سخت تپش، گرمی اور لُو میں کھڑے تقرری کے لئے مطلوبہ اپنے سرٹیفکٹ اور مارک شیٹ حاصل کرنے کے لئے حاضری دیتے ہیں اور مایوس ہوکر واپس چلے جاتے ہیں۔ ان کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا ہے۔ رشوت خوری اور بدنظمی کا ماحول ہے۔ لوگوں کو پریشان کر کے رشوت خوری کا بازار گرم ہے۔ صلاح الدین صدیقی نے اپنی پہلی میٹنگ میں اس بات کا اعلان کردیا کہ بدعنوانی ایک منٹ بھی برداشت نہیں کی جائے گی۔ اگر کوئی ملازم اپنے موجودہ مشاہرہ سے مطمئن نہیں ہے تو وہ بورڈ کی ملازمت چھوڑ کر بہتر جگہ تلاش کرسکتا ہے۔ یہ میرے اور ان کے حق میں بھی بہتر ہوگا۔ انہوں نے تمام عہدہ داران کو مخاطب ہوکر کہا کہ میں مدرسہ بورڈ کے ماضی کو بحال کرنے کے لئے آیا ہوں تاکہ عوام کا یقین اور اعتماد حاصل کرسکوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ بورڈ کے ملازمین خادم بن کر اپنی ذمہ داریاں انجام دیں، مخدوم بن کر نہیں۔ بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے ملازمین کی فلاح اور بہبود کے لئے وہ ہمیشہ کوشاں رہے جس کے نتیجہ میں ملازمین کے مہنگائی بھتے میں 300% کا غیر معمولی اضافہ کردیا۔ بہار بورڈ کی تاریخ میں اس سے قبل ایسی سہولت کسی بھی چیئر مین کے دور میں فراہم نہیں کی گئی تھی۔ لہٰذا مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے کام میں شفافیت آگئی اور ہر ضرورت مند کا کام گھنٹوں کے بجائے منٹوں میں ہونے لگا۔ مہنگائی بھتہ کا اضافہ صلاح الدین صدیقی کا ناقابل

فراموش کارنامہ ہے جسے عرصہ تک یاد کیا جائے گا۔ ان کے تعمیری نقطۂ نظر کا ہر شخص معترف تھا۔
مدرسہ بورڈ سے ملحق مدارس میں تعلیمی فضا پیدا کرنے کے لئے انہوں نے جنگی پیمانہ پر کام کیا۔

بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار اپنے مقرر کردہ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے چیئر مین صلاح الدین صدیقی کی کارکردگی سے بیحد مطمئن تھے۔ بورڈ سے رشوت خوری کا خاتمہ چیئر مین کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ نتیش کمار رشوت سے پاک انتظامیہ کے خواہشمند تھے۔ صاف ستھرے طریقہ کو وہ حکومت کے ہر شعبہ میں دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ وہ خود بہت ایماندار اور محنتی شخصیت کے مالک ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی سرکار کی کارکردگی کو تمام بُرائیوں سے پاک دیکھنا چاہتے تھے۔ صلاح الدین صدیقی، سادگی، صوم وصلوٰۃ کے پابند، سماج کے غریب طبقہ سے تعلق رکھنے کے باوجود ایماندار اور پاکیزہ زندگی کے حامل تھے۔ وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے اُن کی اِن ہی خوبیوں کے مدِ نظر بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کا چیئر مین مقرر کیا تھا، جہاں سے انتظامیہ کی غلط روی کی شکایتیں موصول ہو رہی تھیں۔ ورنہ وزیر اعلیٰ صلاح الدین صدیقی کو راجیہ سبھا میں بحیثیت ممبر پارلیامنٹ کے خواہشمند تھے۔ صلاح الدین صدیقی کی سادگی، ایمانداری اور با اصول زندگی سے ہر شخص واقف تھا۔ فاقہ کی نوبت میں بھی انہوں نے غیر قانونی یا غیر اخلاقی عمل سے احتراز کیا اور صبر کا دامن نہیں چھوڑا جو اُن کی بہت بڑی خوبی تھی۔

صلاح الدین صدیقی کی سیاسی زندگی کا آغاز اتر پردیش کے شہر کانپور سے ہوا۔ وہ اپنی شعلہ بیانی سے بہت جلد عوام اور انتظامیہ میں مشہور ہو گئے۔ بہت اچھے مقرر تھے، اکثر ان کی تقریر سے شہر کا ماحول خراب ہوا اور ایک بار ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ لہٰذا پولیس انتظامیہ نے ان کو شہر بدر کر دیا۔ ان کے مقدمات کو لکھنؤ کے معروف وکیل ظفریاب جیلانی نے بھی دیکھ بھال کی، سیّد شہاب الدین بھی ان کے ہمدردوں میں سے تھے۔

۲۰ر ستمبر ۲۰۰۸ء بمطابق ۱۹ر رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ کے عشرۂ مغفرت میں بورڈ کے چیئر مین صلاح الدین صدیقی کو رات کے دو بجے سینے میں درد اُٹھا جس کو انہوں نے سنجیدگی سے نہیں

لیا۔اس وقت ان کی بیٹی صوفیہ کے علاوہ ان کی اہلیہ کی بھتیجی تھی۔دونوں بچیوں نے سینے کی مالش کی، کچھ دوائیں دیں اور مدرسہ بورڈ کے ملازمین کو فون سے مطلع کرنے کے لئے کہا جسے انہوں نے یہ کہہ کر منع کردیا کہ رمضان میں کسی کو اتنی رات میں تکلیف دینا مناسب نہیں ہے۔صبح چھ بجے اُٹھے، غسل کیا، نماز پڑھی اور قرآن شریف کی تلاوت کی۔اسی دوران اُن کو پھر سینے میں تکلیف محسوس ہوئی۔اپنے ڈرائیور کو بلوایا۔اپنی پہلی منزل کے فلیٹ سے اُتر کر گاڑی میں بیٹھے اور اندرا گاندھی کارڈیالوجی انسٹی ٹیوٹ گئے۔ڈاکٹر آکسیجن لگانے کے لئے جب آگے بڑھے تو فرمایا کہ میرا وقت قریب آ گیا ہے۔مسکرا کر اپنا موبائل اپنے ڈرائیور کو یہ کہہ کر دیا کہ مجھ کو اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔

اندرا گاندھی کارڈیالوجی اسپتال میں صلاح الدین صدیقی کی عیادت کرنے بہار کے وزیراعلیٰ نتیش کمار، وزیر تعلیم برشن پٹیل شامل تھے۔ان کے علاوہ کافی تعداد میں سرکاری اعلیٰ عہدیداران اور معزز شہری اسپتال پہنچے۔تیسرا اور آخری جاں لیوا دل کا دورہ پڑا جو بہت شدید تھا۔صبح آٹھ بج کر دس منٹ پر وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔صلاح الدین صدیقی کے انتقال پر وزیراعلیٰ بہار نتیش کمار نے گہرے صدمہ کا اظہار کیا۔ان کے جسد خاکی کو پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ تدفین کی ہدایت دی۔اندرا گاندھی اسپتال سے جنازہ پہلے جنتا دل (یونائٹیڈ) کے دفتر لے جایا گیا جہاں پارٹی کے اراکین نے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور اس کے بعد ان کا جسد خاکی دفتر بہار مدرسہ ایجوکیشن واقع ڈاکٹر وِدیاپتی مارگ لے جایا گیا جہاں بورڈ کے تمام اہلکار اور دیگر ملازمین نے عقیدت کے ساتھ چیئرمین کا آخری دیدار کیا۔مدرسہ بورڈ کے ڈپٹی سکریٹری حبیب الرب کے مطابق ۱۹؍ستمبر کو حسب معمول چیئرمین صلاح الدین صدیقی بورڈ کے دفتر آئے۔انہوں نے عہدیداران اور ملازمین سے گفتگو کی۔بہت سے اہم معاملوں پر اپنے معاونین سے مشورہ کیا اور کئی ضروری فائلوں پر منظوری کے دستخط کئے اور فرمایا کہ میں آج کا کام کل پر چھوڑنے کا قائل نہیں ہوں۔پتہ نہیں میں کل رہوں یا نہ رہوں۔

بہار کی راجدھانی پٹنہ شہر کے معزز ہستیوں کے علاوہ ہر پارٹی کے عہدیداران نے اشک

بھری آنکھوں سے صلاح الدین صدیقی کے جنازہ کو دن کے دو بجے اُن کے آبائی وطن ہری ہانس ضلع سیوان کے لئے روانہ کیا۔ آٹھ گھنٹے کی مسافت کے بعد گاڑیوں کا قافلہ رات کے تقریباً دس بجے ہری ہانس پہنچا جہاں قصبہ کی ہزاروں کی تعداد میں ہندو مسلم عوام ضلع کے اعلیٰ سرکاری عہدیداران موجود تھے۔ نمناک آنکھوں سے عزیز و اقارب اور قصبہ کے ہر طبقہ کے لوگوں نے اپنے رہنما کو ان کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا۔ قصبہ کے ہندو مسلم بزرگوں کا کہنا ہے کہ گاؤں میں زندگی گزر گئی۔ اسی اور پچاسی سال کی عمر ہو گئی مگر جیسا صلاح الدین صدیقی کا جنازہ ترنگے جھنڈے میں لپٹا ہوا پٹنہ سے گاؤں آیا اور جس شان و شوکت سے پولیس کی الوداعی سلامی دے کر ان کو سپرد خاک کیا گیا، اس سے قبل کبھی نہیں دیکھنے کو ملا تھا۔ صلاح الدین صدیقی مرکزی حکومت کی حج ڈیلگیشن کے ممبر کی حیثیت سے حج بیت اللہ کر چکے تھے۔ یہ وفد مرکزی حکومت کے وزیر ای احمد کی سربراہی میں سعودی عرب گیا تھا۔

صلاح الدین صدیقی کا اچانک انتقال قوم و ملت کے لئے عظیم خسارہ ہے، جس کا پُر ہونا مستقبل قریب میں مشکل نظر آتا ہے۔ بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ اور اس کے ملحقہ مدارس ان کے انتقال کو ذاتی نقصان کے مترادف تصور کر رہے ہیں۔ مرحوم نہایت ہی ایمانداری، دیندار، پرہیز گار، ملنسار اور نیک صفت کے حامل تھے۔ وہ ایسی اعلیٰ شخصیت تھے جن کے علم، عمل اور دینی و تعلیمی خدمات سے پورا حلقہ معترف تھا۔ ان کو علمی صلاحیت کا انمول شاہکار کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ عوام ان کی سادہ زندگی کے اصولوں کی گرویدہ تھی۔ انہوں نے کبھی چیئرمین ہونے کا احساس نہیں دلایا۔ مدرسہ بورڈ کا خادم بن کر خدمت کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ صلاح الدین صدیقی مرحوم جوانمرد، فعال، ایماندار اور خلیق و ملنسار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ دُور اندیش اور وسیع النظر ہونے کے علاوہ بیحد مخلص تھے۔ ان کو مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا احساس تھا، اسی لئے وہ بورڈ کے ذریعہ مدارس کی اصلاحات کا عزم رکھتے تھے اور ہمیشہ اصلاح اور سدھار کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

صلاح الدین صدیقی مرحوم کا تعلق بہار کے ایک ایسے خاندان سے تھا جن کے مورثِ اعلیٰ

شیخ عظیم اللہ صدیقی ملک حجاز سے مع اہل وعیال بتلاشِ معیشت ۱۳۶۱ء بمطابق ۷۶۲ھ دہلی (ہندوستان) تشریف لائے تھے۔ اس زمانہ میں دہلی کے تخت پر شہنشاہ فیروز شاہ تغلق کی حکومت تھی۔ اسی بادشاہ کے زمانہ میں چیرو خاندان کا آخری راجہ ہری سنگھ اور ہنس سنگھ گدی نشین ریاست تھا۔ یہ راجہ سرکش تھا۔ اپنی فوج اور قلعہ پر بھروسہ کر کے بادشاہ کو خراج دینا بند کر دیا۔...... خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں شیخ عظیم اللہ صدیقی عرف شیخ پہاڑ ملک حجاز سے مع اہل وعیال بتلاشِ معیشت وارد ہوئے ...... عرب کا خون موجزن تھا۔ جنگجو صاحبِ تدبیر جنگ تھے۔ بر بنائے اس کے ۷۶۲ھ بمطابق ۱۳۶۱ء فیروز شاہ تغلق بادشاہ دہلی نے ہری سنگھ وہنس سنگھ کے تعلقہ کا فرمان شیخ صاحب موصوف کو عطا کیا...... ونیز ذریعہ یک مکتوب الامر راجہ مجھولی کو حکم دیا کہ تعلقداران ہری سنگھ وہنس سنگھ کو گرفتار کر کے دہلی بھیج دو۔ (بحوالہ تاریخ الہری ہانس مع شجرہ صفحہ ۱۶/۱۷ از مصنف شیخ محمد ذکی صدیقی)

صلاح الدین صدیقی کے آباء واجداد نے ہندوستان کی انگریزوں سے آزادی کے بعد تک تقریباً چھ سو برس تک تعلقداری اور زمینداری کے فرائض انجام دیئے۔ موصوف کے قصبہ ہری ہانس سے ایک تاریخ وابستہ ہے جسے ہم شہنشاہِ فیروز شاہ تغلق کی تاریخ کا ایک گمشدہ باب کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔

"چیرو خاندان کے آخری تعلقداران ہری سنگھ اور ہنس سنگھ سخت جنگجو و بہادر تھے...... ہری سنگھ وہنس سنگھ نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا لہٰذا سپہ سالار موصوف نے سزائے موت کا حکم صادر کر دیا۔ تعلقداران ہری سنگھ اور ہنس سنگھ نے اپنی آخری خواہش کا نہایت انکساری سے اظہار کیا کہ اس قصبہ کا نام ہم لوگوں کے نام پر رکھا جائے تا کہ زمانۂ مستقبل میں ہم لوگوں کا نام بطورِ یادگار قائم و باقی رہے۔ شاہی سپہ سالار نے اسیرانِ جنگ کی التجا قبول کی اور قصبۂ مذکور کا نام "ہری ہنس" رکھ دیا۔ مابعد کثرتِ استعمال سے قصبہ "ہری ہنس" کے موضع "ہری ہانس" معروف ہوا جو آج تک ہری ہانس موجود یادگارِ دیرینہ ہے"۔

(بحوالہ تاریخ الہری ہانس مع شجرہ صفحہ ۲۰۔ از شیخ محمد ذکی صدیقی مرحوم)

صلاح الدین صدیقی کی پیدائش موضع ہری ہانس ضلع سیوان (بہار) میں ہوئی تھی۔ تین بھائیوں میں مرحوم سب سے چھوٹے تھے۔ آپ کے والد علی رضا صاحب کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب مرحوم اپنی ماں کی گود میں تھے۔ صلاح الدین صدیقی مرحوم نے بڑی کسمپرسگی کی زندگی بسر کی۔ مالی مشکلات کا مقابلہ بڑی خندہ پیشانی سے کرنے کے عادی تھے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین کامل تھا لہٰذا کبھی بھی نامساعد حالات سے گھبرانے کے بجائے صبر وشکر کے ساتھ مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اپنے ماضی کو یاد کر کے فرمایا کرتے تھے کہ غربت اللہ کی رحمت ہے، جس نے غربت نہیں دیکھی وہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر نہیں کرسکتا۔ قرآن اور حدیث پر اُن کو اچھی معلومات تھی۔ دینی مزاج کے بزرگوں کی صحبت کو پسند فرماتے تھے۔ بہار شریف کے امیر شریعت سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ خانقاہ کے بزرگانِ دین ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حنفی مسلک پر عمل کرتے تھے اور اسلام کے نام پر پھیلی غیر اسلامی رسم ورواج کو وہ بدعت کہتے تھے۔ بڑی خوبیوں کے مالک تھے مرحوم صلاح الدین صدیقی۔

......☆......

ہاجرہ زرّیں

دین وادب کی علمبردار شاعرہ

اُردوادب میں شاعرات کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے اُردو شاعری میں نمایاں مقام کے ساتھ مقبولیت حاصل کی اور معیاری کلام سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ چند صاحبِ دیوان شاعرہ نے ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ میں اُردو شعر وادب کی ایک عظیم شخصیت محترمہ ہاجرہ زرّیں کا ذکر کررہا ہوں، جنہوں نے صوبہ بہار کے شہر پھلواری شریف کی علم پرور فضا میں ایک مشہور ومعروف خانوادے میں آنکھیں کھولی تھیں جہاں علم وادب اور تقویٰ کا پاکیزہ ماحول تھا۔ اسی دینی اور رُوحانی فضا میں ہاجرہ زرّیں کی پرورش ہوئی تھی۔ اس دور میں مردوں کے علاوہ مستورات بھی شعروشاعری میں دلچسپی لیتی تھیں۔ ان کا گھریلو ماحول دینی اور ادبی تھا، لہٰذا شہر کے معروف شعراء حضرات کی آمد کا سلسلہ لگا رہتا تھا۔ چنانچہ کم عمری ہی سے شاعری کی جانب رغبت پیدا ہوئی اورانہوں نے شعر کہنا شروع کردیا۔

شاعری کسی مخصوص صنف کے لئے وقف نہیں ہے۔ مستورات میں بھی اُردوادب کا ذوق اور شاعری کی بے پناہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔ میں اُردو شعر وادب کی ایسی ہی ایک عظیم ہستی کا تعارف کرارہا ہوں جو گذشتہ دور کی نمائندہ شاعرہ تھیں، جب مشاعروں کے اسٹیج سے عورتوں کا اپنا کلام سنانا معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لئے اپنے کلام کو مقامی رسالوں اور اخبارات میں بغرض اشاعت بھیج کر مطمئن ہوجانا اُن کی فطرت میں شامل ہوگیا تھا۔ انہیں اپنے شائع شدہ کلام کو پڑھ کر قلبی سکون حاصل ہوتا تھا مگر وہ اُردوادب کی دُنیا میں جس شہرت اور عزت کی مستحق تھیں حاصل نہیں کرسکیں۔ محترمہ ہاجرہ زرّیں صاحبہ کے حمد، نعت، مناجات، غزلیں، بچوں کی

نظمیں، سہرے اور مرثیہ وغیرہ پر مشتمل مجموعہ کلام ''کلامِ زرّیں'' کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا تھا جو زیرِ نظر ہے۔ اپنے بارے میں خود زرّیں صاحبہ فرماتی ہیں:

''ہمارا معاشرہ بہت ہی لطیف قدروں کا حامل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ علامہ حالی کے مسدس، اقبال کے مفکرانہ انداز اور غالب کی لطف آمیز رباعیاں یاد رہتی تھیں اور برمحل اشعار زبان زد ہونے میں دیر نہیں لگتی تھی''۔

محترمہ ہاجرہ زرّیں کی پھلواری شریف کے دین وادب کے پرنور ماحول میں پرورش ہوئی تھی اور وہ لکھنؤ کے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاد مولانا عبدالرشید ندوی سے منسوب ہوئیں۔ لہٰذا میکہ اور سسرال کے دینی اور ادبی ماحول نے ان کی طبیعت کو جلا بخشی۔ گھر میں ذکرِ الٰہی، عبادات ہفت روزہ مستورات کا دینی اجتماع کا معمول بنا۔ مجموعہ ''کلامِ زرّیں'' ان کی مذہبی، دینی مشغولیات کی عکاس ہے، جس میں حمد، نعت کے علاوہ نظمیں، غزلیں، سہرے، رخصتی اور حج وعمرہ کا منظوم منظرنامہ شامل ہے۔

عالمی شہرت یافتہ ادیب، شاعر، مفکر اور ماہنامہ ''امکان'' لکھنؤ کے مدیرِ اعلیٰ جناب پروفیسر ملک زادہ منظور احمد مرحوم نے ہاجرہ زرّیں کے مجموعہ کلام پر اپنے گراں قدر تاثرات کا اس طرح اظہار کیا تھا:

''خواتین کا شعر کہنا نہ کوئی فطری بات ہے نہ الہامی۔ ماضی میں بہت سے ایسے تذکرے لکھے گئے ہیں جن میں صرف شاعرات کے ہی کلام کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے۔ دورِ حاضر میں بھی بہت سی خوش فکر شاعرات ہمارے شعر وادب کو اپنے اکتسابات سے گراں قدر بنائے ہوئے ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ انہیں شاعرات میں سے جو اپنی خانگی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اپنے جمالیاتی احساسات کو بھی آئینہ دِکھلا رہی ہیں ہاجرہ زرّیں کا نام شامل ہے تو کوئی نامناسب بات نہ ہوگی۔ ہاجرہ زرّیں کی تشکیل فکر مسلمانوں کے ایک متوسط گھرانہ میں ہوئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ

معاشرتی اور اخلاقی قدریں جو اس طبقہ کو عزیز رہی ہیں ان کے اشعار میں جلوہ گر ہوئی ہیں۔ اس معاشرے میں خدا کا خوف، رسول کی محبت، بزرگوں کی عزت، چھوٹوں پر شفقت اور عاقبت کا خوف آج بھی زندگی کی اعلیٰ وارفع قدروں کا تصور پیش کرتا ہے اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تأمل اور تکلّف نہیں ہے کہ محترمہ ہاجرہ زرّیں نے بہت ہی خوبصورت انداز میں ان جذبات واحساسات کو آئینہ دکھلایا ہے"۔

مجموعہ "کلامِ زرّیں" کا آغاز مناجات اور بارگاہِ باری تعالیٰ سے کیا گیا ہے:

اے میرے مالک و خالقِ دو جہاں
ہیں تیری رحمتیں ہر طرف بیکراں

تیرے پیارے نبیؐ نے بتایا مجھے
دینِ برحق کا رستہ دِکھایا مجھے

کاش زرّیںؔ کی سن لے اے ربّ رحیم
بخش دے سب خطائیں اے ربّ کریم

محترمہ ہاجرہ زرّیں کی زندگی کے ہمسفر مولانا عبدالرشید ندوی نے ان کے شعری مجموعہ "کلامِ زرّیں" پر روشنی ڈالی ہے، کہتے ہیں:

"محترمہ ہاجرہ زرّیں صاحبہ کو لوگ ان کی صلاحیت کے مدِ نظر اکثر شادی کے موقع پر سہروں کی فرمائش کرتے۔ اس کے علاوہ نعت گوئی کا بھی اچھا ذوق پایا ہے۔ اس مختصر نمونہ کلام میں سب طرح کے اشعار آپ کو ملیں گے۔ حمد ونعت اور دینی رجحانات واصلاحیات بھی ہے"۔

زرّیں صاحبہ نے نعت گوئی میں بڑی ہی احتیاط سے قدم رکھا ہے۔ کیونکہ شاعری کی اس صنف میں وہی قدم رکھتے ہیں جن کو اس کی نزاکت، باریکی اور پابندیوں کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ نعت گوئی پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے۔ ذرا سا قدم بہکا اور شرک کے غار میں گرنے کا خدشہ لاحق

رہتا ہے۔ حبِ رسولؐ میں حدود کو پار کرنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے ''محمدؐ جہاں میں خدا بن کے آیا''، مگر زرّیں صاحبہ نے نعت گوئی کے میدان میں بہت ہی سنبھل کر قدم رکھا ہے اور حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قلبی محبت اور عقیدت کا بڑی خوبصورتی سے اظہار کیا ہے۔

ختمِ سلیمانی کے نگینہ
رحمتِ عالم شاہِ مدینہ
نام سے تیرے روشن سینہ

تیری حقیقت سب سے نرالی
سارے نبی تیرے در کے سوالی

تجھ سا مکرّم کوئی نہیں ہے
تجھ سا معظم کوئی نہیں ہے
فخرِ دوعالم کوئی نہیں ہے

تجھ کو ملا یہ رُتبۂ عالی
سارے نبی تیرے در کے سوالی

اُتر پردیش اور بعض دہلی کی دینی درسگاہوں میں ہاجرہ زرّیں کا نعتیہ کلام نصابِ تعلیم میں شامل ہے۔ ''ہماری کتاب'' جلد چہارم میں شائع شدہ نعت ''ماہِ مدینہ'' مدرسہ کے بچوں میں بیحد مقبول ہے۔

ماہِ مدینہ سرورِ عالم
صلے اللہ علیہ وسلم

عزت والے شہرت والے
رحمت والے برکت والے

خلق میں یکتا نورِ مجسم
صلے اللہ علیہ وسلم

بیواؤں اور مسکینوں کی
کرتے رہتے تھے رکھوالی

سارے یتیموں کے وہ ہمدم
صلے اللہ علیہ وسلم

کافران کو تھے جھٹلاتے
دُکھ پہنچاتے خوب ستاتے

پھر بھی نہ ہوتے اُن سے برہم
صلے اللہ علیہ وسلم

مدرسہ کے نصابِ تعلیم میں شامل نعت "یا شفیع الامم" بھی بچوں میں بہت مقبول ہے اور زبان زد ہے:

آج اُمت کی کشتی ہے منجدھار میں
پھیلی تاریکیاں دشت و کہسار میں

چہ کنم چہ کنم چہ کنم چہ کنم
یا شفیع الامم یا شفیع الامم

تیرے صدقے میں سب کچھ مجھے مل گیا
آخرت بن گئی عیش دُنیا ملا

خلد طیبہ میں اور باغِ اِرم
یا شفیع الامم یا شفیع الامم

ہاجرہ زرّیں کو شاعری سے قدرتی لگاؤ تھا اور فطرتاً وہ مذہبی رجحان کی حامل تھیں۔ اُن کے گھر کا ماحول خالص دینی اور مذہبی ہونے کی وجہ سے لکھنؤ کے ندوۃ العلماء کے بزرگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ لگا رہتا تھا۔ آپ کے شوہر مولانا عبدالرشید ندوی، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی (علی

میاں") کے قریبی رفیق تھے۔ عرب ممالک کے اسفار میں اکثر و بیشتر دونوں حضرات ساتھ رہے ہیں۔ چونکہ زرّیں صاحبہ انتہائی دیندار، پرہیزگار اور صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں۔ لہٰذا اُن کے دل میں مدینہ منورہ کی زیارت اور خانۂ کعبہ کے دیدار کی خواہش پیدا ہوئی تو انہوں نے "ذوقِ دیدارِ مدینہ" کہی:

چلو سکھیو مدینہ شہر دیکھنے
مصطفیٰؐ جانِ رحمت کا گھر دیکھنے
ساقئ حوضِ کوثر کا دَر دیکھنے
چلو سکھیو مدینہ شہر دیکھنے

اُنؐ کے قدموں میں یارب بلا لیجئے
اپنے گھر کی زیارت کرا دیجئے
اپنے محبوبؐ کا گھر دِکھا دیجئے
چلو سکھیو مدینہ شہر دیکھنے

مدینہ منورہ دیکھنے کی آرزو زرّیں کے دل کی گہرائیوں تک تھی۔ شب و روز کھلی آنکھوں سے مدینہ کا خواب دیکھتی تھیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے رو رو کر دُعائیں مانگتی تھیں۔ "آرزوئے دل" میں انہوں نے اپنے دلی جذبات کی ترجمانی اس طرح کی ہے:

دُعا ہے خدا سے یہی اب ہماری
کہ پہونچا دے مجھ کو دیارِ مدینہ
درِ مصطفیٰؐ پر میں اس طرح پہنچوں
کہ سر پر ہو میرے غبارِ مدینہ
یہیں روضۂ من ریاض الجناں ہے
کہ پھولوں سے بڑھ کر ہے خارِ مدینہ

الٰہی یہ زرّیںؔ کی اِک آرزو ہے

کہ ہجرت ہو سوئے دیارِ مدینہ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہاجرہ زرّیںؔ کی آواز سنی اور اُن کی دُعا قبول ہوئی۔ خانۂ کعبہ کی پاک تصویر آنکھوں میں سمائی ہوئی تھی۔ کعبہ کو دیکھے بغیر نہ دل کو چین نہ دماغ کو سکون حاصل تھا۔ لہٰذا جب مکہ معظّمہ پہنچ کر خانۂ کعبہ پر پہلی نظر پڑی تو قلب کے اندر کے احساسات زبان پر خود بخود آ گئے۔ ''تصورِ حج'' میں حج کے تمام ارکان کو بڑی خوبی اور خوبصورتی سے بیان فرمایا ہے۔ مناسک حج کی منظوم تفصیل قابل مبارکباد ہے۔

نظر میں سمایا ہے کعبہ کا منظر — وہ مکہ کا منظر مدینہ کا منظر

صفا اور مروہ میں آنسو بہانا — وہ اللہ کے گھر کا چکّر لگانا

منیٰ پھر نکلنا اور عرفات جانا — خدا سے وہاں جاکے بس لو لگانا

وہاں سارے حاجات پورے کرانا — وہاں سے پلٹ کر ہی مزدلفہ آنا

وہیں پر ہے مغرب عشا کا ملانا — اور ذکرِ الٰہی میں بیدار رہنا

فجر پڑھ کر ہونا منیٰ پھر روانہ — اور لبیک لبیک لبیک کہنا

منیٰ میں رمی کرنا قربانی کرنا — اور احرام کا کھلنا اور سر منڈانا

لگاتار سہ دن وہاں پھر ٹھہرنا — بہ حکم الٰہی یہ احکام کرنا

بحمد للہ کہہ کر پھر مکہ کو آنا — طوافِ زیارت میں پھر گڑگڑانا

چلیں پھر جو طیبہ کی کرنے زیارت

طوافِ وداعی ہے لازم سبھی پر

دُعا ہے یہ زرّیںؔ کی اے میرے مولیٰ

کہ حج میرا مبرور ہو میرے داتا

ہاجرہ زرّیں نے حج کے تمام ارکان کی خوبصورت انداز میں منظر کشی کی ہے۔ بے قرار دل

کے ساتھ جب دیارِ مدینہ سے لوٹیں تو عجیب کیفیت سے دوچار ہوئیں۔ اپنے احساسات اور جذبات کوانہوں نے ''فراقِ مدینہ'' میں درد بھرے انداز میں بیان فرمایا ہے:

رب کے گھر کا وصال مت پوچھو
نقطۂ انفصال مت پوچھو
حرم کعبہ تیری جدائی میں
دل ہوا خستہ حال مت پوچھو
کس کو بتلائیں حالِ دل زرّیںؔ
دلِ مضطر کا حال مت پوچھو

ہاجرہ زرّیںؔ بچیوں کی دینی تعلیم کے لئے بیحد فکر مند رہتی تھیں۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ ہر مسلمان لڑکی دینی تعلیم سے مزیّن ہو اور اعلیٰ کردار اور اخلاق کی محافظ ہو۔ ان کا ایمان تھا کہ ایک لڑکی کا تعلیم یافتہ ہونا ایک پورے خاندان کے تعلیم یافتہ ہونے کے برابر ہے۔ انہوں نے ''قوم کی بیٹیوں کے نام'' کے ذریعہ اپنا گراں قدر پیغام دیا ہے:

قوم کی بیٹیو! بات میری سنو — اپنے رب سے ڈرو، فکر عقبیٰ کرو
ورنہ اپنے نتائج ذرا سوچ لو — قوم کی بیٹیو! بات میری سنو
اپنے رب سے ڈرو، فکر عقبیٰ کرو — تم پر اللہ نے کتنا احساں کیا
تم کو مسلم گھرانے میں پیدا کیا — بھیجے پیارے نبی اور قرآں دیا
قوم کی بیٹیو! بات میری سنو — اپنے رب سے ڈرو، فکر عقبیٰ کرو
پند زرّیںؔ پہ کرلو عمل تم اگر — پھر تو دونوں جہاں میں رہو بے خطر
اور جنت میں پاؤ گی تم اپنا گھر — قوم کی بیٹیو! بات میری سنو

اپنے رب سے ڈرو، فکر عقبیٰ کرو

ہاجرہ زرّیںؔ کی شاعری نام و نمود کے لئے کی گئی شاعری نہیں تھی بلکہ انہوں نے اپنے

اشعار کے توسط سے جو پیغام دینے کی سعی کی ہے اس میں وہ ہر مقام پر پوری طرح کامیاب نظر آتی ہیں۔ زرّیں علامہ جمیل مظہری اور فراق گورکھپوری جیسے استاد شعراء سے کافی متاثر نظر آتی ہیں۔ ان کے کلام میں احساسات اور جذبات کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔ غزل کے تمام پہلوؤں پر اُن کی گہری نظر کی چھاپ نمایاں ہے:

دیکھتے دیکھتے انقلاب آگیا
آج محفل میں وہ بے نقاب آگیا
بھینی بھینی سی خوشبو ہواؤں میں ہے
سامنے دیکھئے ایک گلاب آگیا
زرّیں یادِ الٰہی میں تو محو ہو
کیوں کہ اب جلد وقتِ حساب آگیا

ایک دوسری غزل میں زرّیں صاحبہ نے اپنے دلی جذبات کی اس طرح ترجمانی کی ہے:

لے گئی بادِ صبا وہ بھی اُڑا کر افسوس
چار ہی تنکوں پہ قائم تھا نشیمن میرا
کیا کہوں پھول سے ہے مجھ کو محبت کتنی
ہے بھرا پھولوں سے اس وقت بھی دامن میرا
زرّیں کرتی ہے دُعا شب کے اندھیرے میں کبھی
ہوتا اے کاش کہ گلزار میں مدفن میرا

ہاجرہ زرّیں کی شاعری فطرت کے تقاضوں کی عکاس ہے۔ شمع ادب میں شائع ایک غزل کے چند اشعار اس سلسلہ میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔

دِکھا دے یا الٰہی سبزِ گنبد
یہی ہے التجا میری خدا سے

بہت نازک ہے اب زرّیںؔ کی حالت

ذرا کہہ دینا تم اس بے وفا سے

ہاجرہ زرّیںؔ نے غزل کے اظہار میں کسی مخصوص بحر کا انتخاب نہیں کیا بلکہ چھوٹی بڑی، ہر طرح کی بحر میں اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ مندرجہ ذیل غزل اس کی زندہ مثال ہے۔

ہم بے وفا اگر ہیں تو تم باوفا نہیں

پھر بھی تو مجھ کو شکوہ جور و جفا نہیں

کیسے یقیں دلاؤں تمہیں کس طرح کہوں

دل میں ہمارے کوئی تمہارے سوا نہیں

زرّیںؔ خدا کرے کہ مدینے کو جائیں ہم

اب اس کے بعد اور کوئی حوصلہ نہیں

برسات کے موسم میں جب کالی گھٹا چھا جاتی ہے تو شاعر کا دل موسم کی تبدیلی سے متاثر ہوتا ہے، پھر ایسے اشعار وارد ہوتے ہیں:

اُٹھی جب کہ مشرق سے کالی گھٹا

تو مے خانہ میں ہوگیا جم گھٹا

ادھر مور بھی رقص کرنے لگے

پرندوں کے دن آج پھرنے لگے

ہاجرہ زرّیںؔ صاحبہ کے پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹے کی پیدائش ہوئی۔ ایک بیٹی صوفیہ کا عین جوانی میں انتقال ہوا جس نے ان کے قلب پر گہرا اثر ڈالا۔ اسے یاد کر کے وہ آبدیدہ ہو جاتی تھیں۔ بیٹی کی جدائی کا ایسا غم تھا جو صبر کرنے کے باوجود فراموش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے صوفیہ مرحومہ کی جدائی میں مرثیہ کہا جو ایک ماں کے ٹوٹے ہوئے دل کی آواز ہی نہیں ہے بلکہ ہر ماں کا اپنی اولاد سے قلبی محبت اور لگاؤ کی حقیقی ترجمانی ہے:

صوفیہ بیٹی میری فوت ہوئی
اُف یہ طوفان خیز موت ہوئی
کتنا تو دے گئی صدمہ
کچھ نہ آیا رحم اے مری جاں
میں تجھے کتنا پیار کرتی تھی
جان تم پر نثار کرتی تھی
ہوگئی کیوں تو ایک لختِ جدا
سارے عالم سے ہائے ہو کے خفا
بھائی بہنوں سے منھ موڑ گئی
سب اُمیدوں کو دل کی توڑ گئی
جس گھڑی سے تو ہوگئی روپوش
ہے ٹھکانے نہیں خیال و ہوش
زرّیں صدمہ سہا نہیں جاتا
منھ سے کچھ بھی کہا نہیں جاتا

جہاں اپنی پیاری بیٹی صوفیہ کے انتقال پُر ملال پر غم کا اظہار کیا ہے وہیں ہاجرہ زرّیں نے صبر کا غیر معمولی مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے اکلوتے بیٹے محمد ارشد کی شادی خانہ آبادی کے مبارک موقع پر لاجواب سہرا لکھ کر اپنی خوشی اور دلی مسرت بھی ظاہر کی ہے۔

بھری محفل میں جو نوشاہ نے باندھا سہرا
شاد ہیں خرد و کلاں دیکھ کے اس کا سہرا
گورے مکھڑے پہ یہ لڑیوں کی بہاریں دیکھو
چاند بھی دیکھ کر شرما گیا تیرا سہرا

کھل گئیں آج تیرے ابّو کے دل کی کلیاں
دیکھا بیٹے کے جو سر پہ یہ سنہرا سہرا
زرّیں دیتی ہیں دُعائیں تہہ دل سے ارشد
ہو مبارک تیرے سر پہ یہ سنہرا سہرا

۵رجون ۲۰۱۲ء بروز منگل اپنے اہل وعیال کو نیک دُعائیں دیتی ہوئی لکھنؤ کی منفرد شاعرہ ہاجرہ زرّیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئیں۔

شمعؔ افشاںؔ و شہلاؔ خالدہؔ خرم رہیں مولیٰ
اور اُن کے بال بچے بھی خوش و خرم رہیں مولیٰ
الٰہی اُن کے شوہر کو ہمیشہ شاد تو رکھے
یہ چڑھتی بڑھتی دُنیا میں انہیں آباد تو رکھے
الٰہی ارشدؔ و انجمؔ کو صدا آباد تو رکھے
صحت دے تندرستی دے سلامت شاد تو رکھے
عطا ہو اُن کے گھر میں، آل اور اولاد اے مالک
کہ ہوں وہ زُہد وتقویٰ میں بڑے حسّاس اے مالک
تیرے دربار میں حاضر ہے زرّیں یہ دُعا لے کر
ہر ایک آفات سے بچوں کو میرے تو بچا یارب

......☆......

نفیسؔ بھوپالی

اُردو کا صاحبِ دیوان یوروپین شاعر

اُردو ادب کی تاریخ میں ایسے بدنصیب شعراء اور ادیبوں کی کمی نہیں جو فن کی پختگی اور اعلیٰ صلاحیت کے باوجود عمر بھر گمنامی کی زندگی گزارتے رہے اور مرنے کے بعد ان کا نشان تک نہیں ملتا۔ اگر تحقیق کی جائے تو ایسے شعراء اور ادباء کی زندگی اور فن پر مکمل ضخیم کتابیں تحریر کی جاسکتی ہیں۔ بعض ایسے بھی فن کار نظر آتے ہیں جو شہرت کی ان بلندیوں تک نہیں پہنچ سکے جس کے وہ حقیقی طور پر مستحق تھے۔ مثلاً وسیم خیرآبادی کی اعلیٰ شخصیت سے آج بے شمار حضرات ناآشنا ہیں۔ گو وسیم کا مرتبہ ریاض خیرآبادی سے کم نہ تھا۔ مگر وسیم کو وہ ماحول نصیب نہیں ہوا جو ان کو ریاض جیسی ہی شہرت اور عزت عطا کرتا۔ گورکھپور کی سرزمین سے پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کے والد ماجد جناب عبرت گورکھپوری ایک کہنہ مشق شاعر تھے، مگر آج ہم اور آپ ان کے نام سے بھی ناآشنا ہیں۔ صوفی کبیر داس کی سرزمین قصبہ مگھر کے کہنہ مشق اور صاحب دیوان شاعر جناب مہیشوری پرشاد جگر مگھری گمنامی کی زندگی میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ بالکل اسی طرح نفیس کے نام سے بھی کچھ ہی لوگ واقف ہوں گے۔ نفیس نسلاً یوروپین تھے اور بھوپال میں سکونت اختیار کرنے والے یوروپین خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ آپ کے والد آئزک ٹپسپٹ قسطنطنیہ سے آکر پرنس آف ویلس اسکول بھوپال کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ نفیس کے نانا حاذق ڈول میتھو ڈیسلوا عرف حکیم مقیس صاحب اپنے وقت کے سب سے اچھے طبیب تھے۔ طب یونانی کی دو درجن سے زائد کتابوں کے مصنف اور مؤلف تھے۔ آپ کی مجربات مقیسی ۱۸۹۶ء میں نول کشور پریس لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

اُردو کے یوروپین شاعر نفیس ۷ اردسمبر ۱۸۶۷ء کو جمعہ کے دن بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے خاندان والوں سے حاصل کی۔ نواب شاہ جہاں بیگم کے خلوص اور شفقت سے متاثر ہوکر قرآنِ کریم اور حدیث کی تعلیم حافظ قاری عبدالہادی خان سے حاصل کی جو ریاست بھوپال کے مفتی تھے۔ چھتیس سال کی عمر میں نفیس نے اسلام کیا۔ محمد سلیمان خان نام اور اچھے صاحب عرفیت تجویز ہوئی۔ اسلام قبول کرنے کی خوشی میں آپ نے کہا۔

بارک اللہ کھل گئی قسمت مسلماں ہوگئے
خاتم اسلام ہاتھ آئی سلیماں ہوگئے

....

خدا مانتے ہیں نفیسؔ اپنے رب کو
محمدؐ کو سچا نبی جانتے ہیں

تبدیلی مذہب نے آپ کے والدین کو سخت صدمہ پہنچایا اور پورا خاندان آپ سے برہم ہوگیا۔ نواب شاہ جہاں بیگم نے آپ کی حفاظت کی تمام تر ذمہ داری قبول کی اور عرصہ تک اپنے محل کی خواتین سے آپ کا پردہ ختم کردیا گیا اور خاص خاص تقریبات کی ذمہ داری آپ کے سپرد کردی گئی۔ جب تک بیگم زندہ رہیں نفیس تاج محل کے ایک عالیشان حصے میں شاہی خاندان کے ایک فرد کی طرح زندگی بسر کرتے رہے۔

اچھے صاحب نفیس کو شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ چنانچہ نفیس تخلص اختیار کیا اور شعر کہنے لگے۔ سولہ سال کی عمر کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ نفیس علم معانی و بیان، عروض وقوافی اور زبان سے واقف اور باخبر تھے۔ مندرجہ ذیل کلام اس دور کی یادگار ہے جو ماہنامہ ''پیامِ یار'' لکھنؤ بابت ستمبر ۱۸۸۳ء جلد نمبر ۱، شمارہ نمبر ۴ میں شائع ہوا تھا۔

خوش طالعی میری جو تم آئے میرے گھر آج
پر یہ تو کہو بھول گئے راہ کدھر آج

اللہ رے بے تابی فرقت کے بن اس کے
رہ رہ کے نفیس آتا کچھ منہ کو جگر آج

اچھے صاحب نفیسؔ نے ایک ایسے نامور شاعر کی شاگردی اختیار کی جو زمانے میں خدائے سخن کے نام سے پکارے جاتے تھے وہ تھے حضرت امیر مینائی جن کے شاگردوں میں ریاض خیر آبادی، دل شاہجہاں پوری، حفیظ جونپوری اور جلیل مانک پوری جیسے کہنہ مشق شاعر تھے اور جنہوں نے اُردو ادب کو خزانے عطا کئے اور جو آج اپنے کثیر تلامذہ کی بدولت بہت مشہور اور مقبول ہیں، مگر نفیس کو وہ شہرت نصیب نہ ہوئی جس کے وہ حقیقی طور پر مستحق تھے۔ نفیس کی شاعری میں اُتری رنگ سخن کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں، رنگ تغزل ملاحظہ فرمائیے۔

میں نہ کچھ سمجھا جو وہ حور شمائل آیا
دل گیا ہاتھ سے یا اس پر مرا دل آیا

....

خدا کے سامنے کہتا ہوا یہ جاؤں گا
جہاں نے راہ میں لُوٹا ہے قافلہ دل کا

زبان کی سادگی میں نفیس اُردو کے چوٹی کے شعراء کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

مجھے آتا نہیں فریاد کرنا
ذرا اے دردِ دل امداد کرنا

تعجب ہوتا ہے کہ ایک غیر ملکی شاعر جس کی مادری زبان اُردو نہیں تھی، اُردو کے ایسے ایسے گراں قدر اشعار کہے ہیں جن میں فن کی پختگی اور اعلیٰ مشاہدہ کے علاوہ استادانہ رنگ نمایاں ہے۔ مثلاً:

اشک تھم تھم کے نکلتے ہیں ادب مانع ہے
سخت گرداب میں ہے دیدہ گریاں میرا

ایک غیر ملکی شاعر سے اس سے زیادہ اور کیا اُمید کی جاسکتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

نغمہ بلبل کو ہم کو نالہ پسند
اپنا اپنا مذاق ہی تو ہے
لے گیا دل وہ یار آنکھوں میں
ہم نے رکھا ہزار آنکھوں میں

نفیس کے اشعار کی سادگی پر جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ ان کے چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیں۔

ابر کو دیکھتے ہی اے ساقی
پاؤں توبہ کے لڑکھڑانے لگے
میرے مرنے کی وہ خبر سن کر
بولے اچھا ہوا ٹھکانے لگے
خود بخود ہنس رہے ہو آج نفیسؔ
کس کے ارمان گڑگڑانے لگے

نفیسؔ کی کچھ غزلیں اخبار 'مدینہ' بجنور میں شائع ہوئیں جو کافی پسند کی گئیں۔ آپ نے دیوان مرتب کر کے نواب علی حسن خاں رئیس بھوپالی کو طباعت کے لئے ۱۹۲۰ء میں لکھنؤ بھیجا تھا مگر انہیں دنوں نول کشور پریس میں آتش زدگی کا حادثہ ہوا اور سارا مسودہ جل کر خاک ہوگیا۔ دوبارہ نقل کرائی تو نواب علی حسن کا انتقال ہوگیا۔ اُردو ادب کی بہت بڑی بدقسمتی سمجھئے کہ ان کا دیوان شائع نہ ہوسکا۔

محمد عبداللہ قریشی کے مضمون اچھے صاحب نفیس مطبوعہ ہفت روزہ 'لیل و نہار' لاہور مورخہ ۱۹رجنوری ۱۹۶۱ء اور ایم عرفان بھوپالی کے مضمون 'اُردو کا ایک صاحب دیوان یوروپین شاعر' مطبوعہ ہفت روزہ 'آثار' کلکتہ مورخہ ۱۲راگست ۱۹۶۰ء کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نواب شاہ جہاں بیگم نے ایک بار موسم بہار کی آمد میں بسنت کا تہوار بڑے اعلیٰ پیمانے پر منایا تھا، کمرے اور دیوار زرد رنگ

سے رنگے گئے، گیندے کے پھولوں سے گملوں کو سجایا گیا۔ بیگمات زعفرانی چوڑیاں اور زعفرانی کپڑے پہنے ہوئے تھیں، بسنت پر جن شعراء نے غزلیں کہیں یا قصیدے لکھے ان کو انعام میں بسنتی دوشالے دیئے گئے۔ اچھے صاحب نفیس نے اس جشن میں یہ نظم کہہ کر انعام حاصل کیا۔

رنگ ان دنوں جما ہے کچھ ایسا بسنت کا
دل میں خوشی نظر میں جلوا بسنت کا
اے بے خبر بسنت کی تجھ کو خبر بھی ہے
ہے میرے زرد رنگ پہ دھوکا بسنت کا
سرکار نے بسنت منائی ہے اے نفیسؔ
قسمت بسنت کی ہے نصیبا بسنت کا

نفیس ان دنوں جاگیردار ریاست اور سرخ وردی فوج کے ریزی ڈینٹ کمانڈر تھے، مگر نواب شاہ جہاں بیگم کے انتقال کے بعد جب نواب سلطان جہاں بیگم مسند نشین ہوئیں تو آپ نے حالات سازگار نہ پا کر اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ نواب شاہ جہاں بیگم کی بے پناہ شفقت اور بھوپال سے والہانہ محبت کا یہ عالم تھا کہ مہاراجہ نے اندور آنے کی دعوت دی، مگر آپ نے صاف انکار کر دیا۔ ایک مرتبہ عید کے موقع پر نواب سلطان بیگم نے شکایت کی کہ نواب شاہ جہاں بیگم مرحومہ کے بعد سرکاری عہدہ کے علاوہ دربار سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اچھے صاحب نفیس نے جواب میں فی البدیہہ یہ شعر پڑھا جس پر نواب صاحبہ مسکرانے لگیں:

کیوں کر وہاں میں پہنچوں مجھے جانتا ہے کون
درباں نئے نئے ہیں نگہباں نئے نئے

اچھے صاحب نفیس بذاتِ خود خلوص اور محبت کا پتلا تھے، مردانہ وجاہت کا یہ عالم تھا کہ جو بھی ایک بار دیکھ لیتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ ترکی اور فارسی اسی روانی سے بولتے تھے جس طرح اُردو شکار، بٹیر بازی، تیتر بازی اور چوسر سے بے حد شوق تھا، مگر نواب نصر اللہ خاں کے انتقال سے ایسا

صدمہ ہوا کہ ہر چیز سے دل اُچاٹ ہوگیا۔ اور اپنی زندگی سے مایوس نظر آنے لگے، اسی مایوسی میں آپ نے یہ رباعی کہی:

سوچو تو نفیس یاں اقامت کب تک
اس کہنہ سرا میں استراحت کب تک
آخر ہوئی رات اور سفر ہے درپیش
اُٹھ جاگو یہ خوابِ غفلت کب تک

اُردو کے یوروپین صاحب دیوان شاعر اچھے صاحب نفیس کا ۱۳/اپریل ۱۹۴۶ء کو ۷۹ برس کی عمر پاکر اپنی جائے پیدائش بھوپال میں انتقال ہوا۔

☆

حضرت ناوکؔ حمزہ پوری کا منظوم خط بطورِ اظہارِ تشکر

۷/اپریل ۲۰۱۶ء کو موصول ہوا۔ میرے افسانوں کے مجموعہ

"بکھرے موتیوں کا ہار"

موصول ہونے پر علامہ نے تحریر کیا۔

احمد مشکور

۷/اپریل ۲۰۱۶ء

اظہارِ تشکر

محترم بھائی احمد مشکور
قیمتی موتیوں کا ہار ملا
آپ کے حق میں کر رہا ہوں دُعا
ہے دُعاء شاد کام آپ رہیں
دست بوسی کو آ نہیں سکتا
شاد کام آپ کو رکھے اللہ

اس نوازش کا شکریہ ہے حضور
دیکھ کر آنکھیں ہوگئیں پُرنور
گرچہ بیماریوں سے ہوں معذور
رکھے اللہ آپ کو مسرور
بخت نے پھینکا مجھ کو اِتنی دُور
بخش دے مجھ کو بھی خدائے غفور

فقیر: دُعاگو

ناوکؔ حمزہ پوری

۳/مارچ ۲۰۱۶ء

جناب احمد مشکور صاحب نے اپنے مجموعے "آئینۂ حیات" کے مضامین، افسانے اور افسانچوں میں گردوپیش کے واقعات و حقائق کو دلکش پیرایہ بیان میں پیش کیا ہے۔ ان کی بیشتر تحریروں میں خاکہ نویسی اور انشائیہ کی جھلکیاں موجود ہیں۔ انھوں نے مجموعی طور پر اپنی تخلیقات سے قارئین کو زندگی کی حقیقتوں تلخ اور شیریں سچائیوں کا احساس کراتے ہوئے اصلاح معاشرہ کی دعوت دی ہے۔ اپنے اسلوب اور طرز اظہار سے انشا پردازی کے جوہر دکھائے ہیں جسے پڑھنے کے بعد دماغ اور ذہن کو آسودگی ملتی ہے۔ زندگی کی حقیقتیں قریب سے قریب تر معلوم ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر عبدالقدوس ہاشمی

جنرل سکریٹری: مولانا آزاد میموریل اکادمی لکھنؤ

مشکور بھائی میرے مرحوم شوہر جناب سعدالدین عندلیب کے بہت قدیم دوست ہیں اور وہ میرے خاندان کے ایک فرد کی بھی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرے والد ماجد جناب اثر زبیری لکھنوی نے قرآن مجید کا منظوم ترجمہ "سحر البیان" کے نام سے کیا ہے۔ جس پر احمد مشکور صاحب نے ماہنامہ "گلچین" لکھنؤ میں ایک پر مغز مضمون تحریر کیا تھا۔ ہم سب انجمن ادب اطفال لکھنؤ کے ممبران میں شامل ہیں۔ احمد مشکور صاحب ایک اچھے ادیب ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں کا مجموعہ "بکھرے موتیوں کا ہار" کو میرے مرحوم شوہر کے نام منسوب کر کے اپنی دوستی اور گہرے تعلقات کا ثبوت دیا ہے۔

ڈاکٹر مہ جبیں عائشہ (سابق پروفیسر شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ)

محترم احمد مشکور ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی بھرپور شناخت رکھتے ہیں۔ وہ ذی علم ہیں اور وسیع مطالعہ کے ساتھ اردو ادب کے گیسو سنوارنے میں رواں دواں نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ خیالات کو سلسلہ وار اٹھاتے ہیں اور جزئیات میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں کسی جگہ بے جا تکرار نہیں ہوتی۔ ان کے افسانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ استدلال ترتیب تسلسل اس قدر پایا جاتا ہے کہ قاری کو اپنی طرف خود بخود متوجہ کرتی ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ ان کی یہ نئی تصنیف "آئینۂ حیات" ایک بار پھر اپنے قاری کے علم میں اضافہ اور اردو ادب کے دامن کو وسیع کرنے میں کامیاب ہوگی۔

ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی ([illegible] لکھنؤ)

AAYINA-E-HAYAT

by

Ahmad Mashkoor

اردو کے نامور اور مشہور و معروف اہل قلم اور مصنف جناب مشکور احمد صدیقی جو قلمی نام احمد مشکور سے معروف ہیں۔ ان کے اعلیٰ پائے کے ادبی مضامین، افسانے اور افسانچے کا مجموعہ بعنوان "آئینۂ حیات" کے متعلقہ اس کم بے بضاعت کو مطالعہ کا شرف حاصل ہوا اور اس کے مطالعہ سے میرے محدود علم میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ اس بیش بہا اور قیمتی مجموعہ کی اشاعت پر مصنف قابل صد مبارکباد اور ستائش ہے۔ بلاشبہ یہ مجموعہ اردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا، دہلی

ناشر

امین سلونوی میموریل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، لکھنؤ